ذبیحہ کے احکام و مسائل

ترجمہ

الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیۃ

مصنف

[illegible] عبد الرحیم العبادی

مترجم

حافظ محمد عبد الغفار

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی

الجامعۃ الاسلامیۃ العالمیۃ ، اسلام آباد ، پاکستان

ذبیحہ کے احکام و مسائل

ذبیحہ کے احکام ومسائل

ترجمہ

الذبائح في الشريعة الإسلامية

مصنف

عبداللہ عبدالرحیم العبادی

مترجم

حافظ محمد عبدالغفار

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی

الجامعة الاسلامیّة العالمیّة

اسلام آباد

مطبوعات ادارۂ تحقیقات اسلامی

نمبر ۵۰

۱۹۸۰ء ادارۂ تحقیقات اسلامی پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵، اسلام آباد پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

طبع اوّل ۱۹۸۰ء

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری۔ ادارہ تحقیقات اسلامی

کوائف فہرست سازی دوران طباعت

العبادی، عبداللہ عبدالرحیم

ذبیحہ کے احکام ومسائل، ترجمہ الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیۃ

(مطبوعات ادارہ تحقیقات اسلامی نمبر ۵۰)

۱۔ فقہ اسلامی ۲۔ ذبیحہ

الف۔ عبدالغفار محمد (مترجم) ب۔ عنوان

ج۔ عنوان: الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیہ۔ اردو

د۔ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔ مطبوعات نمبر ۵۰

۳۴۰٫۵۹ طبع اوّل ۱۹۸۰ء

ISBN [illegible] 408 120 3

طابع وناشر: سعید احمد شاہ، افسر انتظامیہ، ادارہ تحقیقات اسلامی

مطبع: مطبع ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

فہرست مندرجات

پیش لفظ

جدید دور میں جہاں اور بہت سے مسائل پیش رہے ہیں، وہاں ایک اہم مسئلہ ذبیحہ کا بھی ہے۔ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو طالب علموں، تاجروں، مسافروں اور سرکاری ملازمین کی حیثیت سے یورپ، امریکہ اور دوسرے غیر مسلم ممالک کا سفر در پیش رہتا ہے، عارضی اور مستقل قیام کی ضرورت پڑتی ہے اور وہاں اکثر یہ سوال ابھرتا ہے کہ غیر مسلموں کا ذبیحہ حلال ہے یا حرام؟ اب تو یہ مسئلہ غیر مسلم ممالک تک محدود نہیں رہا۔ مسلم ممالک میں باہر سے جو اشیائے خورد و نوش سربند ڈبوں میں درآمد ہو رہی ہیں ان کے بارے میں بھی یہی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہی مسئلہ ذبح کے نئے طریقوں خصوصاً مشینی ذبیحہ کے بارے میں بھی پیدا ہوا ہے۔

ان مسائل پر علماء کے فتاوی تو موجود تھے لیکن مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ضرورت تھی کہ ان مسائل پر ایک مستقل کتاب ہو جس میں ان تمام مسائل پر سیر حاصل بحث ہو اور ساتھ ہی دیگر متعلقہ موضوعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہو۔

جناب عبداللہ عبدالرحیم العبادی کی کتاب الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیہ ان تمام موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ دراصل یہ کتاب جناب العبادی کا ایم۔ اے کا مقالہ ہے جو انہوں نے ۱۹۷۷ء میں غالباً الازہر میں مکمل کیا۔ مقالہ کی امتیازی حیثیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اگلے سال ۱۹۷۸ء میں ہی یہ اشاعت پذیر ہوا۔ اپنے موضوعات و مباحث کے لحاظ سے یہ کتاب نہایت جامع ہے۔ اس میں ذبیحہ کے بارے میں تمام فقہی مذاہب کی آراء کے خلاصہ کے ساتھ ساتھ شکار، حلال اور حرام جانوروں کی تفصیلات، حرمت کی عقلی توجیہات، قربانی

اور اس کے احکام کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اہل کتاب کے ذبیحے کے بارے میں قدیم اور جدید تمام طریقوں اور صورتوں کا تجزیہ کر کے ان پر فقہاء کی آراء کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کی انہی خصوصیات کے پیش نظر ادارہ تحقیقات اسلامی اسے افادۂ عام کے لئے اُردو لبادہ میں پیش کر رہا ہے۔

امید ہے یہ خدمت شرف قبول حاصل کرے گی۔

ڈاکٹر ظہیر محمد زمان
ڈائریکٹر جنرل
ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

تمام تعریفیں اُس اللہ سبحانہٗ تعالیٰ علیم وحکیم کے لئے ہیں جس نے اپنی کتاب قرآنِ مجید وفرقانِ حمید میں ارشاد فرمایا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ
الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ
تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۬ فَكُلُوْا مِمَّآ
اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ
الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪
وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ (المائدہ: ۴-۵)

(تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز اُن کے لئے حلال ہے کہہ دے تم کو حلال ہیں ستھری چیزیں اور جو سدھاؤ شکاری جانور شکار پر دوڑانے کو کہ اُن کو سکھلاتے ہو اُس میں سے جو اللہ نے تم کو سکھایا ہے سو کھاؤ اُس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے اور اللہ کا نام لو اُس پر اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ جلد لینے والا ہے حساب آج حلال ہوئیں تم کو سب ستھری چیزیں اور اہل کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے اور تمہارا کھانا

اُن کو حلال ہے)۔ (ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ)

اور درود وسلام ہو حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات پر جو اللہ تعالیٰ خالق ارض وسما کے حبیب ہیں جنہیں تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے اور جن کی صفات وخصوصیات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (الاعراف: ۱۵۷)

(اور حلال کرتا ہے اُن کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے اُن پر ناپاک چیزیں)۔ (ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ)

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول بنا کر بھیجا اور آپؐ کی ذاتِ پاک پر انبیاء اور رسولوں (علیہم الصلوٰۃ والتسلیم) کے مبارک سلسلے کو مکمل فرمایا۔ چنانچہ آپؐ تمام انبیاء میں سب سے زیادہ اعلیٰ واشرف اور آپؐ کا دین یعنی اسلام تمام ادیان میں منتخب اور کامل ترین دین ہے۔

اسلام کی خصوصیات اور امتیازی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ اس دین میں وہ تمام چیزیں بڑی وضاحت سے بیان کردی گئی ہیں جو حلال ہیں اور جو چیزیں حرام ہیں اُن کی تفصیل بھی اچھی طرح کھول کر بتادی گئی ہے۔ چنانچہ حلال وحرام کے یہ تمام مسائل بالکل واضح ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال چیزوں کی وضاحت فرمائی اور انہیں اختیار کرنے کی ترغیب دی، حرام اشیاء کی نشان دہی کی اور اُن کے قریب جانے سے ڈرایا۔

اُمتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ اللہ تعالیٰ رحیم وکریم کی رحمت ہے کہ اُس نے مسلمانوں کے لئے بعض جانوروں کا گوشت، جو انسان کی جسمانی صحت، اعلیٰ اخلاق اور روحانی اقدار کے نقطۂ نظر سے ضرر رساں تھا حرام ٹھہرایا اور بعض جانوروں کا گوشت جائز قرار دیا، اس لئے کہ یہ گوشت انسانی اجسام کے تغذیہ اور نشوونما کے لئے نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے۔

مسلمانوں کے لئے اس امر میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ایسی چیزیں استعمال میں لائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جائز قرار دیا ہے۔ باری تعالیٰ عزاسمہ ارشاد فرماتے ہیں۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ

مِنَ الرِّزْقِ ؕ (الاعراف: ۳۲)

(تو کہہ کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو اُس نے پیدا کی ہے اپنے بندوں کے

واسطے اور ستھری چیزیں کھانے کی)۔ (ترجمہ از شیخ الہندؒ)

چنانچہ حلال، پاک اور مفید چیزوں سے استفادہ کرنا ایک ایسی بات ہے جو شرعاً مطلوب و مقصود ہے تاکہ اُن کے استعمال سے ہمارے جسم نشو و نما پائیں اور انہیں قوت و توانائی حاصل ہو۔ بلکہ اگر بندۂ مومن و مسلم اس نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جائز کی ہوئی اشیاء اور نعمتوں کو استعمال کرے کہ اس طرح اُس کا جسم مضبوط ہوگا اور وہ طاعت و عبادتِ الٰہی کا فریضہ زیادہ خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بجا لا سکے گا تو اللہ سبحانہ تعالیٰ اُسے اس عمل کا اجر بھی عطا فرمائیں گے اور وہ مستحق ثواب بھی ہوگا۔

چونکہ اسلام ہر طرح کی بے اعتدالی اور افراط و تفریط سے پاک ہے اس لئے اس دین میں نہ تو تمام جانوروں کا گوشت حرام قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ بعض اقوام کا طریقہ ہے کہ انہوں نے ہر ذی روح کے گوشت کا استعمال اپنے لئے حرام ٹھہرا رکھا ہے، اور نہ یہاں بعض دیگر اقوام کی طرح، جو ہر جانور اور ہر قسم کا گوشت کھا جاتی ہیں، ہر جانور کا گوشت حلال کیا گیا ہے۔

اس مقام پر ہم قارئین کی توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بعض جانوروں کا گوشت حرام ٹھہرایا لیکن اس حرمت کے پیچھے جو حکمت کارفرما تھی وہ زمانہ ماضی میں لوگوں سے پوشیدہ رکھی گئی تاکہ لوگ خود اس کو سمجھنے اور اس کی علت کو جاننے کی کوشش کریں اور یہ حکمت بعد میں حضور نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کی معجزانہ وضاحت سے آشکارا ہوئی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ

بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (العنکبوت: ۴۸)

(اور تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتا تھا اپنے داہنے ہاتھ سے

تب تو البتہ شبہہ میں پڑتے یہ جھوٹے)۔

ایک اور مقام پر ارشاد عزاسمہ ہے :

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم: ۳،۴)

(اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا)۔

جی ہاں ایسا ہی ہوا۔ ماضی میں لوگوں کو یہ علم نہیں تھا کہ خون میں مائیکروب اور جراثیم کثرت سے موجود ہوتے ہیں اور نہ ان کو یہ آگاہی تھی کہ جسم حیوان میں خون کی گردش کی ماہیت وکیفیت کیا ہے اور یہ کہ اگر جانور مر جائے اور خون اس کے اندر رہی ہو تو وہ خون اس کے گوشت سے جدا نہیں ہو سکتا۔

آج سائنس کی ترقی نے ہمیں یہ علم عطا کر دیا ہے اور بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ مردار کو حرام قرار دینے میں کیا حکمت پنہاں ہے۔ اور یہ کہ منخنقہ[1]، موقوذہ[2]، متردیہ[3] اور نطیحہ[4] جانوروں اور ایسے جانوروں کے حرام ہونے کا کیا سبب ہے جن کا کچھ حصہ کسی درندے نے کھا کر باقی چھوڑ دیا ہو۔

اس سے پہلے انسان یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ سوّر کا گوشت بہت سے امراض کو جنم دیتا ہے۔

یہ تمام حقیقتیں ہمیں سائنسی ترقی کے بعد معلوم ہوئیں تاکہ ہم از خود اُس حکمت کا سراغ لگائیں جو مختلف جانوروں کی حرمت کے پیچھے کام کر رہی ہے۔ اور دشمنان اسلام یہ نہ کہہ سکیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ تمام چیزیں (بغیر کسی معقول وجہ کے اپنی طرف سے) حرام قرار دے دی ہیں۔

بعض لوگوں کو یہ سوال بہت پریشان کرتا ہے کہ آخر شریعتِ اسلامیہ کی جانب سے ذبیحوں اور شکار کے

---

[1] وہ جانور جو گلا گھٹنے سے مر جائے۔

[2] وہ جانور جو کسی چوٹ کے لگنے سے مر جائے۔

[3] وہ جانور جو کسی اونچی جگہ سے گر کر مر جائے۔

[4] وہ جانور جو سینگ لگنے سے مر جائے۔

حلال ہونے پر یہ تمام شروط و قیود کیوں عائد کی گئی ہیں! بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اسلام تشدد کا حامل دین ہے، جبھی تو اُس نے ایسی ناروا شرطیں لگاکر اور قیود عائد کر کے لوگوں کو اس سہولت سے محروم کر دیا ہے کہ وہ ہاتھ بڑھائیں اور کھلنے کی جو چیز ملے اُسے کھاکر اپنا پیٹ بھرلیں۔

لیکن دشمنوں کا یہ خیال صحیح نہیں اس لئے کہ اسلام میں ایسا تشدد نہ پہلے کبھی تھا، نہ آج ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ ... شریعت کی عائد کردہ یہ تمام شروط و قیود انتہائی حکمت اور خود انسان ہی کی بھلائی اور مصلحت پر مبنی ہیں۔ درحقیقت یہ تمام پابندیاں انسان کے لئے باعث رحمت ہیں جن کی وجہ سے انسان کو دینی، اجتماعی، نفسیاتی اور صحت کے نقطۂ نظر سے غیر معمولی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

دراصل شریعتِ اسلامیہ کا تقاضا ہے کہ تمام مسلمان:

۱۔ اپنے آپ کو حیوانیت کے اُس پست مقام سے اُٹھائیں جو اُن کے شایانِ شان نہیں، اور اس طرح اپنی انسانی بزرگی و عظمت اور شرافت و تکریم کی حفاظت کریں۔ وہ اُن حیوانات کی طرح نہ ہو جائیں جو یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کون سی چیز اُن کے لئے مفید ہے اور کون سی نقصان دہ اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو چٹ کر جاتے ہیں۔

۲۔ اپنے لئے ایسی غذا کا انتخاب کریں جو اُن کی جسمانی صحت اور قوت و توانائی کو برقرار رکھنے والی ہو اور ایسی چیزوں سے بچیں جو اُن کی صحت کے لئے نقصان دہ یا اخلاقی، نفسیاتی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے انہیں ضرر پہنچانے والی ہوں۔

۳۔ چونکہ انسان کو اس دنیا میں عبث پیدا نہیں کیا گیا لہٰذا اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان شروط و قیود کی پابندی کرے جو شرع کی جانب سے اس پر عائد کی گئی ہیں۔

اگر انسان اچھے بُرے میں تمیز نہ کرے اور اپنی خواہشِ نفس کے مطابق جو جی میں آئے کرتا پھرے تو پھر یوں اُس میں اور اُن جانوروں چوپایوں میں کیا فرق رہ جائے گا جو بلا سوچے سمجھے ہر اس چیز کو صاف کر جاتے ہیں جو اُن کے سامنے آئے۔ وہ اس حقیقت کے ادراک ہی سے عاجز ہیں کہ کون سی چیز اُن کے لئے مفید ہے اور کون سی نقصان دہ۔

اسلام کی حکیمانہ تعلیمات میں جس طرح اُخروی فوائد و مصالح کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اسی طرح دنیاوی زندگی کی فلاح و بہبود کو بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ یہاں نہ حیاتِ دنیوی کے تقاضوں کو نظر انداز کیا گیا ہے نہ آخرت کی بہتری اور کامیابی سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ بلکہ دنیاوی زندگی اور حیاتِ اُخروی کے تقاضوں میں ایک انتہائی عقلمندانہ توازن برقرار رکھا گیا ہے۔ اسلام کی اعلیٰ حکیمانہ تعلیمات میں زندگی کے تمام چھوٹے بڑے معاملات کا، ہر دائرے میں اور ہر سطح پر احاطہ کیا گیا ہے۔

ہم نے یہ جو کچھ عرض کیا اس میں ذرا مبالغے یا خیال آرائی سے کام نہیں لیا گیا۔ چنانچہ اگر کسی کو ہماری اس رائے پر اعتراض ہو اور وہ اسے زیرِ تنقید لانا چاہتا ہو تو اسے چاہیئے کہ اسلامی تعلیمات کا اچھی طرح مطالعہ کرے۔ اگر اُس نے اسلامی اوامر و نواہی کا مطالعہ ہر قسم کے تعصب اور جذباتِ نفرت و حسد سے پاک ہو کر کیا تو انشاءاللہ اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کلامِ حق یہی ہے اور اسلام ہی دینِ حق ہے جس کی تعلیمات میں کوئی چھوٹی بڑی بات نظر انداز نہیں کی گئی۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: ۳۸)

(ہم نے نہیں چھوڑی لکھنے میں کوئی چیز)

ہمارے اس قول میں بھی تعجب کی کوئی بات نہیں کہ مسلمان اپنی زندگی میں اسلامی احکام کے مطابق جن ہدایات پر التزام کے ساتھ عمل کرتے ہیں وہ بذاتِ خود اللہ سبحانہ تعالیٰ کی اطاعت ہیں جن پر مومنین کو ثواب ملتا ہے بشرطیکہ اخلاص اور حسن نیت کا جوہر اُن میں موجود ہو۔

حلال و حرام جانوروں سے متعلق نصوصِ شرعیہ میں بڑی وضاحت اور پوری تفصیل سے بتا دیا گیا ہے کہ کون سی چیزیں حلال ہیں اور کون سی حرام، چنانچہ اب اس مسئلے میں کسی شخص کے لئے اس امر کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ وہ کسی قسم کے شک یا تردد سے کام لے۔ چنانچہ اللہ سبحانہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ
فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ
إِلَيْهِ (الانعام: ۱۱۹)

(اور کیا سبب کہ تم نہیں کھاتے اُس جانور میں سے کہ جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا اور وہ واضح کر چکا ہے جو کچھ کہ اُس نے تم پر حرام کیا ہے مگر جب کہ مجبور ہو جاؤ اُس کے کھانے پر)۔

اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

"حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور درمیان حلال اور حرام کے چیزیں ہیں مشتبہ نہیں جانتے ان کو بہت آدمی پس جو شخص کہ بچا شبہے کی چیزوں سے پاک کیا اُس نے اپنے دین کو اور اپنی آبرو کو اور جو پڑا شبہے کی چیزوں میں پڑے گا حرام میں مانند چرواہے کے چراتا ہے گرد حمی (چراگاہ ممنوعہ) کے قریب ہے کہ چریں اُس میں جانور، خبردار ہو کہ واسطے ہر بادشاہ کے ایک حمی ہے۔ خبردار ہو کہ اللہ کی حمی اُس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ خبردار ہو کہ تحقیق آدمی کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے گوشت کا جس وقت کہ درست ہوتا ہے وہ تو درست ہوتا ہے سارا بدن اُس کا اور جس وقت کہ بگڑتا ہے وہ ٹکڑا بگڑتا ہے سارا بدن اُس کا خبردار ہو کہ وہ ٹکڑا دل ہے"۔ (متفق علیہ)

چنانچہ جو چیزیں واضح طور پر حلال ہیں اُن میں پاکیزہ زرعی اجناس پھل، سبزیاں، چوپایہ جانوروں کا گوشت، دودھ اور دیگر پاکیزہ مشروبات شامل ہیں۔ اسی طرح لباس جو کپاس، کتان، اون اور بالوں وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے اور عورتوں سے جنسی تعلق بھی اُن اشیاء سے تعلق رکھتا ہے جو واضح طور پر حلال ہیں جب کہ وہ تعلق عقد صحیح کے ذریعہ قائم ہوا ہو جیسے نکاح یا بیع یا میراث یا ھبہ یا غنیمت کی صورت میں۔

اور واضح طور پر حرام چیزوں میں مُردار کھانا، سُور کا گوشت کھانا، خون پینا، شراب پینا، محرمات سے نکاح کرنا، مردوں کا ایسا لباس پہننا جو ریشم سے تیار کیا گیا ہو، حرام کمائی کھانا، جیسے جوئے اور سُود کی آمدنی کو اپنے کام میں لانا اور ایسی چیزوں کی قیمت کھانا جن کی بیع حلال نہیں۔ اسی طرح مغصوبہ مال چوری کے ذریعے حاصل کرنا یا غصب کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

باقی رہیں مشتبہ اشیاء تو ان میں ایسی چیزیں شامل ہیں جن کے حلال یا حرام ہونے میں اختلاف پایا جاتا ہے، خواہ وہ مادی وجود رکھنے والی چیزیں ہوں، جیسے گھوڑے، خچر، گوہ، ایسی نبیذیں جن کا زیادہ مقدار میں پینا نشہ آور ہوتا ہے اور جن کے حلال ہونے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، یا وہ ایسی آمدنیاں اور منافع ہوں جو بعض علماء کی رائے میں حلال اور بعض کے خیال میں حرام ہیں جیسے بیع العینہ اور اسی طرح کے دیگر مسائل[1]۔

تاہم کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو تہذیب و تمدن، غیر اقوام سے مسلمانوں کے میل جول، غیر مسلم ممالک کے سفر یا وہاں ہجرت کر جانے کے نتیجے میں بعض لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوگئی ہیں۔ اسی طرح اس گوشت کا مسئلہ ہے جو غیر اسلامی ممالک سے بند ڈبوں میں خشک کیا ہوا یا برف میں جما ہوا، اسلامی ممالک میں آتا ہے کہ اس کے متعلق شرعی حکم واضح نہیں۔

بہرحال اب لوگ ان چیزوں کے بارے میں بھی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آیا یہ چیزیں حلال ہیں یا حرام؟ اس سلسلے میں مسلمانوں کے درمیان اس وقت تین مختلف آراء پائی جاتی ہیں:

ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو غیر ممالک سے آنے والی ہر چیز کو اس کی حلت اور حرمت کے بارے میں کسی قسم کا غور و فکر اور مطالعہ کئے بغیر جائز سمجھتے ہیں۔

ان کے برخلاف کچھ اور لوگ ہیں جو باہر سے درآمد شدہ ہر چیز کو حرام خیال کرتے ہیں۔

تیسرا گروہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جو ابھی تک اس کشمکش و پیچ میں مبتلا ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔

یہ تو تھا پہلا مسئلہ

دوسرا مسئلہ ایام منیٰ میں قربانی کے گوشت کے ضیاع سے تعلق رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس مسئلے کا صحیح

---

[1] الاحکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام ۴/۱۸۱ - ۱۸۲۔ رافعی نے کہا ہے۔ "بیع العینہ یہ ہے کہ کوئی چیز کسی کو اس شرط پر فروخت کی جائے کہ قیمت بعد میں کسی وقت وصول کی جائے گی اور وہ چیز خریدار کے حوالے کر دے اور پھر قیمت وصول کرنے سے پہلے وہی چیز خریدار سے اُس سے کم قیمت میں خرید لے جس قیمت پر بیچی تھی"۔ دیکھئے نیل الاوطار ۵/۲۲۴

حل کیا ہے؟ کیا اسلام جو دینِ حنیف ہے اس صورت حال کو پسند کرتا ہے اور کیا موجودہ صورت روحِ اسلام کے مطابق ہے۔

اگر ہم شریعتِ اسلامیہ کے احکام و قوانین پر، جو اللہ سبحانہ تعالیٰ کی جانب سے اُمتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم) کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، خواہ وہ فرائض و واجبات سے تعلق رکھتے ہوں یا سنت کے دائرے میں آتے ہوں، اچھی طرح غور وفکر کریں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ احکام و قوانین ہماری دنیاوی و اُخروی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہیں اور ان کے پیچھے بڑی بڑی حکمتیں اور رموز و مصالح کام کر رہی ہیں۔ ان کا مقصد افراد یا جماعتوں کی مشکلات کو حل کرنا اور معاشرے کے مختلف طبقات کے لئے بڑے بڑے فوائد کا حصول ہے۔ تاکہ اسلامی معاشرہ ایک ایسی وحدت کی صورت میں جلوہ گر ہو جو انتشار و انحلال کے خطرات سے محفوظ اور ضعف و پراگندگی کے ہر خوف سے آزاد ہو۔ اور افرادِ معاشرہ کے باہمی تعلقات محبت و اُخوت، اتفاق و اتحاد اور اعتماد کی اعلیٰ تعمیری بنیادوں پر قائم ہوں۔

اس سلسلے میں ہمیں جن اُمور پر غور کرنا ہے اُن میں وہ احکام و قوانین اور اوامر و نواہی شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے مشروع فرمائے اور جو مادی فرائض و واجبات اور سنتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

چنانچہ اگر ہم سونے، چاندی، نقدی، زرعی اجناس، پھل اور مالِ تجارت کی زکوٰۃ کے حکم پر غور کریں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ معاشرے کے فقراء اور مساکین کی حاجتیں پوری ہو سکیں اور اُن کی محتاجی دُور ہو۔ قرآنِ مجید کی درج ذیل آیت مبارکہ کی رُو سے اموالِ زکوٰۃ کے ذریعے مندرجہ ذیل آٹھ اقسام کے فقراء اور مساکین کی مدد کی جا سکتی ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ
عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ
وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ (التوبہ ۶۰)

(زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانے
والوں کا جن کا دل پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں
اور اللہ کے رستے میں اور راہ کے مسافر کو)

اس سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ امراء کو جو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ نکالیں اور اس رقم سے غرباء کی مدد کریں تو یہ حکم بے مقصد نہیں دیا گیا، بلکہ شارع حکیم وعلیم کے پیش نظر اہل حاجت اور ناداروں کی امداد اور بھلائی ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ ادائیگی زکوٰۃ کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ط (البقرة : ٢٧٦)

(مٹاتا ہے اللہ سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو)

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (المعارج ٢٤-٢٥)

(اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے مانگنے والے اور ہارے ہوئے کا)

آیاتِ بالا کے علاوہ قرآن مجید میں اور بھی متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے صاحب نصاب لوگوں کو اس بات پر اُبھارا ہے کہ وہ اپنے مالوں کی زکوٰۃ نکالیں اور اسے مستحقین تک پہنچائیں۔

جو لوگ اپنے اموال کی زکوٰۃ نہیں نکالتے یا اُسے مستحقین تک پہنچانے میں تساہل سے کام لیتے ہیں انہیں بھی ایسی وعید سنائی گئی ہے

قرآن مجید کی آیاتِ ذیل،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (التوبة ٣٤)

(اور جو لوگ گاڑھ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اُس کو خرچ نہیں کرتے
اللہ کی راہ میں سو اُن کو خوشخبری سنا دے عذاب دردناک کی)

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ
لِلْعُسْرٰى ط (الليل: ٨-١٠)

(اور جس نے نہ دیا اور بے پرواہ رہا اور جھوٹ جانا بھلی بات کو سو اُس کو ہم سہج سہج
پہنچا دیں گے سختی میں)

اور ان کے علاوہ متعدد دیگر آیات میں شدید عذاب کی دھمکی دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرایا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ معاشرے کے مستحق افراد کی مدد ہو اور انہیں حوادثِ زمانہ کے تھپیڑے کھانے کے لئے بے یار و مددگار نہ چھوڑ دیا جائے۔

معاشرے کے نادار اور ضرورتمند افراد ہی کی امداد کے لئے زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقات اور خیرات کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے لئے لوگوں کو پوری پوری ترغیب دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا
وَأَسِيرًا (الدہر : ۸)

(اور کھلاتے ہیں کھانا اُس کی محبت پر محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے دن اللہ کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔ تو کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں پناہ دیں گے اور انہیں میں "وہ شخص ہوگا جس نے صدقہ دیا اور اُسے اس طرح چھپایا کہ بائیں ہاتھ کو پتا نہ چلا دائیں ہاتھ نے کیا دیا" (متفق علیہ)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ شریفہ ہیں جن میں لوگوں کو انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات و خیرات کی ادائیگی کے ذریعے لوگوں کی حاجت روائی پر اُبھارا گیا ہے اور اس ضمن میں زیادہ سے زیادہ ترغیب و تحریص سے کام لیا گیا ہے۔

صدقات و خیرات کے علاوہ ضرورتمندوں کو قرض کا دینا بھی مشروع قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔[1]

"جو کوئی کسی تنگدست کی مشکل آسان کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اُس کی مشکل آسان فرمائیں گے۔" (صحیح مسلم)

ظاہر ہے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی جانب سے ان تمام احکام اور ترغیب و تحریص کا مقصد محتاجوں اور حاجتمندوں کی ضرورتیں پوری کرنا ہے تاکہ ایک تو لوگوں کی مشکلیں آسان ہوں اور دوسرے افرادِ معاشرہ اور اُن کے مختلف طبقات کے درمیان الفت و موانست کے پاکیزہ جذبات و احساسات بیدار ہوں اور ایک دوسرے کی ہمدردی اور خیرخواہی اُن کے دلوں میں راسخ ہو جائے۔

اسی طرح جب ہم اللہ کریم و حکیم کے مشروع کئے ہوئے ذبیحوں سے متعلق واجبات اور سنتوں، جیسے حج کے دنوں میں قربانی، فدی، ہدی اور بچے کی پیدائش کے موقع پر عقیقہ کے حکم کو بنظر تامل دیکھتے ہیں تو ان کے پیچھے ہمیں یہی مصلحت کارفرما نظر آتی ہے کہ افرادِ معاشرہ کی ضرورتیں پوری ہوں اور اُن میں بھائی چارے اور اُخوت و یگانگت کے احساسات بیدار ہوں۔

جیسا کہ آئندہ صفحات میں وضاحت کی جائے گی ان تمام احکام کا مقصد یہ ہے کہ خوشی و مسرت کے اس مبارک دن (یوم عید) کے موقع پر حاجتمندوں اور فقراء کی امداد کی جائے تاکہ اُن کے دل ناداری اور تنگدستی کے باعث رنجیدہ نہ ہوں اور وہ

---

[1] قرآن مجید کی آیاتِ ذیل میں بھی قرضِ حسنہ دینے کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

إِنْ تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعِفْهُ لَكُمْ وَ
يَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ (التغابن: ۱۷)

(اگر قرض دو اللہ کو اچھی طرح پر قرض دینا وہ دونا کر دے تم کو اور تم کو بخشے اور اللہ قدردان ہے تحمل والا) (ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ)

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ
لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ (الحدید: ۱۱)

(کون ہے ایسا کہ قرض دے اللہ کو اچھی طرح پھر اُس کو دونا کر دے اُس کے واسطے اور اس کو ملے ثواب عزت کا)۔

دلی انبساط اور خوشی کے ساتھ اس کی خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔ اسی طرح عید الفطر کے دن صدقۂ فطر کی مشروعیت میں بھی یہی حکمت کارفرما ہے کہ فقراء مساکین اور ناداروں کی مدد ہو تاکہ وہ بھی عید کی خوشیوں میں بھرپور حصہ لے سکیں

لیکن آج جب ہم ایامِ منیٰ میں ذبح کی جانے والی ان قربانیوں، فدی اور ہدی پر غور کرتے ہیں تو ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا گوشت کی اس کثیر مقدار سے فقراء اور مساکین کو کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے، یا اللہ سبحانہ کی یہ عظیم نعمت کسی فائدے اور استفادے کے بغیر یوں ہی ضیاع کی نذر ہو رہی ہے۔ کیا اللہ سبحانہ تعالیٰ کو یہ ضیاع اور وسائل رزق کی یہ بربادی پسند ہے؟

اسلام نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اپنے اموال و املاک کی حفاظت کریں اور انہیں ضیاع سے بچائیں۔ اُس نے ہمیں وضاحت سے بتایا ہے کہ اپنے وسائل کو کس وقت اور کیسے تصرف میں لانا چاہئے اور کہاں اور کیسے حفاظت سے رکھنا چاہیے۔ اس ساری ہدایت و رہنمائی کے بعد بھی اگر مسلمان کسی چیز میں غلط طریقے سے تصرف کریں۔ اُسے بُرے انداز میں زیر استعمال لائیں تو اس کے لئے اسلام کو مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اسلام نے شادی بیاہ کا دروازہ انسان کی فطری خواہشوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کھولا ہے۔ اب اگر کوئی ازدواج کے اس مسنون طریقے کو غلط صورت سے زیر استعمال لائے یا اس اجازت سے ناجائز فائدہ اُٹھائے یا اس میں تشدد اور غلو سے کام لے اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرے۔ بے جا پابندیاں لگائے تو اسلام ایسی تمام باتوں سے قطعاً بری الذمہ ہے ایسے غلط اور ناروا اقدامات کے نتیجے میں جو مشکلات اور مسائل پیدا ہوں اُن کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ یا جیسے اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا، شراب خوری کے مفاسد اور نقصانات جو فرد اور معاشرے کے اخلاق اور انسان کے دین پر مترتب ہوتے ہیں کھول کر بیان کر دیئے۔ اب اگر اس کے بعد بھی مسلمانوں میں شراب نوشی اور اس کی خرید و فروخت کو قانوناً جواز کی سند حاصل ہو جائے تو ہمیں اس کے لئے اپنی ذات کے سوا کسی اور کو ذمہ دار نہ ٹھہرانا چاہیئے۔

اسلام نے عورت کو پردے کا حکم دیا اور اس کے لئے لازم کیا کہ گھر میں ٹھہری رہے، اب اگر اس کے بعد معاشرہ اُسے "آزادی" جیسی "عظیم نعمت" سے سرفراز کر کے — جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے — گھروں سے باہر — دفتروں، ہوٹلوں اور کلبوں کی زینت بنا دے اور اس کے وہ نتائج نکلیں جو نکل رہے ہیں تو اس کے لئے ملامت

ہیں اپنی ذات کے سوا کسی اور کو نہ کرنی چاہیئے۔

مختصر یہ کہ قیام منیٰ کے دوران میں ہمیں قربانی کا جو حکم دیا گیا ہے اُس کا مقصد عام لوگوں کے مصالح کی بجا آوری، فقراء اور مساکین کی حاجت روائی، نفس انسانی کی طہارت و صفائی، اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اس کے تقرب کا حصول ہے۔ لیکن اگر ہم قربانی کے اس گوشت سے کماحقہ استفادہ کرنے کے بجائے اسے ضائع کر دیتے ہیں تو یہ ہمارا قصور ہے، اس کے لئے اسلام کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کیا قرآنِ کریم میں ارشاد باری عزاسمہ نہیں ہے کہ:

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (الحج: ۳۶)

(تو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ صبر سے بیٹھے کو اور بے قراری کرتے کو)

اور

وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ (الحج: ۲۸)

(اور کھلاؤ بُرے حال کے محتاج کو)

کیا کبھی ایسا ہوا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کا جانور ذبح فرمایا اور اُسے مٹی کے نیچے دفن کر دیا، یا اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اسے ضائع کر دیا؟ حاشا ایسا کبھی نہیں ہوا!

ہم اپنی آئندہ بحث میں انشاء اللہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ آج کل جو بندوق کی گولی سے جانوروں اور پرندوں وغیرہ کا شکار کیا جاتا ہے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ آیا ایسا شکار جائز ہے یا ناجائز؟

زیر نظر کتاب انہی تین مسائل پر گفتگو کے لئے لکھی گئی ہے۔

ہم نے اپنی اس بحث میں زیادہ تر اعتماد مذاہب اربعہ اور دیگر مسالک فقہ کی قدیم امہات کتب پر کیا ہے لیکن جدید علماء کی آراء سے استفادے کے لئے نئی کتابیں بھی زیر مطالعہ رہی ہیں اور میرے لئے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے میں نے اُن کی رائے کو ترجیح دی ہے۔

اللہ ہی کی توفیق اور اعانت کا سہارا ہے۔

اس کتاب کا موضوع پانچ ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے چنانچہ

۱۔ پہلا باب اُن جانوروں کے بیان پر مشتمل ہے جن کا کھانا حلال ہے۔

اس باب میں پانچ فصلیں ہیں:

پہلی فصل:۔ مختلف اقوام کے ذبیحے

دوسری فصل:۔ ذبیحے کے حلال ہونے کی شرطیں

تیسری فصل:۔ وہ جانور جنہیں ذبح کیا جاتا ہے۔ ذبح کی اقسام۔
کیا اس مادہ کے ذبح ہوجانے سے جس کے پیٹ میں بچہ ہے وہ بچہ بھی ذبح ہو جائے گا؟ ذبح کرنے کے آداب کا بیان۔ وہ کون سے جانور ہیں جنہیں ذبح نہیں کیا جاتا؟

چوتھی فصل:۔ اہلِ کتاب کا ذبیحہ۔ اُن مسلمانوں کی مشکل جو غیر اسلامی ممالک میں رہتے ہیں۔ درآمد شدہ گوشت۔

پانچویں فصل:۔ حلال جانوروں کا اُصول۔ یہاں صرف اُن جانوروں کا بیان ہے جن کی حلت پر سب کا اتفاق ہے۔ کیا اشیاء کی اصل اُن کا مباح ہونا ہے؟

۲۔ دوسرا باب شکار کے بیان میں۔ شکار کی تعریف اور اُس کا حکم اور کتاب و سنت سے اُس کی دلیل۔

یہ باب چار فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل:۔ وہ اُمور جو شکاری سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری فصل:۔ وہ اُمور جو شکار (جانور) سے تعلق رکھتے ہیں۔

تیسری فصل:۔ وہ اُمور جو آلہ شکار سے تعلق رکھتے ہیں۔

چوتھی فصل:۔ شکار کی ملکیت کب حاصل ہوتی ہے؟

پانچویں فصل:۔ مچھلی کا شکار اور پانی کے دیگر حیوانات کا حکم اور ان جانوروں کا حکم جو خشکی اور تری دونوں جگہ میں رہتے ہیں۔

۳۔ تیسرا باب حرام جانوروں کے بیان میں۔

اس باب میں چار فصلیں ہیں:

پہلی فصل:۔ وہ جانور جو نصِ قرآنی کے مطابق حرام ہیں اور اس تحریم کی حکمت کا بیان۔

دوسری فصل:۔ وہ جانور جو سنت کی رُو سے حرام ہیں۔ اس حکم کی حکمت۔ اس فصل میں اُن جانوروں کا بیان بھی ہے جن کی حُرمت پر علماء کا اتفاق ہے اور اُن کا بھی جن کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

تیسری فصل:۔ کیا حرام جانوروں کے کسی جزو (ہڈی، کھال، بال وغیرہ) کو استعمال میں لانا جائز ہے؟

چوتھی فصل:۔ اضطرار کی حالت میں حرام جانور کا کھانا۔

۴۔ چوتھا باب قربانی، ہدی، فدی اور منیٰ کے مقام پر گوشت کے ضیاع کے بیان میں۔

یہ باب چار فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل:۔ وہ اُمور جو قربانی کے جانور سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری فصل:۔ وہ اُمور جو قربانی سے تعلق رکھتے ہیں۔

تیسری فصل:۔ وہ اُمور جو قربانی کے وقت سے تعلق رکھتے ہیں۔

چوتھی فصل:۔ وہ اُمور جو ہدی، فدی اور منیٰ کے مقام پر گوشت کے ضیاع سے تعلق رکھتے ہیں۔

۵۔ پانچواں باب عقیقہ۔

یہ باب آٹھ فصلوں پر مشتمل ہے۔

پہلی فصل:۔ عقیقے کی تعریف، اس کا حکم اور مشروعیت کی حکمت۔

دوسری فصل: عقیقہ کرنے والے سے متعلق امور۔

تیسری فصل: کن کا عقیقہ کیا جائے گا اور کتنی بکریاں ذبح کی جائیں گی؟

چوتھی فصل:۔ عقیقے میں کون سے جانور ذبح کئے جائیں گے؟

پانچویں فصل:۔ عقیقے کا وقت۔

چھٹی فصل:۔ عقیقے کی عمر۔

ساتویں فصل:۔ عقیقے کے جانور کا گوشت اور اس کے دیگر اجزاء۔

آٹھویں فصل:۔ مولود سے متعلق امور۔

خاتمہ:۔ ذبائح کے بارے میں ہمارے بیان کا خلاصہ اور اس کی شرعی مناسبت، اس لئے اسلام نے ہر چھوٹی بڑی بات لوگوں کو کھول کر بتادی ہے تاکہ وہ اپنے دینی اور دنیاوی امور سے اچھی طرح واقف ہوں اور ہر کام علم کی روشنی میں کریں۔

دعا ہے کہ قارئین کرام کو اس کتاب سے پورا پورا فائدہ پہنچے اور وہ لاعلمی کے باعث غلط طرزِ عمل اختیار کرنے سے بچے رہیں۔

اللہ ہی مدد کرنے والے اور توفیق دینے والے ہیں۔

عبداللہ العبادی

پہلا باب

حلال جانور

یہ باب پانچ فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل:۔ مختلف اقوام کے ذبیحے۔

دوسری فصل:۔ ذبیحے کے حلال ہونے کی شرطیں۔

تیسری فصل:۔ ذبح کئے جانے والے جانور

چوتھی فصل:۔ اہل کتاب کا ذبیحہ۔

پانچویں فصل:۔ جانوروں کے حلال ہونے کا اصول۔

کیا اشیاء کی اصل ان کا مباح ہونا ہے؟

پہلی فصل

مختلف اقوام کے ذبیحے

اسلام سے قبل عربوں کے ذبیحے

عرب جاہلیت میں بعض حلال جانوروں کا گوشت حرام خیال کیا جاتا تھا اور بعض حرام جانوروں کا حلال۔ چنانچہ جن جانوروں کو وہ اپنے بتوں کے تقرب یا اُن کے شر سے بچنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتے تھے اُن کا گوشت کھانا حرام سمجھتے تھے۔ ان جانوروں کا ذکر قرآن مجید میں بھی کیا گیا ہے یعنی بحیرہ[1]، سائبہ[2]، وصیلہ[3] اور حام[4]۔

---

[1] بحیرہ سے مراد وہ اونٹنی ہے جو پانچ دفعہ بیا چکی ہو اور اُس کا آخری بچہ نر ہو۔ عربوں کا طریقہ تھا کہ ایسی اونٹنی کے کان چیر دیتے تھے اور اُس پر نہ سواری کرتے تھے، نہ اُس سے بار برداری کا کام لیتے تھے اور نہ اُسے ذبح کرتے تھے۔ وہ جہاں سے چاہتی پانی پیتی اور جہاں چاہتی چرتی کوئی اُسے روکتا نہ تھا۔

[2] سائبہ سے مراد وہ اونٹنی ہے جسے وہ اپنے بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے تھے اور کوئی اس سے تعارض نہ کرتا تھا۔

[3] وصیلہ اُس اونٹنی کو کہتے تھے جو دس مرتبہ بیا چکی ہو یا وہ بکری جو چھ مرتبہ بیا چکی ہو۔ چھ مرتبہ بیانے کے بعد جب وہ ساتواں بچہ دیتی تو اس کے کان اور سینگ کاٹ دیتے اور کہتے کہ یہ پہنچ چکی ہے چنانچہ نہ اس کو ذبح کرتے نہ مارتے، نہ اُسے کسی حوض پر پانی پینے سے روکتے۔

[4] نر اونٹ جب محدود و معین تعداد میں، مثال کے طور پر دس مرتبہ، جفتی کر چکتا اور اُس کی نسل سے مقررہ تعداد میں بچے پیدا ہو چکتے تو اُسے حام کہتے تھے یعنی اس کی پشت (بار برداری وغیرہ سے) محفوظ ہو گئی ہے۔ چنانچہ اسے آزاد چھوڑ دیتے اور اُس سے کسی قسم کا استفادہ نہ کرتے۔ نہ اُسے کسی جگہ پانی پینے سے روکتے نہ چارہ چرنے سے (قرطبی ۶/۳۳۵۔ ابن کثیر ۲/۱۰۷)

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ
وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (المآئدة : ۱۰۳)

(نہیں مقرر کیا اللہ نے بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حامی ولیکن کافر باندھتے ہیں
اللہ پر بہتان اور اُن میں اکثروں کو عقل نہیں)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سے مروی بخاری شریف کی ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی انتڑیاں گھسیٹ کر چل رہا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے سائبہ بنانے کی رسم جاری کی" (ابن کثیر ۲/۱۷)

قرآنِ مجید کی درج ذیل آیت میں اُن کے اسی غلط خیال کی تردید کی گئی ہے۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ
يَّطْعَمُهٗٓ (الانعام : ۱۴۵)

(تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اُس وحی میں کہ مجھ کو پہنچی ہے کسی چیز کو حرام کھانے
والے پر جو اُس کو کھائے)

امام ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ (طاعم سے مُراد ہے) جو کھانے والا اُسے کھائے۔ کہا گیا ہے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں حیوانات میں سے کسی شے کو حرام نہیں پاتا سوائے اُن کے جن کی تحریم اس کے بعد سورۃ مائدہ کی آیت اور اُن احادیث میں بیان ہوئی جو اس آیت کے مفہوم کو اٹھا دینے والی ہیں۔ بعض لوگ اس کو نسخ کہتے ہیں لیکن اکثر متاخرین اسے نسخ نہیں سمجھتے کیونکہ یہ تو جو چیز اصلاً مباح ہے اُسے اس کی اصلیت پر بحال کرنا ہے[1]۔ واللہ اعلم

[1] تفسیر ابن کثیر ۲/۱۸۳

جاہلی دور کے یہ عرب مُردار بہنے والے خون اور گلا گھٹ کر، چوٹ لگ کر، اونچائی سے گر کر، سینگ لگ کر مرنے والے جانوروں اور اُن جانوروں کو اپنے لئے حلال سمجھتے تھے جنہیں کسی درندہ جانور نے کچھ حصہ کھا کر باقی حصہ چھوڑ دیا ہو۔[۱]

یہود کے ذبیحے :

یہودیوں نے خود بھی اپنے لئے خشکی اور تری کے بہت سے جانور حرام ٹھہرا رکھے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کے کفر و ظلم اور نا انصافی کی پاداش میں ایک ناخن والے تمام جانور اور پرندے، یعنی جن کے کھُر یا پنجے درمیان سے پھٹے نہ ہوں، جیسے ہنس، شتر مرغ، بطخ، اونٹ وغیرہ، نیز گائے اور بھیڑ کی چربی اُن کے لئے حرام قرار دے دی تھی۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِىْ ظُفُرٍۚ وَمِنَ
الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَاۤ اِلَّا مَا
حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَايَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍؕ
ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (الانعام: ۱۴۶)

(اور یہودیوں پر ہم نے حرام کیا تھا ہر ایک ناخن والا جانور اور گائے اور بکری میں سے حرام کی تھی اُن کی چربی مگر جو لگی ہو پشت پر یا انتڑیوں پر یا جو چربی کہ ملی ہو ہڈی کے ساتھ یہ ہم نے ان کو سزا دی تھی اُن کی شرارت پر اور ہم سچ کہتے ہیں)

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "یہودیوں پر یہ چیزیں آزمائش اور سزا کے طور پر حرام کی گئی تھیں"

امام مجاہدؒ اور قتادہؒ فرماتے ہیں، ایک ناخن والے جانوروں سے مُراد وہ جانور اور پرندے ہیں جن کے

---

[۱] دیکھیے تفسیر قرطبی - ۶/۱۲۱

کھر یا پنجے درمیان سے پھٹے ہوئے نہ ہوں، جیسے اونٹ، شترمرغ، ہنس اور بطخ۔ امام قتادہ کہتے ہیں کہ ثروب اور شحوم (چربی) دونوں حرام کی گئی تھیں۔ ثروب جمع ہے ثرب کی جو ایک قسم کی پتلی چربی ہوتی ہے اور جانور کی آنتوں پر پائی جاتی ہے[1]۔

نصاریٰ کے ذبیحے

نصرانی ہر قسم کے جانور کا ہر طرح کا گوشت اپنے لئے حلال سمجھتے ہیں جن میں سُوئر کا گوشت بھی شامل ہے جو شرعاً ان کے لئے حرام تھا۔

برہمن

برہمن[2] اور بعض فلسفی قسم کے لوگ کسی جاندار کا گوشت کھانا حلال نہیں سمجھتے اور صرف نباتات پر گزارہ کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ حیوانات کو ذبح کرنا انہیں عذاب دینا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ حیوانات ذی روح ہیں لہٰذا وہ انسان جیسے ہیں اور کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ انہیں ذبح کرکے اُن کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہو۔ اس طرح ان لوگوں نے اپنے آپ کو اللہ کی نعمتوں اور پاکیزہ رزق سے محروم کر لیا ہے۔ لیکن ہم مسلمانوں کا

---

[1] القرطبی ۷/۱۲۷۔

[2] ہندو مذہب کو آٹھویں صدی قبل مسیح میں "برہما" سے نسبت دیتے ہوئے اس پر اسم "برہمیہ" کا اطلاق کیا گیا۔ یہ لفظ سنسکرت زبان کا ہے اور اس کے معنی ہیں اللہ۔ ہندو مذہب کے علماء کا اعتقاد ہے کہ اﷲ الموجود بذاتہ ہے جس کا ادراک حواس سے نہیں بلکہ عقل سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ اصل، ازلی اور مستقل ہے جس نے پوری کائنات کو پیدا کیا۔ عالم کا وجود اسی کے سہارے قائم ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہمارے مت کے علماء اپنے طبائع کے اعتبار سے برہما کے عنصر سے اتصال رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں برہمن کہا جاتا ہے۔

اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ سب انسان کے استفادے اور اُس کی عزت افزائی کے لئے پیدا کیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ: ۲۹)

(وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب)

یہ تمام نعمتیں ہمارے لئے اللہ تعالیٰ نے جائز کی ہیں جو ہر چیز کے پیدا کرنے والے، ہر چیز کے بنانے والے اور ہر چیز میں خود مختارانہ تصرف کرنے والے ہیں۔ انہیں نے ہمیں ان چیزوں کے استعمال اور ان سے استفادے کی اجازت دی ہے لہٰذا اگر ہمارا ہی جیسا اللہ کا مخلوق کوئی بندہ ان میں سے نہ تو کسی چیز کا خالق ہے اور نہ ان کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتا ہے، انہیں ہمارے لئے حرام ٹھہرائے تو اس کی اس رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنی اولاد کو اپنے تمام مال سے استفادے کی اجازت دے لیکن ایک اجنبی شخص آئے اور انہیں اپنے باپ کا مال استعمال کرنے سے روکنا چاہئے تو اس کی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی اس لئے کہ وہ خواہ مخواہ ایک ایسے معاملے میں مداخلت کر رہا ہے جس کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

دوسری فصل

ذبیحے کے حلال ہونے کی شرطیں

ائمہ اربعہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ذبیحے کا گوشت حلال ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں تین شرطیں پائی جائیں یعنی:

(الف) یہ کہ مذبوح کوئی ایسا جانور نہ ہو جسے شرع نے حرام قرار دیا ہو۔

(ب) یہ کہ جانور کو ذبح کرتے وقت کسی غیر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

(ج) یہ کہ جانور کو شرعی طریقے سے ذبح کیا گیا ہو۔

(د) چوتھی شرط جس کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے یہ ہے کہ آیا جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا واجب ہے یا نہیں۔

(۱) پہلی شرط | جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے تو شرعاً حرام جانوروں کا بیان انشاءاللہ تیسرے باب میں کیا جائے گا اور اُن کے حرام ہونے کی حکمت بھی وضاحت کے ساتھ سپردِ قلم کی جائے گی۔

(ب) دوسری شرط | دوسری شرط یہ ہے کہ ذبیحے پر کسی غیر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اگر ایسا کیا گیا تو اس کا حکم وہی ہوگا جو مُردار جانور کا اور اس کا کھانا قولِ باری تعالیٰ عز اسمہ کے مطابق حلال نہ ہوگا۔

وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (المائدہ : ۳)

(اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا)

کے مطابق حلال نہ ہوگا۔

اس مسئلے میں تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اگر کوئی مسلمان جانور ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے جیسے کسی نبی کا یا فرشتے کا یا ولی کا یا کعبے کا یا اسی طرح کسی اور کا تو وہ ذبیحہ مُردار ہے جس کا کھانا حلال نہیں۔

لیکن اگر کوئی کتابی، جیسے یہودی یا عیسائی، اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے۔ مثلاً حضرت مسیح (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کا یا گرجے کا اور مسلمان کو یقین سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس نے ایسا کیا ہے تو جمہور علماء کے نزدیک وہ ذبیحہ حرام ہے۔ ائمہ اربعہ یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔

تاہم سلف میں سے بعض علماء کا فتویٰ ہے کہ نصرانی کا ذبیحہ کھانا خواہ اس پر کسی گرجا کا نام لیا گیا ہو، ارشادِ باری تعالیٰ،

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ (المائدہ ۵:۵)

(اور اہل کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے)

کے مطابق حلال ہے[1]۔

ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ، لعنت فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اُس شخص پر جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر جانور ذبح کرے، اور لعنت فرماتے ہیں اللہ سبحانہٗ تعالیٰ اُس شخص پر جو کسی بدعتی کو ٹھکانا دے اور لعنت فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اس شخص پر جو اپنے والدین پر لعنت بھیجے اور لعنت بھیجتے ہیں اللہ تعالیٰ اس شخص پر جو زمین کے نشانات کو بگاڑے[2]۔

کتاب اعانۃ الطالبین میں لکھا ہے کہ

---

[1] دیکھیے کتاب الاُم، تالیف حضرت امام شافعی ۱۹۸/۲، فتح القدیر تالیف ابن الھمام ۱۷۷/۹ اور فتاوی شیخ محمد رشید رضا ۲۵۲/۱ - ۲۵۴۔

[2] اس حدیث کو امام احمد، مسلم اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۱۵۷/۸ - ۱۵۸۔

جو جانور بادشاہ سے ملاقات کے موقع پر یا کسی پیر کی قبر پر یا اسی طرح کسی اور موقع اور مقام پر ذبح کیا جائے تو اگر اس کا مقصد اُس بادشاہ یا پیر کی رضا جوئی اور اُس کے تقرب کا حصول ہے تو وہ جانور مُردار کی مانند ہے اور اس کا کھانا حرام ہے۔ کیونکہ اس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہے، بلکہ اگر اُس کے ذبح کرنے کا مقصد اس بادشاہ یا پیر کی تعظیم اور عبادت ہے تو یہ کفر ہے۔ لیکن اگر جانور ذبح کرنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہو اور اُس کا گوشت کسی بادشاہ یا پیر کی طرف سے صدقہ کر دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ بعض زائرین کا طریقہ ہے کہ وہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں اور پھر اس کا گوشت پیر کی تکریم کے لئے، نہ کہ اس کی تعظیم اور عبادت کے نقطۂ نظر سے صدقہ کر دیتے ہیں[1]

(ج) تیسری شرط تیسری شرط یہ ہے کہ جانور کو ذبح کرنے کا عمل شرعی طریقے سے بجا لایا جائے۔ یہ شرط پانچ نقاط پر مشتمل ہے۔

۱۔ ذکاۃ (ذبح یا نحر کرنا) کی تعریف لغت اور شرع کے نقطۂ نظر سے۔

۲۔ وہ شرائط جن کا مذبوح (جانور) میں پایا جانا ضروری ہے۔

۳۔ وہ شرائط جن کا آلہ ذبح میں پایا جانا ضروری ہے۔

۴۔ مذکی (یعنی ذبح کرنے والے) کی اہلیت۔

۵۔ کیفیتِ ذبح

(۱) ذکاۃ (ذبح کرنا) کی تعریف:

لغت میں تذکیہ (ذبح یا نحر کرنا) کے معنی ہیں کسی چیز کو پاکیزہ بنانا، اچھا کرنا۔

۱۔ اعانۃ الطالبین ۲/۳۴۹۔ عوام کے لئے یہ بات افضل و اَولیٰ بلکہ واجب ہے کہ وہ پیروں کے

مزار پر جانور وغیرہ ذبح کرنے سے پرہیز کریں۔ کیونکہ اگر پیر واقعی اللہ کا نیک بندہ ہے تو اسے اس امر کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس کی روح کو ایصال ثواب کے لئے جانور ذبح کئے جائیں۔ چنانچہ عوام کا ایسی باتوں سے دُور رہنا اچھا اور سلامتی کا باعث ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ممالک اسلامیہ میں اس قسم کی بری رسمیں بڑا رواج پاگئی ہیں۔ یہ چیزیں دین اور عقیدے کے لئے سنگین خطرات کی حامل ہیں۔ اگر ان برائیوں کی بیخ کنی میں تساہل سے کام لیا گیا تو یہ اپنی انتہا کو پہنچ جائیں گی۔ آج کل بھی ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ جنوں اور اولیاء کے نام پر جانور ذبح کر رہے ہیں۔ تاکہ یا تو اس سے مال دولت ملے یا تکالیف اور مصیبتوں سے نجات حاصل ہو۔ جیسا کہ بعض عورتیں اس لئے جانور ذبح کرتی ہیں کہ انہیں اولاد ملے یا ان کی مصیبتیں دُور ہوں۔ بہر حال ایسے تمام ذبیحوں کا کھانا حرام ہے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم عوام کو ایسی برائیوں سے روکیں اور انہیں صحیح مسائل سے آگاہ کریں۔ جیسے کہا جاتا ہے "رائحۃ ذکیۃ" یعنی اچھی بو، خوشگوار خوشبو۔ چنانچہ ذکاۃ کو ذکاۃ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس عمل سے ذبیحے کی بُو اچھی ہو جاتی ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ لغت میں ذکاۃ کے معنی "تتمیم یعنی مکمل کرنا" ہیں۔ چنانچہ ذکاۃ الشاۃ (بکری کو ذبح کیا) کے معنی ہوں گے "بکری کو ذبح کیا گیا تاکہ اباحت کی تکمیل ہو جائے اسی لئے کہا جاتا ہے "فلاں ذکی" یعنی فلاں شخص فہم تام کا مالک ہے[1]۔

لیکن شرع میں، جیسا کہ امام ماوردیؒ نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے، ذکاۃ کے معنی "قطع مخصوص" (یعنی مخصوص طریقے سے کاٹنا) ہیں۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں۔ کہا جاتا ہے "ذکیت الذبیحۃ اذکیہا" (یعنی میں نے ذبیحے کو ذبح کر کے پاک کر لیا) یہ تطییب یعنی "پاکیزہ بنانا" سے مشتق ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "رائحۃ ذکیۃ" یعنی اچھی بو۔ چنانچہ جب جانور کا گندہ خون (عمل ذبح کے ذریعے) بہہ جاتا ہے تو وہ پاک ہو جاتا ہے کیونکہ اب اُس میں خشک ہو جانے کا عمل تیزی سے وقوع پذیر ہوتا ہے امام قرطبی مزید لکھتے ہیں: شریعت میں (تذکیہ) عبارت ہے ذبح شدہ جانور کا خون بہہ جانے اور اُس کی خون کی رگیں (یعنی

---

[1] دیکھیے کفایۃ الاختیار ۲/۲۲۲۔

اوداج) کٹ جانے سے، اور نحر شدہ جانور کے نحر ہوجانے سے، اور جو جانور قابو سے باہر ہو گیا ہو اس کے عقر ہوجانے سے (درآنحالیکہ ذبح کرنے والے کی نیت) اللہ کی رضا حاصل کرنا ہو اور اس نے (ذبح یا نحر یا عقر کرتے وقت) اللہ کا نام لے لیا ہو"[1]۔

۲۔ مذبوح میں کن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے

ائمہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ذبح کے عمل کی بہترین اور کمالی صورت یہ ہے کہ گلا یعنی سانس کی نالی جسے نرخرہ کہتے ہیں مری یعنی غذا کی نالی اور گردن کی دو شہ رگیں جو ودج کہلاتی ہیں اور گردن کے دونوں جانب سامنے کی طرف ہوتی ہیں کٹ جائیں۔

لیکن فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ کتنا حصہ کٹنا کافی ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ حلق کی ابتداء سے لے کر سینے کی ابتداء تک کی جگہ سے کاٹنا ذبح ہے اس طرح کہ اوداج (خون کی رگیں) نرخرہ اور مری کٹ جائے اگر ان میں سے کوئی سی تین رگیں کٹ گئیں تو یہ بھی کافی ہے۔ کیونکہ احناف کے نزدیک اکثر کا کٹ جانا کل کے کٹ جانے کے برابر ہے[2]۔

مالکیہ کے نزدیک ذبح کرنا یہ ہے کہ حلقوم یعنی سانس کی نالی اور گردن کی دونوں شہ رگیں (اوداج) سامنے سے کٹ جائیں چنانچہ اگر دونوں رگوں میں سے ایک کٹی اور دوسری نہ کٹی تو ذبیحہ حلال نہ ہوگا۔

شافعیہ کی رائے میں ذکاۃ شرعی یہ ہے کہ حلقوم اور مری دونوں پوری کٹ جائیں۔

حنابلہ کے نزدیک حلقوم اور مری کے کٹ جانے سے ذکاۃ شرعی کا عمل مکمل ہو جاتا ہے[3]۔

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک (ذبح کرنے سے) مقصود یہ ہے کہ جانور کی روح نکل جائے، اور مری اور حلقوم کے کٹ جانے سے یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے، چنانچہ ان دونوں کے کٹ جانے کے بعد جانور زندہ نہیں رہتا۔

---

[1] تفسیر القرطبی ۶/۵۲، ۵۳ ۔ احکام القرآن لابن العربی ۲/۵۴۱

[2] فتح القدیر تالیف ابن ہمام ۹/۴۹۵

[3] الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱/۷۲۵۔۔۷۳۰، نیز دیکھیے: تفسیر امام قرطبی ۶/۵۲ ۔ بدایۃ المجتہد ۱/۴۳۸ ۔ حاشیہ الدسوقی ۲/۹۹

حنفیہ کہتے ہیں کہ شافعیہ کی دلیل لفظاً اور معنیٰ کمزور ہے۔ لفظاً تو اس لئے کہ اوداج کے لفظ کا اطلاق حلقوم پر نہیں ہوتا اور معناً اس لئے کہ ذبح کرنے کا اصل مقصد خون کا بہانا ہے اور یہ مقصد خون کی نالیوں یعنی ودجان کے کٹنے سے حاصل ہوتا ہے[1]۔

جیسا کہ ظاہر ہے اس مسئلے میں احناف کی رائے قوی تر ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی درج ذیل حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اُن کی تائید کرتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

"حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کے ذبیحے سے منع فرمایا ہے جو یہ ہے کہ جانور کو ذبح کیا جائے (اس طرح کہ) اس کی جلد تو کاٹی جائے لیکن اوداج (یعنی خون کی رگیں) کاٹے بغیر یونہی چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائے[2]"

شافعیہ اور حنابلہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو مرّی (یعنی غذا کی نالی) کو نہ کاٹے اور جانور کو یونہی مرنے کے لئے چھوڑ دے) ان کی دلیل مندرجہ ذیل حدیث ہے۔

"جس (ذبیحے) کا خون بہہ گیا ہو اور اُس پر اللہ کا نام لے لیا گیا ہو اُسے کھاؤ[3]"

اس حدیث میں خون کی رگوں (یعنی ودجان) کے کاٹے جانے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ کہا گیا ہے "جس سے (ذبیحے) کا خون نکل گیا ہو" جس سے مراد یہ ہے کہ حلقوم (یعنی نرخرہ) اور مرّی کٹ چکی ہو[4]۔

اس مسئلے میں علماء کا اجماع ہے کہ اگر جانور کو حلق میں غلصمہ[5] (سر اور گردن کا درمیانی حصہ) کے نیچے سے کاٹا جائے

---

[1] فتح القدیر تالیف ابن ہمام ۹/۴۹۳، ۴۹۲ ۔ بدائع الصنائع ۶/۲۷۶۷ ۔

[2] ابوداؤد۔ دیکھئے نیل الاوطار ۸/۱۶۱ ۔

[3] اس حدیث کو ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ دیکھئے مسلم شریف کی شرح النووی ۱۳/۱۲۲ ۔

[4] العدہ ص ۴۶۰ ۔

[5] اسے جوزہ بھی کہا جاتا ہے۔

تو تذکیہ کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اُسے غلصمہ کے اوپر سے ذبح کیا گیا اور بدن کی طرف کا حصہ چھوڑ دیا گیا تو ذکاۃ صحیح ہوگی یا نہیں اس مسئلے میں اُن کے درمیان اختلاف ہے۔

امام مالکؒ کے مشہور مذہب کی رُو سے ایسا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا لیکن امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کی رائے میں اُس کا کھانا جائز ہوگا اس لئے کہ (ذبح کرنے کا) جو مقصد تھا وہ پورا ہو چکا ہے[1]۔

اس مسئلے میں مؤخرالذکر رائے ہی صحیح ہے اس لئے کہ احادیث میں غلصمہ کا ذکر کہیں نہیں کیا گیا۔ ذبح کرنے کا اصل مقصد خون کا بہا دینا ہے جو حلقوم، مری اور ودجان کے کٹنے سے پورا ہو جاتا ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جن سے احادیث میں تعرض کیا گیا ہے۔

اسی طرح علماء کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ اگر کوئی مریض جانور، جو قریب المرگ نہ ہو، ذبح کر لیا جائے تو اُس کا کھانا حلال ہے۔ لیکن اگر ایسا جانور ذبح کیا گیا جو شدتِ مرض کے باعث موت کے قریب تھا تو اُس کا ذبیحہ حلال ہونے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے،

جمہور کی رائے ہے کہ اس کا ذبح کرنا صحیح ہوگا۔ امام مالکؒ کا مشہور قول بھی یہی ہے۔ لیکن ان کی ایک دوسری روایت کے مطابق اس کا ذبح کرنا بے فائدہ ہوگا۔ اس مسئلے میں اختلاف کی وجہ حضرت کعب بن مالکؓ سے مروی ایک اثر اور قیاس کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت کعب کے اس اثر میں کہا گیا ہے کہ اُن کی باندی سلع کے مقام پر بھیڑیں چرا رہی تھی جن میں سے ایک بھیڑ اچانک گر پڑی۔ قریب تھا کہ وہ مر جاتی لیکن باندی نے پھرتی سے ایک پتھر توڑا اور اس کی دھار سے بھیڑ کو ذبح کر لیا۔ جب اس کا مسئلہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا "اُسے کھا لو"[2]۔

لیکن جہاں تک قیاس کا تعلق ہے تو یہ امر سب کو معلوم ہے کہ تذکیہ زندہ جانور کا کیا جاتا ہے اور ایسا جانور (جو قریب المرگ ہو) مُردے کے حکم میں ہے۔

---

[1] دیکھیے تفسیر قرطبی ۶/۵۴ اور بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۲

[2] اس اثر کو امام بخاریؒ اور امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔ دیکھیے نیل الاوطار ۸/۱۵۷

تاہم جن علماء نے ایسے جانور کے ذبیحے کو جائز قرار دیا ہے وہ بھی اس امر پر متفق ہیں کہ اس کا ذبح کرنا صرف اُس حالت میں جائز ہوگا جب کہ اُس میں زندگی کی کوئی علامت پائی جاتی ہو۔ لیکن ایسی علامت جس سے اُس کی زندگی کا یقین کیا جاسکے کیا ہے؟ یہ مسئلہ اُن کے درمیان مختلف فیہ ہے۔

بعض کی رائے ہے کہ ایسے جانور کے جسم میں حرکت کا پایا جانا ضروری ہے جب کہ دوسرے اسے ضروری نہیں سمجھتے پہلی رائے حضرت ابوہریرہؓ کی ہے اور دوسری حضرت زید بن ثابتؓ کی۔ (بعض علماء نے تین طرح کی حرکت ضروری قرار دی ہے) یعنی آنکھ کا جھپکنا، دُم کا ہلنا اور ہاتھ پاؤں کا زمین پر مارنا۔ سعید بن المسیبؒ اور زید بن اسلم کی یہی رائے ہے اور اسی کو محمد بن المواز نے اختیار کیا ہے۔ ابن حبیب اور بعض دیگر علماء نے ان چیزوں کے علاوہ سانس کی آمد و رفت کو بھی ضروری قرار دیا ہے[1]۔

شافعیہ کے نزدیک ایسے جانور کا ذبیحہ حلال ہونے کے لئے جو بیمار نہ ہو بلکہ کسی اور سبب سے قریب المرگ ہو) ضروری ہے کہ ذبح سے پہلے اُس میں حیاتِ مستقرہ باقی ہو، جس کی دلیل یہ ہے کہ اُس میں:

(۱) ذبح ہونے کے بعد شدید حرکت پائی جائے۔

(۲) خون اچھل کر تیزی سے نکلا ہو۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اگر جانور میں ذبح کے بعد شدید حرکت پائی جائے تو یہ امر صحتِ تذکیہ (ذبح) کے لئے کافی ہے۔ اگر مذکورہ علامات موجود نہ ہونے کے باعث اس امر میں شک ہو کہ آیا جانور میں زندگی باقی تھی یا نہیں تو اُس کا کھانا حرام ہوگا۔ جیسے کسی جانور کو کسی درندے نے زخمی کر دیا ہو یا اُس پر تلوار گر پڑی ہو یا اُسے بلی نے بھنبھوڑ لیا ہو یا اُس نے کوئی مضر گھاس پتی کھالی ہو جس سے اس کی ہلاکت یقینی ہوگئی ہو خواہ کچھ دیر کے بعد ہو ایسے جانور کو اگر ذبح کر لیا جائے تو اُس کے حلال ہونے کے لئے اُس میں مندرجہ بالا شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

یہ اُس صورت میں ہے جب کہ کوئی ایسا سبب پیش آیا ہو جس سے اُس کے ہلاک ہو جانے کا خطرہ ہو۔ لیکن

---

[1] بدایۃ المجتہد ۱/۴۲۸۔ المجموع ۹/۸۷

اگر کوئی سبب پیش نہ آیا ہو یا سبب تو پیش آیا ہو لیکن اُس سے جانور کی ہلاکت کا خطرہ نہ ہو جیسے اُس پر کسی مرض کا حملہ ہوا ہو تو ایسی صورتوں میں ان شرائط کا پایا جانا ضروری نہیں۔ جانور میں حیات مستقرہ سے مراد یہ ہے کہ وہ اُس کے ذریعے ایک یا دو دن زندہ رہ سکے۔ چنانچہ اگر کسی درندے نے بکری کو زخمی کر دیا ہو یا اُس پر مکان کی چھت گر پڑی ہو اور اس امر میں شک ہو کہ آیا اُس میں حیاتِ مستقرہ باقی ہے یا نہیں تو صحیح بات یہ ہے کہ اُس کا کھانا حرام ہوگا۔

کتاب اعانت الطالبین میں لکھا ہے کہ:

"جاننا چاہیئے کہ فقہاء نے اپنی تحریروں میں (قریب المرگ جانور میں زندگی کی تین قسمیں قرار دی ہیں یعنی) حیاتِ مستقرہ، حیاتِ مستمرہ اور حرکتِ مذبوحی جسے "مذبوح کی زندگی" کہا جاتا ہے اور ان کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ حیاتِ مستقرہ ثابت و جاری ہوتی ہے یعنی یہ کہ جانور کے جسم میں روح ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اُس میں اپنے ارادے سے دیکھنے کی قوت بھی ہوتی ہے، نیز یہ کہ اُس کی حرکات اختیاری ہوتی ہیں نہ کہ اضطراری۔ حیاتِ مستمرہ یہ ہے کہ جسم سے روح کا اخراج ہو رہا ہو اور حرکتِ مذبوحی کی حالت میں نہ تو جانور اپنے ارادہ و اختیار سے دیکھ سکتا ہے اور نہ اِدھر اُدھر حرکت کر سکتا ہے بلکہ اُس کا دیکھنا اور مختلف حرکتیں کرنا اضطراری ہوتا ہے۔

بعض علماء نے ان کیفیتوں کے درمیان فرق اس طرح بیان کیا ہے کہ حیات مستقرہ یہ ہے کہ اگر جانور کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک دن یا دو دن زندہ رہے اور حیات مستمرہ وہ ہے جو انقضائے اجل تک جاری رہے ——— اور حرکتِ مذبوحی یہ ہے کہ اگر جانور کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے تو وہ فوری طور پر مر جائے۔ تاہم اس سلسلے میں اول الذکر رائے زیادہ مشہور ہے[1]۔"

مالکیہ کی رائے:

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی جانور مریض ہو ——— یا اُس نے کوئی ایسی گھاس کھالی ہو جس سے اُسے اپھارہ ہو گیا ہو

---

[1] اعانت الطالبین ۲/۳۴۳

یا وہ کسی اونچے مقام سے گر پڑا ہو لیکن اُس کے جسم کا کوئی ایسا نازک حصہ زخمی نہ ہوا جس کے زخمی ہونے سے جانور کی موت واقع ہوجاتی ہے تو اُس کا ذبیحہ حلال ہونے کے لئے شرط ہے کہ ذبح کرتے وقت اُس میں قوی حرکت پائی جائے جیسے ہاتھ پاؤں کا مارنا وغیرہ۔ معمولی حرکت جیسے جسم میں ارتعاش کا ہونا، یا آنکھ کا جھپکنا یا ہاتھ پاؤں کا پھیلانا یا کسی ایک ہاتھ یا ٹانگ کا سکیڑنا معتبر نہیں اور نہ صرف اتنی بات کافی ہے کہ اس کے جسم سے خون بہا ہو۔

لیکن صحیح رائے یہ ہے کہ ایسے جانور کا ذبیحہ حلال ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ یا تو ذبح کرتے وقت اس میں شدید حرکت پائی جائے یا اُس کے جسم سے خون بہہ نکلے، خواہ بغیر فوارے کی صورت کے، اس لئے کہ بعض لوگ ذبح کرتے وقت چھری اتنی قوت اور تیزی سے چلاتے ہیں کہ جانور حرکت نہیں کرتا[1]۔

۳۔ آلۂ ذبح کے لئے ضروری شرطیں:

اس مسئلے میں تمام علماء کا اتفاق ہے کہ آلۂ ذبح دھار دار ہونا چاہیے۔ اگرچہ فی الحقیقت آلۂ ذبح چھری[2] ہے لیکن اجازت ہے کہ کسی بھی ایسی چیز سے جانور ذبح کر لیا جائے جو دھار دار ہو اور کاٹ سکتی ہو۔ خواہ وہ لوہے کی بنی ہوئی ہو یا شیشے، تانبے، سونے، دھار دار لکڑی اور پتھر سے بنائی گئی ہو۔ لیکن دانت، ناخن یا ہڈی سے بنی ہوئی نہ ہو۔

حضرت کعبؓ بن مالک سے روایت ہے کہ اُن کی بھیڑیں سلع کے مقام پر چر رہی تھیں کہ اُن کی باندی نے دیکھا، اُن بھیڑوں میں سے ایک بھیڑ مر رہی ہے، اُس نے فوراً ایک پتھر توڑا اور اُس کے ذریعہ اُس بھیڑ کو ذبح کر لیا حضرت کعبؓ نے کہا اسے کھایا نہ جائے تاوقتیکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پوچھ لوں یا انہوں نے کسی

---

[1] حاشیہ الدسوقی ۱۱۲/۲-۱۱۳

[2] عربی زبان میں چھری کو سکین اور مدیہ کہتے ہیں سکین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی حرکت کو روک دیتی ہے اور زندگی سے پیدا کرنے والی حرارت کو ختم کر دیتی ہے اور مدیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ زندگی کی مدت کو کاٹ دیتی ہے۔ (قلیوبی وعمیرہ ۲۴۲/۴)

شخص کو حضورؐ کی خدمت میں بھیجا تاکہ وہ اس بارے میں آپؐ سے پوچھے اور اُس نے حضورؐ سے پوچھا یا حضورؐ نے کسی کو حضرت کعبؓ کے پاس بھیجا اور فرمایا کہ اسے کھا لیا جائے۔ کعبؓ کہتے ہیں کہ عبداللہ نے کہا کہ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ وہ لونڈی تھی اور اُس نے بھیڑ کو پتھر سے ذبح کر لیا۔[1]

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ ایک بھیڑیئے نے کسی بکری کو دانت مارا تو اُسے چقماق سے ذبح کر لیا گیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی کہ اُسے کھا لیا جائے۔[2]

اس مسئلے میں عام اجازت دی گئی ہے کہ جانور کو ہر چیز سے ذبح کیا جا سکتا ہے جو دھار دار ہو سوائے دانت اور ناخن کے کہ ان کی ممانعت ہے۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! کل ہمارا دشمن سے مقابلہ ہے اور ہمارے پاس چھُری نہیں (ہم اپنے جانور کیسے ذبح کریں)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس چیز سے (جانور کا خون بہہ جائے) اور اس پر اللہ کا نام لے لیا گیا ہو تو کھاؤ لیکن (آلۂ ذبح) دانت یا ناخن نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ دانت تو ہڈی ہے اور ناخن حبشیوں کی چھُری۔[3]

اس حدیث سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ ذبح کرنے کا اصل آلہ چھُری ہے۔

ناخن، دانت اور ہڈی سے ذبح کرنے کی ممانعت کے بارے میں علماء نے بہت سی وجوہ بیان کی ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ صحیح اور انسب یہ ہے کہ یہ چیزیں اچھی طرح نہیں کاٹتیں جس کی وجہ سے جانور کو بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے حالانکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم ذبح کرو تو عمدگی سے ذبح کرو۔ چھُری کی

---

[1] اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ دیکھیے نیل الاوطار ۱۵۷/۸

[2] اس حدیث کو امام احمدؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ مروہ ایک سفید پتھر ہوتا ہے نیز یہ بھی کہا گیا کہ (وہ ایسا پتھر ہے) جس سے آگ نکلتی ہے۔ دیکھیے نیل الاوطار ۱۵۹/۸

[3] اس حدیث کو بہت سے محدثین نے روایت کیا ہے۔ دیکھیے امام نووی کی شرح مسلم ۱۲۴/۱۳

دھار کو اچھی طرح تیز کرلو اور ذبیحے کو آرام پہنچاؤ۔

ناخن میں ہر قسم کا ناخن داخل ہے۔ خواہ انسان کا ہو یا حیوان کا اور خواہ جسم کے ساتھ پیوستہ ہو، خواہ علیحدہ۔ امام شافعی اور اُن کے اصحاب، اور احمد، نخعی، حسن بن صالح، لیث، اسحاق اور جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔

لیکن امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک اگر دانت اور ہڈی جسم کے ساتھ پیوستہ ہو تو اُس کے ساتھ ذبح کرنا جائز نہیں، اگر علیحدہ ہو تو جائز ہے لیکن کراہیت کے ساتھ۔ حدیث بالا کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہاں دانت سے اور ناخن سے مراد وہ دانت اور ناخن ہے جو جسم کے ساتھ پیوستہ ہو اس لئے کہ حبشی اپنی قوت کے اظہار کے لئے ایسا کرتے تھے اور یہ امر صرف اُس صورت میں ممکن ہے جب کہ ناخن یا دانت جسم سے پیوستہ ہو۔[1]

اس مسئلے میں امام مالکؒ سے متعدد روایات مروی ہیں جن میں سب سے مشہور روایت کے مطابق ہڈی کے ساتھ ذبح کرنا جائز ہے لیکن دانت کے ساتھ نہیں۔[2]

علامہ ابن رشد لکھتے ہیں۔

"کچھ لوگوں نے اس ممانعت سے یہ مطلب سمجھا ہے کہ اکثر صورتوں میں یہ چیزیں طبعاً ایسی نہیں جن سے خون بہے۔ اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان چیزوں سے ذبح کرنے کی ممانعت بغیر بیانِ علت کے کی گئی ہے۔ جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ یہ ممانعت بغیر بیانِ علت کے کی گئی ہے ان میں سے کچھ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ان چیزوں کی ممانعت ان کی خرابی کی وجہ سے ہے۔ اور کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ممانعت کراہت کے طور پر ہے نہ کہ ان چیزوں کے ممنوع ہونے کی بنا پر۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس ممانعت کی وجہ ان چیزوں سے اکثر صورتوں میں خون کا نہ بہنا ہے انہوں نے کہا ہے کہ اگر ان چیزوں کے ساتھ ذبح کرنے سے خون بہہ جاتے تو ذبیحہ جائز ہوگا۔ اسی طرح بعض

---

[1] فتح القدیر ۹/۴۹۵، بدائع الصنائع ۶/۲۷۶۹

[2] تفسیر قرطبی ۵/۵۳، ۵۴

لوگوں کی رائے ہے کہ دانت اور ناخن جسم سے علیحدہ ہونا چاہیئے کیونکہ اُن سے خون صرف اس صورت میں بہہ سکتا ہے جب کہ وہ جسم سے پیوستہ نہ ہوں۔ احناف کی رائے یہی ہے۔ اور جن فقہاء کی یہ رائے ہے کہ ان چیزوں کی ممانعت بلا کسی سبب کے کی گئی ہے اور یہ کہ یہ ممانعت ان چیزوں کی خرابی کی طرف دلالت کرتی ہے انہوں نے کہا ہے کہ اگر دانت یا ناخن سے ذبح کیا تو تذکیہ نہ ہوگا خواہ جانور کا خون بہہ گیا ہو۔ جن فقہاء کی یہ رائے ہے کہ یہ ممانعت دانت اور ناخن کی خرابی کی جانب دلالت نہیں کرتی وہ کہتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی چیز کے ساتھ جانور ذبح کیا گیا اور اُس کا خون بہہ گیا تو ذبیحہ حلال ہوگا لیکن ایسا کرنے والا گناہ گار ہوگا۔ جن علماء کی رائے ہے کہ ناخن اور دانت سے ذبح کرنے کی ممانعت کراہت کے باعث ہے وہ کہتے ہیں کہ ان سے ذبح کرنا مکروہ ہے لیکن حرام نہیں۔

علامہ ابن رشد مزید لکھتے ہیں: "جو لوگ ہڈی اور دانت کے درمیان فرق کرتے ہیں اُن کا ایسا کرنا بے معنی ہے اس لئے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دانت سے ذبح کرنے کی ممانعت کی وجہ یہی بیان کی ہے کہ دانت بھی ہڈی ہے۔" پھر کہتے ہیں: "ہمارے مذہب کے اندر اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں کہ لوہے کی (کسی تیز دھار شے) کے ہوتے ہوئے کسی اور تیز دھار والی چیز سے جو لوہے کی نہ ہو ذبح کرنا مکروہ ہے۔ اس لئے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اللہ نے ہم پر فرض کر دیا ہے کہ ہم ہر چیز کے ساتھ احسان کریں، چنانچہ اگر قتل کریں تو قتل کرنے میں عمدگی سے کام لیں اور اگر ذبح کرنے میں حسن وخوبی سے کام لیں۔ تم میں کا جو شخص ذبح کرے اُسے چاہیئے کہ اپنی چھری کو تیز کرلے اور ذبیحے کو آرام پہنچائے[1]۔

۴۔ ذبح کرنے والے کی اہلیت

اس شرط پر علماء کا اتفاق ہے کہ ذبح کرنے والا یا تو مسلمان ہونا چاہیئے یا اہل کتاب لیکن اس مسئلے میں اُن کی

---

[1] یہ حدیث مسلم شریف میں روایت کی گئی ہے۔ دیکھیے بدایۃ المجتہد ۱/۳۳۴

آراء مختلف ہیں کہ آیا بچے، مجنون، نشے میں مدہوش، تارک الصلوٰۃ، غاصب الذبیحہ (ذبح کرنے والے کا خود غصب کیا ہوا جانور) اور مرتد کا ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے یا نہیں؟

چنانچہ ایسا بچہ، جو صاحب تمیز نہ ہو، مجنون اور نشے میں مدہوش شخص کے بارے میں شافعیہ کے ہاں دو قول ہیں جن میں زیادہ نمایاں قول یہ ہے کہ اُن کا ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے۔ لیکن دوسرے قول کی رُو سے حلال نہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ نابینا کا ذبیحہ مکروہ ہے کیونکہ وہ ذبح کرنے میں غلطی کرے گا[1]۔

حنابلہ کے نزدیک بھی مذکورہ بالا اشخاص کا ذبیحہ حلال نہیں[2]۔

حنفیہ کے نزدیک بچے اور مجنون کا ذبیحہ حلال ہے جب کہ وہ ذبیحے پر اللہ کا نام لیتے اور صحیح طریقے سے ذبح کرنے پر قادر ہوں[3]۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ صاحب عقل بچے کا ذبیحہ حلال ہے لیکن مجنون اور نشے میں مدہوش شخص کا نہیں اس لئے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔

اس مسئلے میں اختلاف کا سبب نیت کی شرط ہے۔ چنانچہ جن علماء نے ذبیحے کے لئے نیت کی شرط کو ضروری قرار دیا ہے وہ ان لوگوں کے ذبیحے کو جائز نہیں سمجھتے اور جو فقہاء نیت کی شرط کو لازمی نہیں ٹھہراتے۔ وہ ان کی ذکاۃ کو جائز سمجھتے ہیں۔

لیکن جہاں تک سارق الذبیحہ (جس نے جو جانور چرایا ہے وہی اس کا ذبح کرنے والا ہو) اور تارک الصلوٰۃ کا تعلق ہے تو جمہور علماء نے ان دونوں کے ذبیحہ کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن امام داؤد اور اسحاق بن راہویہ کے نزدیک ان کا ذبیحہ مردار ہے۔ جس کا کھانا حلال نہیں۔

---

[1] کفایۃ الاخیار ۲/ ۲۲۷، منہاج الطالبین ۴/ ۲۴۰

[2] العدۃ ۳/ ۴۵۷

[3] فتح القدیر ۹/ ۴۸۷

مُرتد کے بارے میں جمہور علماء کی رائے ہے کہ اُس کا ذبیحہ حلال نہیں، خواہ اُس نے اسلام کو چھوڑ کر نصرانیت اختیار کی ہو یا یہودیت۔ لیکن امام ثوری کے نزدیک اُس کا ذبیحہ مکروہ ہے اور امام اسحاق کے نزدیک جائز۔

مرتد کے بارے میں اس اختلاف کی وجہ یہ سوال ہے کہ آیا اُس پر لفظ "اہل کتاب" کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں[1]۔

۵۔ کیفیت ذبح :

اس مسئلے میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ ذبح کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جانور کو گردن کے سامنے سے ذبح کیا جائے اور وہ نلیاں اور رگیں کاٹی جائیں جن کا ذکر اس سے پہلے کیا گیا۔ لیکن اگر جانور کو گردن کی پشت سے ذبح کیا گیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

شافعیہ کی رائے : امام نووی فرماتے ہیں کہ جانور کو گردن کی پشت سے ذبح کرنا گناہ ہے لیکن ذبیحہ حلال ہوگا[2]۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ اگر بھول کر ایسا کیا گیا تو اس کا کھانا جائز ہوگا بشرطیکہ حلقوم اور مری کٹ چکی ہوں لیکن اگر جان بوجھ کر جانور کو گردن کے پیچھے سے ذبح کیا گیا تو اس کے بارے میں دو قول ہیں اور مشہور قول یہ ہے کہ اس کا کھانا جائز ہوگا۔ جیسا کہ شافعیہ کا مذہب ہے[3]۔

مالکیہ کی رائے ہے کہ اگر جانور کو گردن کی پشت سے ذبح کیا گیا تو اس کا کھانا حلال نہ ہوگا، خواہ قطع کا عمل پورا ہو جائے اور خون بہہ جائے، اس لئے کہ اس صورت میں حلقوم اور شہ رگوں کے کٹنے سے پہلے گردن سے متصل حرام مغز (نخاع) اور سلسلہ۔ الظہر (یعنی ریڑھ کی ہڈی) کٹ جاتا ہے۔ مالکیہ کے نزدیک حرام مغز کا شمار جسم کے ان نازک حصوں میں ہوتا ہے جن پر چوٹ لگنے سے جاندار کی موت واقع ہو جاتی ہے[4]۔

---

[1] بدایۃ المجتہد ۱/۴۳۶-۴۳۸ اور قوانین الاحکام الشرعیہ ۱۹۰

[2] قلیوبی، عمیرہ ۴/۲۴۲

[3] المقنع ۳/۵۲۸

[4] تفسیر قرطبی ۶/۵۲، الشرح الصغیر ۲/۱۰۸

کیا ذبح کرنے میں جلدی کرنا ذبیحے کے حلال ہونے کی شرط ہے ؟

شافعیہ کی رائے ہے کہ اگر حلقوم اور مری کا کچھ حصہ کاٹنے کے بعد ہاتھ اُٹھا لیا اور ذبیحہ کی موت کے بعد باقی حصہ کاٹا تو وہ حلال نہ ہوگا، خواہ ایسا کسی عذر کی وجہ سے کیا گیا ہو، جیسے چھری تیز کرنے کے لئے یا دوسری چھری لینے کے واسطے یا ہاتھ کانپنے کی وجہ سے۔

یہ حکم اُس صورت میں ہے جب کہ باقی حصہ فی الفور نہ کاٹا گیا ہو، اگر باقی حصہ بھی فی الفور کاٹ دیا گیا تو ذبیحہ حلال ہوگا جیسے کسی نے ہاتھ روک کر چھری بدلی اور فوراً ہی باقی حصہ کاٹ دیا تو ایسا کرنا جائز ہے[1]۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر ذبح کا عمل شروع کرنے کے بعد ہاتھ اُٹھا لیا اور دیر تک یونہی چھوڑے رکھا تو وہ ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا، خواہ ایسا اپنے اختیار سے کیا ہو یا مجبوری سے۔ لیکن اگر ہاتھ اُٹھانے کے بعد جلدی ذبح کا عمل پھر شروع کر دیا تو ایسا ذبیحہ حلال ہے خواہ ہاتھ مجبوراً اُٹھایا ہو یا اپنے اختیار سے۔ یہ حکم اُس صورت میں ہے جب کہ جسم کی اہم نلیوں اور رگوں کا کچھ حصہ کٹ گیا ہو جیسے مثلاً شہ رگوں کا کچھ حصہ کاٹ کر ہاتھ اُٹھا لیا اور پھر فوراً ہی دوبارہ کاٹنا شروع کر دیا اور باقی کام مکمل کیا (تو اس میں کوئی حرج نہیں) لیکن اگر ذبح کا عمل شروع کیا اور قبل اس کے کہ حلقوم، مری یا شہ رگوں کا کوئی حصہ کٹتا جس سے جانور کی موت واقع ہو جاتی ہے، ہاتھ اُٹھا لیا ایسی حالت میں کہ اگر اس وقت جانور کو چھوڑ دیا جاتا تو وہ زندہ رہ سکتا تھا، اور پھر جلدی یا کچھ دیر کے بعد ذبح کیا تو اس کا کھانا مطلق جائز ہے اس لئے کہ مذکورہ صورت میں ذبح کا عمل دوبارہ شروع کرنا ایک مستقل ذبح کا حکم رکھتا ہے۔ مالکیہ کے نزدیک "جلدی" اور "دیر" کا فیصلہ عرف کے مطابق کیا جاتا ہے ویسے "جلدی" یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص ہاتھ روک کر اپنی چھری تیز کرے یا ایک چھری رکھ کر دوسری چھری لے لے تو اسے "دیر" کرنا نہیں کہا جاتا[2]۔

---

[1] اعانۃ الطالبین ۲/۳۴۸

[2] حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۲/۹۹

(د) چوتھی شرط — ذبیحے پر اللہ کا نام لینا :

تمام فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا ایک مشروع عمل ہے۔ لیکن اس بارے میں اُن کی آراء مختلف ہیں کہ آیا ایسا کرنا واجب یعنی ذبیحہ کے حلال ہونے کی شرط ہے یا صرف استحباب کا درجہ رکھتا ہے (جو ذبیحہ کے حلال ہونے کی شرط نہ ہو) ؟ ۔

اس مسئلے میں علماء کے پانچ اقوال ہیں :

۱ ۔ پہلا قول جمہور علماء کا ہے جن میں امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام ثوریؒ، امام حسن بن صالحؒ رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں ۔ اس قول کی رُو سے ذبیحے پر اللہ تعالیٰ کا نام لینا اس کے حلال ہونے کی شرط ہے ۔ اس قول کی بنیاد مندرجہ ذیل دلائل پر ہے :

(الف) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ (الانعام: ۱۲۱)

(اور اُس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا اور یہ کھانا گناہ ہے)

اس آیت کریمہ سے مستفاد ہوتا ہے کہ :

اوّل —— اگر کسی فعل کی ممانعت مطلق طور پر وارد ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ فعل حرام ہے ۔

دوم —— اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ایسا ذبیحہ کھانے کو جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو فسق (معصیت گناہ) کہا ہے ۔ اور فسق ایسے فعل کے ارتکاب پر ہوتا ہے جو حرام ہو ۔ اس ممانعت کو فقط مُردار اور اہلِ شرک کے ذبیحوں کی ممانعت پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ بعض اہلِ تاویل نے آیت کے سببِ نزول کے بیان میں کہا ہے کیونکہ مفسرین کے نزدیک یہ ایک قاعدہ ہے کہ حکم لفظ کے عموم کے مطابق ہوتا ہے نہ کہ سبب کے خصوص کے مطابق ۔ علاوہ ازیں اگر اس آیت میں وارد ممانعت کو مُردار اور مشرکوں کے ذبائح کی ممانعت پر محمول کیا گیا تو اس سے تکرار لازم آئے گی ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ : "حرمت علیکم المیتۃ"

(حرام ہوا تم پر مردہ جانور) اور یہ کہ "وما ذبح علی النصب" (اور حرام ہے جو ذبح ہوا کسی تھان پر) علاوہ ازیں "وما اُھل لغیر اللہ بہ" (اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا) اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ: "فاذکروا اسم اللہ علیہا صواف" (سو پڑھو اُن پر اللہ کا نام قطار باندھ کر) اور جب کسی کام کا حکم دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس کا کرنا واجب ہے[1]

چنانچہ اگر کسی نے ذبح کرتے وقت جان بوجھ کر بسم اللہ نہ کہا تو وہ ذبیحہ مُردار کی طرح حرام ہوگا لیکن اگر سہواً چھوٹ گیا تو اس کا کھانا حلال ہے[2]۔

امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ (الانعام: ۱۱۸)

(سو تم کھاؤ اس جانور میں سے جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا)

آگے چل کر حکم ہے:

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ (الانعام: ۱۲۱)

(اور اُس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا)

ان دونوں مقامات پر اللہ تعالیٰ نے دونوں حالتیں بیان کر دیں اور دونوں حکموں کی وضاحت فرمادی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "لا تاکلوا" ممانعت ہے جو تحریم کی علت ہے جسے کراہت پر محمول کرنا جائز نہیں کیونکہ نہی (ممانعت) اپنے بعض مقتضیات کے اعتبار سے حرام محض کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح یہ سمجھنا بھی درست نہیں ہے کہ یہاں تحریم اور کراہت دونوں مراد ہیں۔ یہ بڑا عمدہ اُصول ہے۔

---

[1] دیکھیے بدائع الصنائع ۲۷۷۸/۶

[2] دیکھیے المقنع ۵۴۰/۳ - ۵۴۱

لیکن جہاں تک اُس شخص کا تعلق ہے جو بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بھولنے والا کسی خطاب کا مخاطب نہیں ہوتا اور اُس سے خطاب کرنا محال ہے لہذا یہ شرط اُس کے لئے واجب نہیں۔

جو شخص جان بوجھ کر بسم اللہ نہ کہے وہ تین حال سے خالی نہیں :

اوّل ——— یہ کہ وہ جانور کو زمین پر گرانے وقت تسمیہ چھوڑ دے اور کہے کہ میرے قلب میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ اور اُس کی توحید موجود ہے لہذا میرے لئے زبان سے اللہ کا ذکر کرنا ضروری نہیں تو یہ چیز اُس کے لئے کافی ہے کیونکہ اس صورت میں اُس نے اللہ جل جلالہ کو یاد کر لیا اور اُس کی عظمت بیان کی۔

دوم ——— دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ کہے یہ موقع صریح طور پر بسم اللہ کہنے کا نہیں۔ یا یہ کہ یہ امر عبادت نہیں تو یہ چیز بھی اُس کے لئے کافی ہے۔

سوم ——— تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ کہے " میں اللہ کا نام نہیں لیتا اور یہ کہ بسم اللہ کہنے کی کیا قدر و قیمت ہے۔ تو جو شخص ایسا کہے اس کا طرز عمل حقارت آمیز ہے اور وہ فاسق ہے، اُس کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔[1]

(ب) وجوب تسمیہ کے قائل علماء حضرت عدی بن حاتم سے مروی اُس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں حضرت عدی فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں (شکار پر) اپنا کتا چھوڑتا ہوں اور اُس پر اللہ کا نام لیتا ہوں (تو کیا اُس کا مارا ہوا شکار کھانا ہمارے لئے جائز ہے ؟) آپ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے فرمایا: اگر تو نے اپنا کتا چھوڑا اور اللہ کا نام لے لیا اور کتے نے شکار پکڑا اور اُسے مار ڈالا تو تُو اسے کھا لیکن اگر کتے نے اُس میں سے کچھ کھا لیا تو تو اُس شکار کو نہ کھا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کتے نے شکار اپنے لئے پکڑا تھا۔ میں (عدی) نے عرض کی : میں (شکار پر) اپنا کتا چھوڑتا ہوں (لیکن شکار کے پاس پہنچ کر) دیکھتا ہوں کہ اُس کے ساتھ ایک کتا اور بھی ہے

---

[1] قرطبی ۷/۷۶

اور مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ شکار اُن میں سے کس نے پکڑا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا (ایسی صورت میں وہ شکار) نہ کھا۔ کیونکہ تو نے اللہ کا نام اپنے کتے پر لیا تھا نہ کہ دوسرے کتے پر۔[1]

اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی منقول ہے کہ جس جانور کا خون بہہ گیا ہو اور اس پر اللہ کا نام لے لیا گیا ہو تو اُسے کھاؤ۔[2] اس سلسلے میں اور بھی متعدد احادیث کتب حدیث میں موجود ہیں۔

چنانچہ جمہور فقہا کی رائے کے مطابق ذبح کرنے وقت لسان سے بسم اللہ کہنا ضروری ہے کیونکہ اللہ کا نام لینا ذبیحے کے حلال ہونے کی ایک شرط ہے۔ اور جو شخص گونگا ہو اُسے چاہیئے کہ اپنی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرے۔

۲۔ دوسرا قول:

دوسرا قول حضرت امام شافعی اور اُن کے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے جس کی رُو سے ذبح کرتے وقت بسم اللہ کہنا مستحب ہے نہ کہ واجب۔ (یعنی ذبیحے کے حلال ہونے کی شرط نہیں)۔ چنانچہ اگر ذبح کرنے والے نے جان بوجھ کر یا بھول چوک سے بسم اللہ نہ کہا تو اس میں کوئی حرج نہیں اس کا ذبیحہ کھایا جائے گا۔ امام احمد اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ سے بھی یہی مروی ہے۔[3]

ان ائمہ کی رائے مندرجہ ذیل دلائل پر مبنی ہے:

(الف) ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ
يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا
اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ (الانعام: ۱۴۵)

---

[1] متفق علیہ، دیکھیے صحیح مسلم بشرح امام نووی ۷۸/۱۳

[2] متفق علیہ، دیکھیے صحیح مسلم بشرح النووی ۱۲۲/۱۳

[3] اس روایت کو الخطابی نے معالم السنن میں ذکر کیا ہے۔ ۲۸۳/۴

(تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اُس وحی میں کہ مجھ کو پہنچی ہے کسی چیز کو حرام کھانے والے
پر جو اُس کو کھاوے مگر یہ کہ وہ چیز مُردار ہو یا بہتا ہوا خون یا گوشت سُور کا)

اس راستے کے حامل علماء کہتے ہیں کہ آیتِ مذکورہ بالا کی رُو سے صرف یہ تین چیزیں حرام ہیں یعنی مُردار، بہتا ہوا خون اور سور کا گوشت اور الساذبحہ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس فہرست میں شامل نہیں۔

کہا گیا ہے کہ اس امر کا احتمال ہے کہ متروک التسمیہ (یعنی الساذبحہ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو) کو بعد میں (یعنی نزول آیتِ بالا کے بعد) حرام قرار دیا گیا ہو؟ اس کا جواب شافعیہ نے یہ دیا ہے کہ سورۃ الانعام پوری ایک ہی دفعہ میں نازل ہوئی۔ اگر متروک التسمیہ حرام ہوتا تو اسے بھی مندرجہ بالا تینوں استثنائی چیزوں کے ساتھ بیان کیا جاتا۔

احناف نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ چونکہ سورۃ انعام کا ایک دفعہ میں نازل ہونا جس روایت سے معلوم ہوا ہے وہ خبر واحد ہے لہٰذا اُسے حجت نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جس جانور کو ذبح کرتے وقت جان بوجھ کر بسم اللہ نہ کہا گیا ہو وہ فی نفسہ مردار ہے اور آیت بالا میں وارد لفظ میتۃ کے حکم میں داخل ہے[1]۔

(ب) فقہائے شافعیہ ارشادِ باری تعالیٰ:

وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ (المائدۃ: ۵)

(اور اہل کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے)

سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اہل کتاب کے بارے میں یہ بات معروف ہے کہ وہ جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتے۔

(ج) شافعیہ کی ایک دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بعض لوگوں نے حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: یا رسول اللہ کچھ لوگ جو ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں اور پہلے مشرک تھے، ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں جس کے متعلق ہم نہیں جانتے کہ انہوں نے اُس پر اللہ کا نام

---

[1] بدائع الصنائع ۶/۲۸۷۸

لیا ہے یا نہیں ؟ یہ سن کر حضورؐ نے ارشاد فرمایا "تم اس پر اللہ کا نام لے لو اور کھاؤ"[1]

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں: "الخطابی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ بسم اللہ کہنا ذبیحے کے حلال ہونے کی شرط نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو حضورؐ اس ذبیحے کو جس کے بارے میں شک تھا کہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں مباح نہ فرماتے۔ جیسا کہ خود ذبیحہ کے بارے میں یہ شک پیدا ہو جاتے کہ آیا جانور شرعی طریقے سے ذبح ہوا ہے یا نہیں (تو اسے نہیں کھایا جاتا)۔

حدیث کے سیاق سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کیونکہ جواب میں آپؐ نے فرمایا: تم اس پر اللہ کا نام لے لو اور کھاؤ۔ گویا آپؐ نے سوال کرنے والوں سے فرمایا: تم اس کی پروا نہ کرو (کہ گوشت لانے والوں نے ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا تھا یا نہیں) بلکہ تم سے متعلق یہ چیز ہے کہ تم خود (اس گوشت پر) اللہ کا نام لے لو اور کھاؤ۔ حضورؐ کا یہ فرمانا تعلیم وارشاد کا نہایت عمدہ طریقہ ہے جیسا کہ امام الطیبی نے اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جو چیز بسم اللہ کہنے کے شرط نہ ہونے پر دلالت کر رہی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ (المائدۃ ۵:۵)

(اہلِ کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے)

اس آیت میں اہلِ کتاب کے ذبیحوں کو اس شک کے باوجود کہ ان پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں مباح قرار دیا گیا ہے۔

المہلب نے کہا ہے کہ حدیث بالا اس مسئلے میں اصل ہے کہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا فرض نہیں۔ سائلین کے تسمیہ کو ذبح کے وقت بسم اللہ کہنے کا قائم مقام قرار دینا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ سنت ہے کیونکہ سنت فرض کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں حضرت عدی بن حاتمؓ اور ابو ثعلبہ کی حدیث میں وارد حکم کو شرک سے تنزیہ پر محمول کیا جائے گا اس لئے کہ چونکہ یہ لوگ اپنے مذہب جاہلیہ کے مطابق شکار کیا کرتے تھے لہٰذا حضور نبی کریم صلی اللہ

---

[1] اس حدیث کو امام بخاریؒ، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ نے روایت ہے۔ دیکھیے نیل الاوطار ۷/۱۴۳ اور سبل السلام ۴/۸۲

علیہ وسلم نے انہیں شکار اور ذبح کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا اور بتایا کہ اس میں کون سی چیزیں فرض ہیں اور کون سی مندوب تاکہ ان کے لئے اس مسئلے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے اور وہ شکار اور ذبیحے کے سلسلے میں تمام اُمور کامل ترین طریقے سے انجام دیں۔ لیکن مذکورہ بالا حدیث (حضرت عائشہؓ سے مروی) میں لوگوں نے جن ذبائح کے متعلق حضورؐ سے سوال کیا اُن کے کرنے والے دوسرے لوگ تھے چنانچہ یہاں حضورؐ نے اُن کی اصل یعنی حلال ہونا بتائی۔

ابن التین کہتے ہیں ممکن ہے یہاں تسمیہ سے مراد کھانے کے وقت بسم اللہ پڑھنا ہو، جبکہ امام نووی نے پورے یقین کے ساتھ یہی رائے اختیار کی ہے۔[1]

لیکن جمہور فقہاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی اس حدیثِ بالا کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ مرسل ہے لہٰذا اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ نیز یہ کہ یہاں پر شارع نے ظن (غالب) پر حکم صادر فرمایا کہ اس ذبح کرنے والے نے بسم اللہ پڑھ لی ہو گی کیونکہ وہ بہرحال مسلمان تھا جبکہ سائل کو شبہ اس کے جدید الاسلام ہونے کی وجہ سے ہوا تھا جسے آپؐ نے کالعدم قرار دیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ بسم اللہ کہنا ضروری ہے ورنہ حضورؐ واضح طور پر ارشاد فرما دیتے کہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ لازمی نہیں کیونکہ یہ وقت ایسا تھا کہ اس میں وضاحت کرنا ضروری تھا۔

جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے "رُفِعَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ" (کہ میری اُمت سے بھول چوک کی ذمہ داری اٹھالی گئی ہے) تو اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہاں لفظ "اثم" محو یا محذوف ہے لہٰذا اس سے کوئی دلیل نہیں نکلتی۔ رہے اہل کتاب تو وہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیتے ہیں۔[2]

امام نووی کہتے ہیں کہ ہمارے اصحاب کی رائے کے مطابق ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لینا مکروہ ہے۔ اگرچہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ اسے مکروہ نہیں بلکہ خلافِ اولیٰ سمجھتے ہیں لیکن صحیح بات یہی ہے کہ وہ اسے

---

[1] نیل الاوطار ۱۵۸/۸

[2] سبل السلام ۸۲/۴

کروہ سمجھتے ہیں[1]۔

(د) شافعیہ ارشاد باری تعالیٰ:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ (المائدہ ۵ : ۳)

(حرام ہوا تم پر مُردہ جانور اور لہو اور گوشت سُور کا اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا اور جو مر گیا ہو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر یا سینگ مارنے سے اور جس کو کھایا ہو درندہ نے مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا)

سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس آیت کی رُو سے اُس جانور کو جائز قرار دیا گیا ہے جسے ذبح کر دیا گیا ہو لیکن یہاں (ذبح کرتے وقت) بسم اللہ کہنے کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جانور کا تذکیہ (ذبح کرنا) اللہ کا نام لئے بغیر نہیں ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ لغت کی رُو سے ذکاۃ (ذبح کرنا) کے معنی ہیں شق کرنا اور کھولنا اور ذبح کرنے سے یہ دونوں مقصد حاصل ہو جاتے ہیں[2] (لہٰذا بسم اللہ کہنا ضروری نہیں)۔

شافعیہ آیت کریمہ:

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ (الانعام : ۱۲۱)

---

[1] امام نووی کی شرح مسلم ۱۳۲/۸

[2] المجموع ۳۱۲/۸

(اور اُس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا اور یہ کھانا گناہ ہے)

کے بارے میں مخالفین کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو جانور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اُسے مت کھاؤ۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

اَوۡ فِسۡقًا اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ (الانعام: ۱۴۵)

(یا ناجائز ذبیحہ جس پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس امر میں علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے جانور کا گوشت کھائے جسے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو تو وہ فاسق (گنہگار) نہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس آیت کے وہی معنی لیں جو اس سے پہلے بیان ہوئے ہیں[1]

امام ابن کثیر فرماتے ہیں:

"یہی وہ مسلک ہے جس پر امام شافعی چلتے ہیں اور یہی قوی بھی ہے۔ بعض متأخرین نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس قول کو اس طرح قوی بنائیں کہ " وانہ لفسق" کے واؤ کو حالیہ قرار دیں یعنی خدا کا نام نہ لئے ہوئے ذبیحے کو نہ کھاؤ درآنحالیکہ ایسا کرنا فسق ہے اور فسق وہی ہے جو غیر اللہ کے نام پر ذبح ہو۔ پھر یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ متعین ہے اور یہ جائز نہیں کہ واؤ عاطفہ ہو کیونکہ ایسی صورت میں جملہ اسمیہ خبریہ کا عطف جملہ فعلیہ طلبیہ پر آئے گا جو غلط بات ہے کیونکہ یہ دلیل اس کے بعد کے جملے

وَاِنَّ الشَّيٰطِيۡنَ لَيُوۡحُوۡنَ اِلٰۤى اَوۡلِيٰٓـئِهِمۡ (الانعام: ۱۲۱)

(اور یقیناً شیطان اپنے دوستوں کو تعلیم کر رہے ہیں)

ہی سے ٹوٹ جاتی ہے کیونکہ یہاں تو یقیناً عطف ہے تو جس طرح اگلی واؤ کو حالیہ کہا گیا ہے اگر اُسے حالیہ مان لیا جائے تو پھر اس پر اس جملے کا عطف ناجائز ہوگا اور اگر اسے پہلے کے جملے فعلیہ طلبیہ پر عطف کیا جائے تو جو اعتراض یہ دوسرے پر وارد کرتے ہے

---

[1] سبل السلام ۴/۸۲، شرح مسلم للنووی ۱۳/۷۲، المجموع ۸/۴۱۲

ہیں وہی ان پر عائد ہوگا۔ ہاں اگر اس واؤ کو حالیہ نہ مانا جاتے تو یہ اعتراض مٹ سکتا ہے لیکن جوبات اور دعویٰ تھا وہ سرے سے باطل ہو جائے گا۔ واللہ اعلم[1]

حضرت سعید بن جبیرؓ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول: "وَلَا تَاْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ" سے مراد میتہ یعنی مردار ہے[2]

تمیسرا قول:

امام داؤد الظاہری اور ابوثور کہتے ہیں کہ جس ذبیحے پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اس کا کھانا حلال نہیں، خواہ عمداً ایسا کیا گیا ہو یا سہواً ہو گیا ہو۔ یہ رائے حضرت عبداللہ بن عمرؓ، نافع، عامر الشعبی، اور محمد بن سیرین سے مروی ہے۔ حضرت امام مالکؒ اور امام احمدؒ سے مروی ایک روایت میں بھی یہی رائے ظاہر کی گئی ہے[3]

جمہور فقہاء ان تمام دلائل کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ "مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے خواہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو لیکن جان بوجھ کر نہ چھوڑا گیا ہو۔"

اور جہاں تک آیت کا تعلق ہے، تو اس کا اطلاق دو وجہ سے متروک التسمیہ پر نہیں ہوتا یعنی:

۱۔ ایک تو اس لئے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے (وانہ لفسق) یعنی ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لینا گناہ ہے لیکن سہواً تسمیہ کا چھوٹ جانا گناہ نہیں، اس لئے کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے جس میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلافِ رائے ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اس آیت میں ممانعت وہ ذبیحہ کھانے کی ہے جس پر بالارادہ اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

---

[1] دیکھیے ابن کثیر ۲/۱۶۹

[2] تفسیر ابن کثیر ۲/۱۶۹

[3] تفسیر ابن کثیر ۲/۱۶۹ اور معالم السنن ۴/۲۸۳

۲۔ دوسرے یہ کہ جو شخص ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا بھول گیا ہو، حقیقت یہ ہے کہ اس نے ترکِ تسمیہ کیا ہی نہیں کیونکہ اللہ کی یاد اس کے دل میں موجود ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ عزاسمہ ہے

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (الکھف: ۲۸)

(اور نہ کہنا مان اس کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے)

روایت ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) سے کسی نے پوچھا کہ اگر کوئی شخص جانور ذبح کرنے وقت اللہ کا نام لینا بھول جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: اللہ بزرگ و برتر کا نام ہر مسلمان کے دل میں موجود ہے لہذا اس ذبیحے کو کھاؤ۔

بھول چوک تکلیف شرعی کے لئے عذرِ مانع ہے اور مؤاخذہ اس چیز پر ہوتا ہے جس کا وجود مطلوب ہو اور جس چیز کے وجود کا غالب امکان نہ ہو اس کے بارے میں بھول چوک کا عذر تسلیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو لوگ حرج میں پڑ جائیں حالانکہ حرج اور مشقت کو اس امت سے اٹھا لیا گیا ہے۔

اصول مشقت اور حرج کا خاتمہ ہے یا یہ کہ اگر کوئی شخص کسی فعل کی بجا آوری کا عادی نہ ہو اور وہ سہواً اس سے چھوٹ جائے تو اسے معذور سمجھا جائے گا کیونکہ انسان کے لئے یہ بات بہت مشکل ہے کہ وہ اپنے نفس کو ایسے امور سے بچائے جن کا وہ عادی ہو چکا ہے۔

لیکن جن مواقع کا انسان عادی ہو چکا ہو، اگر ان مواقع پر بھول جائے تو اس پر گرفت کی جائے گی۔ مثال کے طور پر جیسے کوئی روزہ دار بھول چوک کر روزے کی حالت میں کوئی چیز کھالے یا پانی وغیرہ پی لے تو اس پر گرفت نہیں کی جائے گی خواہ اس نے کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہو اور پانی سیر ہو کر پیا ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص نماز پڑھتے ہوئے

کچھ کھائے یا پیئے تو اُسے معذور تصور نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ روزہ کے برخلاف انسان نماز روزانہ پڑھنے کا عادی ہے لہذا یہ ایک عجیب اور غیر معمولی بات ہوگی کہ وہ نماز کی حالت میں بھول کر کھائے یا پیئے۔ چنانچہ نماز کی حالت میں کھانے پینے پر انسان سے مؤاخذہ کیا جائے گا لیکن روزہ کی حالت میں بھول چوک کر کھا پی لینے سے کوئی گرفت نہیں کی جائے گی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص نماز شروع کرتے وقت تکبیر تحریمہ کہنا بھول جائے تو اُسے معذور تصور نہیں کیا جائے گا کیونکہ نماز کا تو وہ آغاز ہی تکبیر تحریمہ سے کرتا ہے۔ اسی طرح اُس شخص کو بھی معذور نہیں سمجھا جائے گا جو نماز سے پہلے وضو کرنا بھول جائے کیونکہ ہر روز نماز سے پہلے وضو کرنا انسان کی عادت بن جاتی ہے۔

مندرجہ بالا اُصول کے مطابق چونکہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ کہنا انسان کی عادت نہیں ہوتی اس لئے اگر وہ اُس وقت اللہ کا نام لینا بھول جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں[1]۔

چوتھا قول:

چوتھے قول کے مطابق اگر جان بوجھ کر بسم اللہ نہ کہا گیا تو ذبیحے کا کھانا مکروہ ہوگا۔ یہ رائے فقہائے مالکیہ میں سے شیخ ابوبکر اور قاضی ابوالحسین کی ہے۔

پانچواں قول،

یہ قول علامہ اشہب کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ذبح کے وقت بسم اللہ کہنا عمداً چھوڑ دیا گیا ہو تو اس صورت میں بھی ذبیحہ حلال ہوگا لیکن اگر استخفاف کی غرض سے ایسا کیا تو ذبیحہ حلال نہ ہوگا۔ امام طبری نے بھی ایسی ہی رائے ظاہر کی ہے[2]۔

یہ ہیں وہ اقوال جو تسمیہ (ذبیحے پر بسم اللہ کہنے) کے بارے میں علمائے کرام سے منقول ہیں۔

---

[1] بدائع الصنائع ۶/ ۲۷۸۰ - ۲۷۸۱

[2] تفسیر قرطبی ۷/ ۷۰

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ مسئلہ تعبدی ہے یا عقلی؟

ائمہ ثلاثہ یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نزدیک ذکاۃ (ذبح کرنا) کا مسئلہ تعبدی ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔

لیکن حضرت امام شافعیؒ کی رائے میں یہ مسئلہ معقولۃ المعنیٰ (یعنی جس کی عقلی توجیہ کی جا سکے) ہے[1]

اب سوال یہ ہے کہ ترجیح کس رائے کو حاصل ہے؟ آیا اُس رائے کو جس کی رُو سے بسم اللہ کہنا واجب ہے یا اُس رائے کو جس کے مطابق تسمیہ صرف مستحب ہے؟

سطور بالا میں جو دلائل پیش کئے گئے اُن سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا واجب ہے۔ چنانچہ اگر کوئی مسلمان اپنے لئے یا کسی اور کے لئے جانور ذبح کرے تو وہ اُس امر کا مکلف ہے کہ اُس پر اللہ کا نام لے۔ اگر اس نے بالارادہ، جان بوجھ کر حقارت اور استخفاف کی غرض سے تسمیہ ترک کر دیا تو اُس کا ذبیحہ اُس کے لئے حرام ہو جائے گا۔

کیوں؟

اول تو اس لئے کہ نص قرآنی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے اور ذبح اور صید کے بارے میں وارد احادیث صحیحہ سے بھی یہی حکم ثابت ہوتا ہے۔

دوسرے عقلی نقطۂ نظر سے یہ امر ہر مسلمان کے لئے واجب ہے کہ وہ اللہ کی اس نعمت پر اُس کا نام لے۔ اُس اللہ سبحانہ وتقدس کا شکر ادا کرے جس نے اس حیوان کو اس کے لئے مسخر کیا، اُسے اس پر غلبہ اور قدرت عطا کی۔ چنانچہ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذبیحے پر اللہ کا نام لے کر اس نعمت کا کھانا اپنے لئے مباح کرے۔

دوسرے الفاظ میں کیا یہ بات معقول نہیں کہ جو مسلمان ان سب باتوں کے باوجود بالارادہ، جان بوجھ کر اور استخفاف و حقارت کی نیت سے ذبیحے پر اللہ کا نام لینا تک گوارا نہ کرے اور اس طرح اپنی ذمہ داری سے پہلوتہی کرتے ہوئے

---

[1] احکام القرآن تالیف ابن عربی ۲/۷۴۲

بُرا طرزِ عمل اختیار کرے اُس کی سزا یہ نہ ہو کہ اُس کا ذبیحہ اُس کے لئے حرام ہو جائے۔

لیکن اگر کوئی شخص غلطی سے یا بھول چوک کر اللہ کا نام نہ لے یا اُسے بسم اللہ نہ کہنے پر مجبور کر دیا جائے یا وہ کسی ایسے جانور کا گوشت اللہ کا نام لے کر کھائے جسے کسی دوسرے آدمی نے بسم اللہ پڑھے بغیر ذبح کیا تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ حدیث شریف میں کہا گیا ہے کہ: "تم اس پر اللہ کا نام لے لو اور کھاؤ"۔

المختصر قولِ مختار امام قرطبی کا یہ قول ہے کہ اگر تسمیہ حقارت و استخفاف کی غرض سے ترک کیا گیا تو ذبیحہ حرام ہوگا۔ امام اشہبؒ اور طبریؒ سے بھی یہی رائے منقول ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب کہ متروک التسمیہ ذبیحہ اُس شخص کے لئے حرام ہے جس نے جان بوجھ کر استخفاف کی غرض سے اُس پر اللہ کا نام نہ لیا ہو تو کیا ایسا ذبیحہ ذابح کے سوا کسی اور کے لئے بھی حرام ہے؟

اس سلسلے میں نصوصِ شرعیہ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسا ذبیحہ ذبح کرنے والے کے لئے تو حرام ہے لیکن کسی اور کے لئے نہیں (واللہ اعلم) دو وجوہ کی بناء پر۔

اول تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (سورۃ فاطر: ۱۸)

(اور نہ اٹھائے گا کوئی اُٹھانے والا بوجھ دوسرے کا)

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق متروک التسمیہ ذبیحہ ذبح کرنے والے کے غلط طرزِ عمل کی پاداش میں اُس کے لئے تو حرام ہے لیکن دوسرے لوگوں کے لئے نہیں اس کے علاوہ حدیثِ مذکورہ بالا سَمُّوْا اَنْتُمْ وَكُلُوْا (تم اُس پر اللہ کا نام لے لو اور کھاؤ) سے بھی یہی حکم نکلتا ہے۔

دوسرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اپنے اموال کی حفاظت کریں اور انہیں ضائع ہونے سے بچائیں۔ چنانچہ اگر ہم نے کسی ایک شخص کی غلطی اور برائی کی وجہ سے اُس ذبیحے کو پھینک دیا اور اس کے گوشت سے استفادہ نہ کیا تو ہمارا ایسا کرنا حفاظتِ اموال سے متعلق اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگا۔

یہاں ہمارے سامنے ایک اور اہم مسئلہ آتا ہے اور وہ یہ کہ بازاروں میں جو گوشت ہمیں ملتا ہے آیا اُس کے

متعلق ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ قصائیوں نے اُس پر اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ عموماً قصائی ـــ خصوصاً ہمارے زمانے میں جب کہ لوگوں کے دینی احساسات بہت کمزور پڑ گئے ہیں ـــ ایسی باتوں کی زیادہ فکر نہیں کرتے اور اس سلسلے میں کسی خاص اہتمام سے کام نہیں لیتے۔ اگر اُن میں کچھ ایسے اللہ کے نیک بندے موجود ہوں بھی جو ذبیحے پر اللہ کا نام لیتے ہوں تو اُن کا اوسط یقیناً ایک فی صد سے زیادہ نہیں نکلے گا۔

اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ قصائی جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ نہیں پڑھتے تو ہمیں کیا کرنا چاہیئے، آیا اُن کا ذبیحہ کھایا جائے یا نہ کھایا جائے؟

اس سلسلے میں احکام شرع کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ چیز ایسی ہے جس سے شریعت نے ہمیں معاف کر دیا ہے۔ کیونکہ ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم دیکھیں آیا قصائی ذبیحوں پر اللہ کا نام لیتے ہیں یا نہیں اور اگر لیتے ہیں تو سب پر لیتے ہیں یا کچھ پر لیتے ہیں اور کچھ کو چھوڑ دیتے ہیں؟ شریعت نے یہ رعایت ہمیں اس لئے دی ہے کہ ایسا کرنا ہمارے لئے بہت مشکل ہے اور اس میں بڑی مشقت اور تنگی ہے جب کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے اُمت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تنگی اور مشقت کو دور فرما دیا ہے۔

یہی وہ رائے ہے جو علامہ ابن التین اور ابن عبدالبر نے بڑے وثوق سے ظاہر کی ہے۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں: "مسلمان کا ذبیحہ کھایا جائے گا" یہ سمجھتے ہوئے کہ اُس نے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے لیا ہے۔ کیونکہ کسی مسلمان کے متعلق ـــ کسی بھی معاملے میں ـــ بُرا گمان نہیں کیا جا سکتا اِلّا یہ کہ امر واقعہ اس کے خلاف ظاہر ہو۔[1]

یہ تو تھا مسلمانوں کے ذبیحے کا مسئلہ، جہاں تک اہلِ کتاب اور غیر کتابی لوگوں کے ذبائح کا تعلق ہے تو اُن کا بیان ان شاء اللہ آئندہ ایک علیحدہ باب میں کیا جائے گا۔

علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اگر ذبح کرنے والے نے "بسم اللہ" کہہ لیا تو اتنا کہنا اُس کے لئے کافی ہے۔

---

[1] نیل الاوطار ۸/۱۵۸

لیکن اگر اس کے بجائے اس نے کوئی دعائیہ جملہ زبان سے ادا کیا جیسے "اللھم اغفرلی" کہا تو اس سے تسمیہ کی شرط پوری نہ ہو گی۔ بخلاف اس کے اگر کہا "الحمدللہ" یا "سبحان اللہ" تو ذبیحہ حلال ہوگا کیونکہ اس صورت میں اس نے اللہ کو یاد کرلیا۔

علماء کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف رائے ہے کہ "بسم اللہ" سے مناسبت رکھنے والے الفاظ اور کون سے ہیں۔ چنانچہ حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک الفاظ "اللہ اکبر" ایسے ہیں جو بسم اللہ سے مناسبت رکھتے ہیں یعنی کہنا چاہیئے "بسم اللہ واللہ اکبر" ان علماء کے بقول یہ الفاظ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) بھی جانور ذبح کرتے وقت یہی الفاظ ادا فرمایا کرتے تھے۔

لیکن شافعیہ کے نزدیک پہلے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کہنا اور پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا زیادہ افضل ہے۔

کتاب اعانۃ الطالبین میں لکھا ہے کہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) نہیں کہنا چاہیئے کیونکہ ذبح کے وقت "الرحمٰن الرحیم" کہنا مناسب نہیں اس لئے کہ ذبح کرنے سے جانور کو تکلیف پہنچتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جانور کا ہمارے لئے حلال ہونا انتہائی رحمت کا باعث ہے۔ اور جانور کے لئے ذبح کی مشروعیت اس کے واسطے موجبِ رحمت ہے۔ اس طرح ذبح میں کھانے والوں کے لئے بھی رحمت ہے اور حیوان کے لئے بھی کیونکہ ذبح کرنے کے عمل سے اس کی روح سہولت اور آسانی سے خارج ہو جاتی ہے۔

مالکیہ کہتے ہیں: الفاظ "بسم اللہ" پر "الرحمٰن الرحیم" کا اضافہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ جانور کو ذبح کرنا اس کے جسم کو کاٹنا اور تکلیف دینا ہے جب کہ رحمٰن اور رحیم ایسے نام ہیں جن میں نرمی، مہربانی اور رحمت پائی جاتی ہے اور نرمی کے ساتھ کسی کو ذبح نہیں کیا جا سکتا اور رحمت کے ساتھ کسی کو تکلیف نہیں دی جا سکتی۔[1]

جہاں تک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کا تعلق ہے تو شافعیہ کے نزدیک تیا سا ہر موقع پر ایسا کرنا چاہیئے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جہاں اپنا نام ذکر فرماتے ہیں وہاں اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسم مبارک

---

[1] اعانۃ الطالبین ۲/۳۴۶

بھی ضرور ساتھ لاتے ہیں۔[1]

لیکن جمہور کے نزدیک بوقتِ ذبح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا شروع نہیں ایک تو اس لئے کہ خود آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے، "دو مواقع ایسے ہیں جہاں میرا ذکر نہ ہونا چاہئیے یعنی بوقت ذبح اور جب کسی کو چھینک آئے"۔[2]

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام (بھی) لیا گیا تو شبہ ہوگا کہ جانور اللہ کے سوا کسی اور کے لئے ذبح کیا گیا ہے۔[3]

اسی طرح جمہور کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ اگر ذبح کرنے والے نے اللہ کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام ملایا جیسے کسی نبی یا ولی کا نام شامل کیا تو اس کا ذبیحہ حلال نہ ہوگا کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کا وجود پایا جائے گا۔ چنانچہ اگر اس نے کہا کہ "اللہ کے نام پر اور فلاں کے نام پر" تو اس کا ذبیحہ مُردار ہوگا۔

لیکن اگر اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اللہ کے نام ساتھ ملائے بغیر لیا جیسے کہا "بسم اللہ محمد رسول اللہ (اللہ کے نام سے، محمد اللہ کے رسول ہیں) تو اس میں حرج نہیں لیکن اس کا ذبیحہ کراہت کے ساتھ حلال ہوگا کیونکہ اس میں بھی اس امر کا شبہ پایا جاتا ہے کہ اس نے اللہ کے نام کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام شامل کیا۔[4]

جو فقہاء اس رائے کے قائل ہیں کہ جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا واجب ہے ان کے نزدیک ضروری ہے کہ بسم اللہ بالکل ذبح کرتے ہوئے کہا جائے یا ذبح کے قریب کہا جائے۔ چنانچہ اگر ایک بکری پر

---

[1] کفایۃ الاخیار ۲/۲۴۰

[2] اس حدیث کو ابو محمد الخلال نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے۔

[3] المغنی ۸/۵۴۱

[4] فتح القدیر تالیف ابن ھمام ۶/۴۹۲ - اعانۃ الطالبین ۲/۳۴۶

اللہ کا نام لیا لیکن دوسری بکری پکڑ کر ذبح کی تو یہ تسمیہ کافی نہ ہوگا کیونکہ پہلی بکری پر بسم اللہ کہتے وقت دوسری بکری کی نیت نہ تھی۔ اسی طرح اگر بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ دیکھ کر بسم اللہ کہی اور پھر اُس میں سے ایک بکری پکڑ کر ذبح کی تو اُس تسمیہ سے یہ بکری حلال نہ ہوگی۔ لیکن اگر بسم اللہ کہنے اور ذبح کرنے کے درمیان تھوڑا وقفہ ہو جیسے کوئی شخص ایک چھری رکھ دوسری پکڑے یا سلام کا جواب دے یا کسی سے کوئی بات کرے یا پانی طلب کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ایسا ذبیحہ حلال ہوگا۔[1]

---

[1] المغنی ۸/۵۶۶ ۔ حاشیہ ابن عابدین ۶/۳۰۲

تیسری فصل

ذبح

یہ فصل پانچ بحثوں پر مشتمل ہے ،

۱- پہلی بحث : ذبح کئے جانے والے جانور

۲- دوسری بحث : اقسامِ ذبح

۳- تیسری بحث : کیا ماں کو ذبح کرنے سے پیٹ کا بچہ بھی حلال ہو جاتا ہے ۔

۴- چوتھی بحث : ذبح کرنے کے آداب

۵- پانچویں بحث : وہ جانور جنہیں ذبح نہیں کیا جاتا ۔

پہلی بحث

ذبح کئے جانے والے جانور

خشکی کے وہ تمام حیوانات جن کا کھانا جائز ہے ، اور مختلف اقسام کے پرندے ، خواہ وہ بری ہوں یا بحری حلال کئے جائیں گے جب کہ انہیں حلال کرنا انسان کے مقدور اور اختیار میں ہو ۔ اور اُن کا کھانا جائز نہ ہوگا الّا یہ کہ انہیں اُن شرائط کے مطابق حلال کیا گیا ہو جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا گیا . خواہ وہ جانور انسی یعنی انسان سے مانوس ہوں یا وحشی (غیر مانوس) لیکن انسان کے قبضے اور اختیار میں ہوں ۔

اس مسئلے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے، کوئی اختلافی قول منقول نہیں، لیکن جہاں تک شکار کا تعلق ہے تو اس خاص ہے جو ان شاء اللہ متعلقہ باب میں الگ بیان کیا جائے گا۔

دوسری بحث

اقسامِ ذبح

ذکاۃ کی تین قسمیں ہیں یعنی ذبح کرنا، نحر کرنا اور عقر کرنا۔

ان میں سے دو صورتیں یعنی ذبح کرنا اور نحر کرنا اختیاری ہیں جب کہ تیسری صورت یعنی عقر کرنا اضطراری ہے۔

وہ حیوانات جنہیں ذبح کیا جاتا ہے اُن میں چھوٹی گردن والے تمام جانور جیسے بکری، گائے اور مختلف اقسام کے پرندے شامل ہیں۔

لیکن نحر کئے جانے والے جانوروں میں اونٹ پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ اُسے نحر کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ جو علماء زرافہ کا کھانا حلال سمجھتے ہیں وہ اُسے بھی نحر کرنے کے قائل ہیں۔

نحر کرنا یہ ہے کہ جانور کو کھڑے ہونے کی حالت میں گردن کے نیچے لبہ[1] میں نیزہ یا حربہ (چھوٹا نیزہ) یا کوئی اور ایسا آلہ گھونپا جائے جس کی دھار تیز ہو، اور جانور زمین پر گر پڑے۔ یہ صورت قرآنِ مجید میں وارد ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۱۰۸ : ۲)

(سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور نحر کر)

---

[1] جانور کی ہنسلی کی ہڈی کے اوپر اور گردن کے نیچے کا گڑھا۔

اور قرآن مجید ہی میں ارشاد ہے کہ :

فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا (الحج : ۳۶)

(پھر جب گر پڑے اُن کی کروٹ)

یعنی جانور جو کھڑا تھا نحر ہونے کے بعد زمین پر گر پڑے ۔

نحر کرنے کا یہ طریقہ باتفاقِ فقہاء اونٹ کے لئے ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔

لیکن جہاں تک گھوڑے کا تعلق ہے حدیث میں اُس کے نحر کئے جانے کا ذکر آیا ہے باوجودیکہ اُس کی گردن چھوٹی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتی ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑا نحر فرمایا جسے ہم نے کھایا۔[1]

حدیث میں گائے کو نحر کرنے کا بھی ذکر آیا ہے جب کہ قرآنِ مجید میں اُس کے ذبح کئے جانے کا بیان ہے۔

علماء کے درمیان اس امر کے بارے میں اختلاف ہے کہ جن جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے انہیں نحر کرنا یا جن جانوروں کو نحر کیا جاتا ہے انہیں ذبح کرنا صحیح ہے یا نہیں۔ جمہور کی رائے میں ایسا کرنا جائز ہے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت امام مالکؒ بھی یہی رائے رکھتے ہیں، لیکن ایک دوسری روایت کی رُو سے انہوں نے اس سے منع کیا ہے۔ امام ابن القاسم بھی ایسا کرنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔

احناف کے نزدیک ایسے ہر جانور کو نحر کیا جائے گا جس کی گردن لمبی ہو۔ خواہ وہ کوئی حیوان ہو یا پرندہ جیسے بطخ اور شتر مرغ۔[2]

عقر (یعنی زخمی) کرنا

حلال کرنے کے جو طریقے اوپر بیان ہوئے، وہ اُن جانوروں سے تعلق رکھتے ہیں جو انسان کی قدرت و

---

[1] متفق علیہ۔ دیکھیے نیل الاوطار ۸/۲۶۲

[2] حاشیہ ابن عابدین ۶/۳۰۳

اختیار میں ہوں اور جنہیں ذبح یا نحر کرنا اُس کے لئے ممکن ہو۔ ایسے جانور صرف اُس صورت میں حلال ہوں گے جب کہ انہیں مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی ایک کے مطابق حلال کیا گیا ہو۔

لیکن انسی (یعنی انسان سے مانوس ایسے) جانور جو اُس کے قبضہ و اختیار میں نہ ہوں اور جنہیں ذبح یا نحر کرنا اُس کے لئے ممکن نہ ہو اور جن کے متعلق خطرہ ہو کہ ہاتھ سے جاتے رہیں گے، جیسے کوئی اونٹ یا بکری یا گائے ہاتھ سے چھوٹ کر بھاگ گئی ہو اور اُس کے ضائع ہو جانے یا ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہو اور اس کے سوا چارہ نہ ہو کہ اُسے کسی طرح بھاگ جانے سے روکا جائے تو ایسی حالت میں اُس کا حلال کرنا یہ ہے کہ اُسے کوئی ہتھیار پھینک کر مارا جائے، پس اگر وہ ہتھیار جانور کے جسم پر کسی جگہ لگ گیا اور اُس میں گھس گیا اور اُس سے خون بہہ نکلا اور قبل اس کے کہ جانور تک پہنچا جاتا وہ مر گیا تو ایسی صورت میں وہ پاک ہے۔ جس کا کھانا حلال ہے۔ حلال کرنے کی یہ صورت ذبح کے بجائے ہے جسے صرف اُس صورت میں اختیار کیا جائے گا جب کہ ذبح کرنا انسان کے لئے ممکن نہ ہو۔ اسی طرح عقر کرنے والے میں اُن تمام شرائط کا پایا جانا ضروری ہے جو ذبح کرنے والے کے لئے لازمی ہیں۔ نیز عقر کرتے وقت بسم اللہ کہنا بھی ضروری ہے اور یہ امر بھی ضروری ہے کہ آلۂ عقر ایسا ہو جو حیوان کے جسم میں سوراخ کر دے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ایک صحیح حدیث میں کہا گیا ہے کہ: "حضورؐ کی خدمت میں غنیمت کا کچھ مال آیا جس میں سے ایک اونٹ بھاگ نکلا، اس وقت مسلمانوں کے پاس کوئی گھوڑا نہیں تھا، چنانچہ ایک شخص نے بھاگتے ہوئے اونٹ کو ایک تیر مارا اور اسے روک لیا (یعنی وہ مر گیا) اس پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایسے (بھاگ جانے والے) جانوروں سے نمٹنے کا وہی طریقہ ہے جو وحشی جانوروں سے نمٹنے کا ہے، چنانچہ ان میں سے جو (جانور) ایسا کرے جیسا اس (اونٹ) نے کیا اُس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو جیسا اس کے ساتھ کیا گیا۔[1]

اسی طرح جو اونٹ کسی کنویں میں گر گیا ہو اور وہاں سے اُسے نکالنا ممکن نہ ہو یا بکری جو کسی بلند مقام سے

---

[1] متفق علیہ۔ أوابد (بدکے ہوئے وحشی جانور)، مسلم شرح النووی ۱۳/۱۲۵

ایسی جگہ گر گئی ہو جہاں اُس وقت تک پہنچنا اور زندہ پکڑ لینا ممکن نہ ہو تو انہیں کسی ایسے آلے سے مارنا جو اُن کے جسم میں سوراخ کر دے انہیں حلال کرنا (ذکاۃ) ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: "اہل علم میں امام شافعیؒ کا قول زیادہ نمایاں ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایسا جانور (جو مندرجہ بالا صورت میں عقر کیا گیا ہو) کھایا جائے گا جیسے حدیث رافع بن خدیج کے مطابق وحشی جانور کھایا جاتا ہے یہ قول حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کا ہے۔ اور قیاس بھی یہ کہتا ہے کہ جب وحشی جانور انسان کی قدرت و اختیار میں آجاتا ہے تو وہ اُس طریقے کے مطابق ذبح یا نحر کئے بغیر حلال نہیں ہوتا جس طریقے سے انسی (گھریلو) جانور کو حلال کیا جاتا ہے، اس لئے کہ اب وہ انسان کی قدرت و اختیار میں آچکا ہے، اس اُصول کے مطابق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اگر کوئی جانور وحشی بن جائے یا وحشی جانور کے معنی میں آجائے یعنی اُس کا ذبح یا نحر کرنا ممکن نہ رہے تو اُسے اُس طریقے کے مطابق حلال کر لیا جائے جس طریقے سے وحشی جانور کو حلال کیا جاتا ہے[1]"

یہ قول جمہور کا ہے جن میں حضرت امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ اور احمدؒ شامل ہیں۔

لیکن امام مالکؒ، اللیثؒ، سعیدؒ بن المسیب اور ربیعہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) اس رائے کے مخالف ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ایسا جانور حلال نہ ہوگا اِلّا یہ کہ اُسے ذبح کیا جائے یا نحر[2]

مذکورہ بالا حدیث کا جواب دیتے ہوئے یہ مؤخر الذکر علماء کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جانور پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تسلط حاصل کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ اُسے بھاگنے سے روک لیا گیا نہ کہ اُس کا تذکیہ کر لیا گیا۔ یہی حدیث کا مقتضیٰ ہے۔ اور یہی بات حدیث کے الفاظ "فحبسه" (روک لیا) سے ظاہر ہوتی ہے۔ حدیث میں یہ نہیں کہا گیا کہ تیر سے وہ قتل ہو گیا۔ اور پھر اونٹ ایک ایسا جانور ہے جو اکثر حالات میں انسان کی قدرت و اختیار میں رہتا ہے لہٰذا اُس کے سلسلے میں غیر معمولی حالات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ جب کہ شکار کے معاملے میں ایسا کیا جاتا ہے

---

[1] تفسیر قرطبی ۶/۵۵

[2] نیل الاوطار ۸/۱۶۳ - قرطبی ۶/۵۵

گا۔ حدیث میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ تیر سے وہ اونٹ رُک گیا، جب وہ رُک گیا تو انسان کے تصرف و اختیار میں آگیا، لہٰذا اب اُسے ذبح یا نحر کیے بغیر نہیں کھایا جائے گا۔

لیکن شکار کے معاملے میں یہ علماء اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر تیر شکار کے جا لگے اور وہ مر جائے تو اُس کا کھانا حلال ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ شکار میں اور بھاگے ہوئے جانور میں کیا فرق ہے (کہ اُسے تو تیر مار کر کھانا حلال ہو اور اِسے نہ ہو) ۔ اِلّا یہ کہ کہا جائے شکار وحشی ہوتا ہے اور بھاگا ہوا جانور گھریلو جسے بغیر تذکیہ کئے کھانا جائز نہیں[1]۔ بہرحال صحیح یہ ہے کہ جمہور کی قطعی دلیل کے پیش نظر انہی کا قول راجح ہے۔

تیسری بحث

کیا مادہ جانور کے ذبح سے اس کے پیٹ میں موجود بچہ ذبح ہو جاتا ہے؟

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ "جہاں تک پیٹ کے بچے کا تعلق ہے اُس کی ماں کی ذکات اُس کی ذکات ہے[2]"۔

علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

"خواہ اس کی سند میں ضعف ہو لیکن یہ حدیث اپنی کثرتِ طرق کے پیشِ نظر کم از کم حسن لغیرہ ضرور ہے۔ اور امام احمدؒ نے اسے ایک ایسے طریق سے روایت کیا ہے جس میں کوئی راوی ضعیف نہیں[3]۔"

جو بچہ ماں کے پیٹ میں ہو وہ چار احوال سے خالی نہیں:

---

[1] قرطبی ۶/۵۶

[2] اس حدیث کو امام احمدؒ، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے: دیکھئے نیل الاوطار ۸/۱۶۳

[3] نیل الاوطار ۸/۱۶۳

(الف) یہ کہ وہ اپنی ماں کے ذبح ہونے سے قبل اُس کے پیٹ سے مردہ خارج ہو، ایسی صورت میں وہ مُردار ہے جس کا کھانا باتفاق حرام ہے۔

(ب) یہ کہ وہ اپنی ماں کے ذبح ہونے کے بعد اُس کے پیٹ سے زندہ خارج ہو، ایسی صورت میں باتفاق اُس کا کھانا حلال نہیں الّا یہ کہ اُسے ذبح کر لیا جائے۔

(ج) یہ کہ بچہ ماں کے ذبح ہو جانے کے بعد زندہ ملے۔ ایسی صورت میں اگر اُسے ذبح کر لیا گیا تو وہ حلال ہے، لیکن اگر مر گیا تو وہ باتفاق مُردار ہے۔

(د) یہ کہ ماں کو ذبح کر لیا جائے اور بچہ اُس کے پیٹ ہی میں مر جائے۔ یہی وہ صورت ہے جس کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف رائے ہے۔

۱۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ، احمد، صاحبین (یعنی حضرت امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ) ثوری، حسن بن زیاد اور جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ اُس کا کھانا بغیر کسی قید اور شرط کے جائز ہے۔

اُن کی دلیل وہ حدیث ہے جو اوپر نقل کی گئی۔

۲۔ امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر بچے کے بال نکل آئے ہوں اور اُس کی ساخت مکمل ہو گئی ہو تو اُسے کھایا جائے گا ورنہ نہیں۔ یہ قول حضرت ابن عمرؓ، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، زہری، شعبی، نافع، عکرمہ، مجاہد، عطا اور یحییٰ بن سعید کا ہے۔

ان علماء نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی اُن بعض روایات سے احتجاج کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ: جب پیٹ کے بچے کے بال نکل آئیں تو اس کی ماں کی ذکات اس (بچے) کی ذکات ہے۔ لیکن احمد بن عصام نے اس حدیث کو منفرد بتایا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف علیہ ہے۔ ابن ابی لیلیٰ سے ایک کمزور طریق سے مرفوعاً مروی بعض روایات میں آیا ہے کہ پیٹ کے بچے کی ذکات اُس کی ماں کی ذکات ہے، خواہ بال اُگ آئے ہوں یا نہ اُگے ہوں لیکن اس میں ضعف ہے۔

۳۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ (ایسے بچے کو) نہیں کھایا جائے گا، اور یہ کہ وہ مُردار ہے اہل بیت کا مسلک بھی یہی ہے اور اپنی کتاب المحلی میں امام ابن حزم بھی اسی رائے کی طرف مائل ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں جمہور کے دلائل کو کمزور کہا ہے[1]۔

احناف اور مذکورہ بالا دیگر فقہاء نے مندرجہ ذیل دلائل سے احتجاج کیا ہے:

(الف) قولِ باری تعالیٰ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (حرام ہوا تمہارے لئے مُردار) کے عموم سے جس میں عام کو خاص پر ترجیح دی گئی ہے۔

(ب) قیاس یہ کہتا ہے کہ اگر وہ زندہ خارج ہوتا اور پھر مر جاتا (تو حرام ہوتا)۔

(ج) وہ حدیث جس سے جمہور علماء نے احتجاج کیا ہے اُس سے (درحقیقت) حنفیہ کی دلیل نکلتی ہے اور وہ اس طرح کہ اگر اس حدیث کو پیش کے ساتھ اس طرح پڑھا جائے کہ:

ذَكَاتُهُ ذَكَاةُ أُمِّهِ

تو ایسی صورت میں اس میں تشبیہ بلیغ پائی جائے گی اور اس کے معنی ہوں گے:

"ذَكَاةُ الْجَنِينِ كَذَكَاةِ أُمِّهِ" (یعنی جنین کی ذکاۃ اُس کی ماں کی ذکاۃ کی طرح ہے) چنانچہ اگر وہ (جنین) زندہ خارج ہو تو اُس کے حلال ہونے کے لئے یہ شرط ہوگی کہ اُسے ذبح کیا جائے اور اگر وہ مردہ حالت میں خارج ہو تو مُردار ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ (اور جنت کی طرف جس کا عرض ہے آسمان اور زمین) یعنی كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (جیسے پھیلاؤ زمین اور آسمان کا)۔

---

[1] المحلی ۷/۴۲۰ - نیز دیکھیے نیل الاوطار

یا جیسے کوئی کہے "قَوْلِي قَوْلُكَ وَمَذْهَبِي مَذْهَبُكَ" (یعنی میرا قول تیرے قول کی طرح ہے اور میرا مذہب تیرے مذاہب کی طرح ہے) جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

فَعَيْنَاكَ عَيْنَاهَا وَجِيدُكَ جِيدُهَا
سِوَى أَنَّ عَظْمَ السَّاقِ مِنْكَ دَقِيقُ

(تیری آنکھیں اُس کی آنکھوں کی طرح ہیں اور تیری گردن اُس کی گردن جیسی مگر تیری پنڈلی کی ہڈی (زیادہ) پتلی ہے)

یعنی عَيْنَاكَ كَعَيْنَيْهَا وَجِيدُكَ كَجِيدِهَا

اگر اس حدیث کو نصب (یعنی زبر) کے ساتھ یوں پڑھا جائے کہ:

ذَكَاتُهُ ذَكَاةَ أُمِّهِ

تو اس صورت میں بھی یہ تشبیہ ہوگی اور اس کے معنی وہی ہوں جو اوپر بیان ہوئے۔ یا اس میں الفاظ یہ ذکی تذکیۃ مثل تذکیۃ اُمّہ (اُس کا تذکیہ کیا جائے گا اُس کی ماں کے تذکیہ کی طرح) چنانچہ مصدر اور اس کی صفت حذف ہو جائے گی اور مضاف الیہ اُس کے قائم مقام ہو جائے گا اور اس کے سوا چارہ نہ ہوگا کہ جنین کو ذبح کیا جائے جب کہ وہ زندہ خارج ہو۔

بعض لوگوں نے اس حدیث کو زبر کے ساتھ اس طرح روایت کیا ہے:

ذَكَاةُ الْجَنِينِ ذَكَاةَ أُمِّهِ

یعنی ذَكَاةُ الْجَنِينِ ذَكَاةَ أُمِّهِ (یعنی جنین کو اُس کی ماں کی طرح ذبح کرو۔

(د) ذکاۃ کی وہ قسمیں جنہیں شارع حکیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے تسلیم کیا ہے صرف

دو ہیں یعنی: (۱) زیر قابو جانور کی ذکاۃ جو حلق اور لبہ ہیں کی جائے گی اور دوسری اُس جانور کی ذکاۃ جو قابو سے باہر ہو (جسے ذبح نہ کیا جا سکتا ہو) اُسے جسم کے کسی حصے پر ہتھیار (یا درندہ جانور) کے ذریعے زخم پہنچایا جائے گا۔ اور جنین کی یہ زیر بحث ذکاۃ ان دونوں قسموں میں سے کسی کے تحت نہیں آتی۔ لہذا اسے میتہ (مردار) میں شمار کیا جائے گا۔

(۵) جمہور علماء نے جن احادیث کا سہارا لیا ہے اُن سب کی اسناد کمزور ہیں لہذا انہیں آیت کریمہ کے مقابلے پر نہیں رکھا جا سکتا اور نہ کسی کمزور سند والی خبر واحد کے ذریعے کسی آیت کی تخصیص کی جا سکتی ہے۔

(۶) جمہور کے اس قول کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی تردید ہوتی ہے کہ "حلال ہو گئے ہمارے لئے دو مُردہ جانور اور دو خون (یعنی مچھلی اور ٹڈی)"۔ اس حدیث میں مچھلی اور ٹڈی کے سوا کسی اور مُردار کا ذکر نہیں اور نہ اُس جنین ہی کا ذکر ہے جو ماں کے پیٹ میں ہو۔

کہنے والا یہ بھی کہتا ہے کہ جنین کو جنین صرف اُس صورت میں کہا جاتا ہے جب کہ وہ ماں کے پیٹ میں ہو لیکن جب وہ ماں کے پیٹ سے خارج ہو جائے تو اس وقت اُسے جنین نہیں کہا جاتا۔ اور حضور نبی کریم الصلوۃ والتسلیم نے اس کی ذکاۃ کا اثبات اُس وقت کیا ہے جب کہ وہ ماں کے پیٹ میں ہو۔

حنفیہ کی اس دلیل کا جواب دو طرح دیا گیا ہے۔

ایک تو اس طرح کہ جنین کو ماں کے پیٹ سے جدا ہونے کے بعد بھی جنین کہنا جائز ہے اس لئے کہ وہ ماں کے پیٹ سے حال ہی میں باہر آیا ہے۔ چنانچہ اگر وہ زندہ خارج ہو اور اُسے حلال کر لیا جائے تو اس صورت میں بھی اسے جنین کہا جائے گا۔ حمل بن مالک

سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی دو باندیوں کے درمیان میں تھا کہ اُن میں سے ایک نے دوسری کو خیمے کی لکڑی سے مارا جس سے اُس کا جنین مُردہ (حالت میں) ساقط ہوگیا۔ اس پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ دیا تھا کہ ایک غلام یا لونڈی آزاد کی جائے۔ اس حدیث میں بچے کو اُس کے ساقط ہو جانے کے بعد بھی "جنین" کہا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر "ذکاۃ الجنین" سے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مُراد "ماں کے پیٹ میں موجود بچے کی ذکاۃ" ہو تو اس صورت میں اُس کی ماں کی ذکاۃ اُس کی ذکاۃ ہوگی خواہ وہ زندہ خارج ہو کر مر جائے حالانکہ اس امر میں تمام فقہاء کا اجماع ہے کہ اگر بچہ زندہ خارج ہو اور پھر مر جائے تو وہ مُردار ہے جس کا کھانا حلال نہیں۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حضرت ابو سعیدؓ سے مروی ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس جنین کے بارے میں پوچھا گیا جو ماں کے پیٹ سے مُردہ خارج ہو تو آپؐ نے فرمایا: "اگر چاہو تو تم اُسے کھالو کیونکہ اس کی ماں کی ذکاۃ اُس کی ذکاۃ ہے"۔ تو اس کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ اس حدیث کو ثقہ راویوں کی ایک جماعت نے یحییٰ بن سعید سے روایت کیا ہے لیکن اس میں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ مُردہ حالت میں خارج ہوا۔ اسی طرح اس حدیث کو ایک جماعت نے مجالد سے روایت کیا ہے جن میں ہشیم، ابو اُسامہ اور عیسیٰ بن یونس شامل ہیں لیکن انہوں نے بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ مُردہ خارج ہوا بلکہ انہوں نے یہ کہا کہ "حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس جنین کے بارے میں پوچھا گیا جو اونٹنی، یا گائے یا بھیڑ کے پیٹ میں ہو تو آپؐ نے فرمایا: اُسے کھاؤ کیونکہ اُس کی ماں کی ذکاۃ اُس کی ذکاۃ ہے"۔ ان میں سے

کسی ایک نے بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ مُردہ خارج ہوا۔ یہ الفاظ صرف ساجی کی روایت میں آئے ہیں۔ غالباً ساجی نے ان الفاظ کا اضافہ اپنی طرف سے کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اُن سے غلطی ہو سکتی ہے[1]

جمہور نے احناف کی دلیلوں کا مندرجہ ذیل جواب دیا ہے۔

(الف) آیت کریمہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (حرام ہوا تم پر مُردہ جانور) کے حکم کا اطلاق جنین پر نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے دی گئی خبر کہ اس کی ذکاۃ اُس کی ماں کی ذکاۃ میں داخل ہے یا یہ کہ وہ اپنی ماں کا ایک جزو ہے جیساکہ متعدد صریح روایات سے مستفاد ہوتا ہے کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ (جس کا تم نے تذکیہ کرلیا) کے دائرے میں آتا ہے۔

(ب) فقہائے احناف جس قیاس کو دلیل بناتے ہیں وہ درست نہیں ہے کیونکہ اس کے برخلاف نص موجود ہے مزید برآں یہ کہ اس قیاس کے برخلاف قیاس جلی بھی موجود ہے جو یہ ہے کہ (جنین) جب تک ماں کے پیٹ میں رہتا ہے وہ اُس کے (یعنی ماں کے) اجزاء میں سے ایک جزو ہوتا ہے لہذا اُس کی (یعنی ماں کی) ذکاۃ اُس کے تمام اجزاء کی ذکاۃ ہے۔ نیز یہ کہ جانوروں کی ذکاۃ بقدر امکان مشروع ہے اور جب ہمارے اس مسئلے میں ذکاۃ کی صورت صرف یہ ہے کہ ماں کی ذکاۃ ہی کو بچے کی ذکاۃ قرار دیا جائے جیساکہ شکار میں کہ اُس میں سوائے زخم پہنچانے کے اور کسی صورت میں ذکاۃ ممکن نہیں۔

(ج) تیسری دلیل کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث ذَكَاةُ الْجَنِيْنِ ذَكَاةُ أُمِّهِ

---

[1] دیکھئے احکام القرآن تالیف جصاص ۱/ ۱۳۷ - ۱۴۱

کی صحیح روایت پیش ہی کے ساتھ ہے منذری نے کہا ہے کہ ، بعض لوگوں نے اسے اپنی غرض کے لئے نصب (یعنی زبر) کے ساتھ روایت کیا ہے اور وہ غرض جنین کا ازسرِ نو تذکیہ کرنا ہے جب کہ وہ زندہ خارج ہو ۔ حالانکہ یہ حدیث لازمی طور پر پیش ہی کے ساتھ منقول ہوتی ہے ۔

بعض روایات کے سیاق سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے اُس سے مخالفین کی تاویل رد ہو جاتی ہے جیسے حضرت ابوسعیدؓ خدری سے مروی روایت میں آیا ہے کہ ہم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ جب ہم کوئی گائے یا اونٹنی یا بکری نحر کرتے ہیں تو اُس کے پیٹ میں سے جنین ملتا ہے تو کیا ہم اُسے کھالیں یا پھینک دیں؟ آپؐ نے فرمایا : اگر تم چاہو تو کھالو کیونکہ اُس کی ماں کی ذکاۃ اس کی ذکاۃ ہے[1]

امام خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ : "یہ روایت اُن کی تاویل کو باطل اور اُن کی دلیل کو رد کر دیتی ہے ۔ اس کی اسناد میں ایک راوی مجالد بن سعید ہیں جنہوں نے ابی الوداک سے روایت کیا ہے ۔ مجالد اگرچہ ضعیف ہیں لیکن اسی مضمون کی جو حدیث احمد نے روایت کی ہے وہ قوی ہے اور اسی طرح وہ حدیث جو امام حاکم نے عطیہ اور عطیہ نے حضرت ابوسعیدؓ خدری سے روایت کی ہے ۔ عطیہ میں اگرچہ کمزوری ہے مگر وہ متابعت (حدیث کے بیان کرنے میں) میں معتبر ہیں ۔ اور جہاں تک ابوالوداک کا تعلق ہے تو کسی نے اُن کے ضعف کی تصریح نہیں کی اور امام مسلم نے اُن سے روایات قبول کی ہیں ۔ یحییٰ بن معین نے انہیں ثقہ کہا ہے اور امام ذہبی نے ثقہ بتایا ہے اور اسی وجہ سے ابن حبانؒ اور ابن دقیق العید نے انہیں صحیح بتایا ہے[2]

---

[1] اس روایت کو ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا اور ترمذی نے اسے حسن بتایا۔ دیکھیے نیل الاوطار ۱۶۴/۸۔ اور ابن ماجہ ۱۰۶۷/۲ ۔

[2] دیکھیے الروض النضیر شرح مجموع الفقہ الکبیر ۱۷۴/۳ - ۱۷۵ - اس مسئلے میں مزید دیکھیے نیل الاوطار ۱۶۴/۸ نیز بدایۃ المجتہد ۴۲۸/۱ ۔

چوتھی بحث

ذبح کرنے کے آداب

مسلمان قارئین سے یہ حقیقت مخفی نہ رہنی چاہیئے کہ اسلام دین رحمت، دینِ کمال اور اپنے ماننے والوں میں اعلیٰ صلاحتیں اور خوبیاں پیدا کرنے والا دین ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے پیرؤں کو حکم دیتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ سلوک کرنے میں زیادہ سے زیادہ رحمت و شفقت سے کام لیں، نہ صرف انسانوں کے ساتھ بلکہ حیوانوں، حتیٰ کہ اُن جانوروں کے ساتھ بھی جنہیں ذبح کرنا مقصود ہو اور جن کی زندگی تھوڑی دیر کے بعد اپنے انجام کو پہنچنے والی ہو۔ چنانچہ شارع علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے حکم دیا ہے کہ جو لوگ جانور ذبح کریں انہیں چاہیئے کہ اُن کے ساتھ رحمت و شفقت کا برتاؤ کریں۔ نہ انہیں سختی اور قساوت کے ساتھ پکڑیں اور گھسیٹیں، نہ ذبح کرنے سے قبل انہیں خوف میں مبتلا کریں۔ ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک ایسے شخص کے پاس ہوا جو اپنی زمین پر پڑی ہوئی بکری کے جسم پر پاؤں رکھے چھری تیز کر رہا تھا اور بکری چھری کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر حضور نبی الرحمتؐ نے اُس سے فرمایا: ”کیا تو اسے دُہری موت مارنا چاہتا ہے۔ تو نے اپنا چاقو اسے لٹانے سے قبل کیوں نہ تیز کر لیا؟“[1]

---

[1] اس سلسلے میں ایک عجیب وغریب حکایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ کسی امیر نے اپنی بھیڑوں کا گلہ ذبح کرنے کا حکم دیا اور ذبح کرنے والے نے انہیں ایک دوسرے کے سامنے ہی ذبح کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ شخص کچھ بھیڑیں ذبح کر چکا تو اُسے کوئی کام پڑ گیا اور وہ اپنی چھری وہیں چھوڑ کر اُس کام کو چلا گیا۔ جب واپس آ کر چاہا کہ باقی جانور ذبح کرے تو دیکھا چھری وہاں سے غائب ہے۔ اس پر وہ لوگ آپس میں جھگڑنے لگے کہ چھری کہاں گئی۔ ذبح کرنے والے نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک شخص پر الزام لگایا کہ چھری تم نے اُٹھائی ہے۔ چنانچہ ایک شخص جو دور سے یہ سب کچھ دیکھ

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

ابن سیرینؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے ساتھ ایک بکری کو گھسیٹے لے جا رہا تھا تاکہ اُسے ذبح کرے۔ یہ دیکھ کر آپؓ نے اُسے دُرہ مارا اور کہا: "تیری ماں مرے، اسے موت کی جانب عمدگی سے ہانک"!

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو دیکھا جو زمین پر پڑی ہوئی ایک بکری کے چہرے پر اپنا پاؤں رکھے بیٹھا تھا اور چھری تیز کر رہا تھا، آپؓ نے اسے دُرہ مارا تو وہ شخص بھاگ گیا اور بکری بھی اپنی جان بچا کر ادھر اُدھر ہو گئی۔[1]

حدیث شریف میں آیا ہے کہ: "زندہ جانور کے جسم سے جو گوشت کاٹا جائے وہ مُردار ہے" یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ دورِ جاہلیت میں لوگ زندہ اونٹ کی کوہان اور دُنبے کی چکتی سے چربی کاٹ لیتے اور اُسے کھاتے۔ جب اسلام آیا تو اُس نے لوگوں کو ایسے ظالمانہ افعال سے روک دیا اور واضح کیا کہ زندہ جانور کے جسم سے کاٹا ہوا گوشت مُردار کے حکم میں ہے تاکہ لوگ بے زبان جانوروں پر ظلم و زیادتی کرنے سے باز رہیں جو اپنی مدافعت اور بچاؤ کرنے سے قاصر ہیں۔

---

[1] بدائع الصنائع ۶/۲۸۱۱

(گزشتہ صفحے کا باقی حاشیہ)

رہا تھا وہاں آیا اور ایک بکری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُس نے بتایا کہ چھری اس بکری نے اپنے منہ میں اُٹھا کر قریب کے کنویں میں پھینک دی ہے۔ یہ سن کر امیر نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ کنویں میں اُترے اور چھری تلاش کرے وہ شخص کنویں میں اُترا تو دیکھا چھری وہاں موجود ہے۔ (اعانۃ الطالبین ۲/۳۴۵)

ہم نے ایسے بہت سے قسی القلب لوگ دیکھے ہیں جن کے دل بے زبان حیوانوں کے لئے جو اپنے اوپر ہونے والے مظالم اور مصائب والام کا اظہار نہیں کر سکتے، شفقت و رحمت کے جذبات سے خالی ہو چکے ہیں یہ لوگ جانوروں کو مارتے پیٹتے اور تشدد کا نشانہ بناتے ہیں اور انہیں خوف میں مبتلا رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دل مُردہ ہو چکے ہیں اور اُن کے ایمان میں ضعف آچکا ہے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"اس پورے باب کا خلاصہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ :
اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے ساتھ احسان کا سلوک کرنا فرض قرار دیا ہے ، پس جب تم (کسی کو) قتل کرو تو خوبی کے ساتھ قتل کرو اور جب ذبح کرو تو عمدگی سے ذبح کرو۔ تمہیں چاہئیے کہ اپنی چھریاں کو تیز کر لو اور ذبیحے کو آرام پہنچاؤ"[1]

امام قرطبی مزید لکھتے ہیں :

" ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ جانوروں کے ساتھ ذبح کرنے میں ، احسان ، خوبی اور عمدگی سے کام لینا یہ ہے کہ اُن کے ساتھ نرمی برتی جائے ۔ انہیں زمین پر گرانے میں سختی اور شدت سے کام نہ لیا جائے اور نہ انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ گھسیٹ کر لے جایا جائے ۔ آلۂ ذبح کو تیز کر لیا جائے (جانور کا گوشت اپنے لئے) جائز کرنے اور حصولِ قربِ باری تعالیٰ عز اسمہٗ کی نیت کی جائے ۔ جانور کا چہرہ قبلے کی طرف کیا جائے ۔ ذبح کرنے میں جلدی کی جائے اور خون کی دونوں رگیں (ودجین) اور گلہ کاٹا جائے تاکہ اُس کی جان آسانی سے نکلے ۔ اس کے بعد اُسے چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے ۔ اللہ تعالیٰ کے احسان کا اعتراف کیا جائے اور اس نعمت کے لئے اُس کا شکر ادا کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس چیز کو ہمارے لئے مسخر کر دیا جسے اگر وہ چاہتا تو دوبارہ ہم پر مسلط کر دیتا ۔ اور اُس چیز کو ہمارے لئے جائز کر دیا جسے اگر وہ چاہتا تو ہم پر حرام ٹھہرا دیتا ۔ اور یہ کہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ ایک جانور کو ذبح کیا جا رہا ہو اور دوسرا اُسے دیکھ رہا ہو"[2]

ذبح کرنے میں مستحب یہ ہے کہ صرف حلقوم ، مری اور خون کی رگیں (ودجین) کاٹنے پر اکتفا کیا جائے

---

[1] صحیح مسلم امام نووی کی شرح کے ساتھ ۱۰۶/۱۳

[2] تفسیر قرطبی ۵۶/۷

اور انسانہ کاٹا جائے کہ چھری نخاع[1] تک پہنچ جائے کیونکہ اس سے جانور کو زیادہ تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا کرے تو جائز ہے۔ اسی طرح جب تک جانور کی روح بالکل نہ نکل جائے نہ اُس کی گردن توڑی جائے نہ ریڑھ کی ہڈی اور نہ اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جائے اور نہ اُس کا کوئی عضو کاٹا جائے۔ ذبح کرنے کے بعد جانور کو پکڑ کر نہ رکھا جائے بلکہ چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ اُس کی روح جسم سے بالکل نکل جائے۔[2]

علامہ ابنِ رُشد لکھتے ہیں:

"جہاں تک اس مسئلے کا تعلق ہے کہ ذبیحے کو قبلہ رُخ کیا جانا چاہیئے یا نہیں تو بعض فقہا اسے مستحب سمجھتے ہیں اور بعض صرف جائز قرار دیتے ہیں۔ بعض نے اسے واجب قرار دیا ہے۔ بعض فقہا اس بات کو مکروہ ٹھہراتے ہیں کہ ذبیحے کو قبلے کی طرف منہ کرکے نہ لٹایا جائے۔ مذہبِ (مالکی) میں ممنوعیت اور کراہت دونوں موجود ہیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ اس مسئلے میں اصل اباحت ہے اِلّا یہ کہ کوئی ایسی دلیل مل جائے جس کی رُو سے اس کا شرط ہونا معلوم ہو جائے۔ شرع میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو اس مسئلے میں اصل کا کام دے اور جس پر اسے قیاس کیا جا سکے۔ اِلّا یہ کہ اس مسئلے میں قیاس مُرسَل کو کام میں لایا جائے جو ایک ایسا قیاس ہے جس کی بنیاد، اُن لوگوں کے نزدیک جو اس کی اجازت دیتے ہیں، کسی مخصوص اصل پر نہیں رکھی جاتی۔ یا یہ کہ ہم اس مسئلے میں قیاسِ شبہ بعید سے کام لیں۔ یعنی یہ کہ قبلہ عظمت والی جہت ہے اور (ذبح کرنا) عبادت ہے لہٰذا واجب ہے کہ ذبیحے کو قبلہ رُخ کرنا شرط قرار دیا جائے۔ لیکن یہ قیاس ضعیف ہے اس لئے کہ نماز کے علاوہ ہر عبادت میں قبلہ رُخ ہونے کو شرط قرار نہیں دیا گیا، اور ذبح کرنے کو نماز پر قیاس کرنا دُور کی بات ہے۔ اسی طرح ذبیحے کو میت کے استقبالِ قبلہ پر قیاس

---

[1] نخاع ایک سپید رگ کو کہتے ہیں جو دماغ سے شروع ہو کر ریڑھ کی ہڈی میں سے ہوتی ہوئی دُم کے آخری سرے تک پہنچتی ہے۔

[2] المجود ۹/۷۹

کرنا بھی صحیح نہیں[۱]۔"

یہ ہے وہ تحقیق جو علامہ ابنِ رُشد نے ذبیحے کے استقبالِ قبلہ کے مسئلے میں کی ہے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی نص صریح پیش نہیں کی۔ چنانچہ اس کے بعد مسئلہ صرف جواز کا رہ جاتا ہے نہ کہ کسی اور حکم کا، یعنی اگر کوئی چاہے تو اپنے ذبیحے کا رُخ قبلے کی طرف کرے اور چاہے تو نہ کرے۔

آگے چل کر علامہ موصوف مزید لکھتے ہیں:

"اور جہاں تک اس مسئلے میں نیت کو شرط قرار دینے کا تعلق ہے تو کہا گیا ہے کہ مذہب (مالکی) میں یہ امر واجب ہے اور مذہب سے باہر مجھے اس وقت کوئی ایسا قول یاد نہیں جو اس کے خلاف ہو۔ شبہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں دو قول ہوں گے: ایک قول واجب ہونے کا اور دوسرا ترکِ وجوب کا۔ چنانچہ جن فقہائے نے (نیت کو) واجب قرار دیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ (ذبح کرنا) عبادت ہے اس لئے کہ (قربانی کے جانوروں) بعض صفات کا ہونا شرط ہے اور ان کی تعداد بھی مقرر ہے، لہٰذا واجب ہے کہ نیت کو شرط قرار دیا جائے۔ اور جن فقہاء نے نیت کو واجب قرار نہیں دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ فعل معقول ہے جس سے روح زائل ہو جاتی ہے اور یہی اس کا مقصود ہے لہٰذا واجب ہے کہ نیت کو شرط قرار نہ دیا جائے، جیسے نجاست کے دھونے سے نجاست کا ازالہ ہو جاتا ہے[۲]۔"

پانچویں بحث

وہ جانور جنہیں ذبح نہیں کیا جاتا

وہ جانور جو ذبح کئے بغیر حلال ہیں مچھلی اور ٹڈی ہیں۔ ٹڈی کے متعلق علامہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے

---

[۱] بدایۃ المجتہد ۱/۳۵۴

[۲] بدایۃ المجتہد ۱/۳۵۴

کہ ذبح کئے بغیر اس کے حلال ہونے پر (فقہاء کا) اجماع ہے۔

ابن العربی کہتے ہیں: اندلس کی ٹڈی نہیں کھائی جائے گی کیونکہ وہ ضرر محض ہے[1]

ذبح کئے بغیر ٹڈی کے جائز ہونے کی سنت سے دلیل حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ:

"دو مُردہ جانور ہمارے لئے حلال قرار دے دیئے گئے ہیں یعنی مچھلی اور ٹڈی"[2]

اسی طرح حضرت ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ: "ہم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزوات میں حصہ لیا اور آپ کے ساتھ ٹڈی کھائی"[3]

جمہور فقہاء کی رائے ہے کہ مُردہ ٹڈیوں کا کھانا جائز ہے، خواہ وہ کسی سبب سے مری ہوں یا بغیر کسی سبب کے۔

لیکن مالکیہ کے نزدیک ٹڈیوں کا تذکیہ (یعنی ذبح) کئے بغیر انہیں کھانا جائز نہیں۔ اور ان کا تذکیہ یہ ہے کہ انہیں زندہ پکڑا جائے اور پھر اُن کا سر کاٹ کر انہیں قتل یا ذبح کیا جائے یا انہیں آگ یا پانی میں ڈال دیا جائے (اور اس طرح انہیں مار دیا جائے) لیکن اگر وہ بغیر کسی سبب کے مر گئیں تو انہیں نہیں کھایا جائے گا[4]

کتاب المغنی میں اسی سلسلے کا ایک مسئلہ یہ لکھا ہے کہ اس امر میں کوئی حرج نہیں کہ زندہ ٹڈیوں کو آگ یا کھولتے ہوئے تیل یا اُبلتے ہوئے پانی میں ڈالا جائے کیونکہ ٹڈیاں اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے نہیں مرتیں۔ اور حدیث میں حیوانات کو آگ میں جلا کر عذاب دینے کی جو ممانعت آئی ہے یہ اُس

---

[1] نیل الاوطار ۸/۱۶۷

[2] یہ حدیث امام احمدؒ، ابن ماجہؒ اور دارقطنیؒ نے روایت کی ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۸/۱۶۷

[3] اس حدیث کو جماعت نے روایت کیا ہے سوائے ابن ماجہؒ کے۔ دیکھیے نیل الاوطار ۸/۱۶۷

[4] نیل الاوطار ۸/۱۶۷۔ بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۹

میں داخل نہیں۔

مسند امام شافعیؒ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت کعبؓ حالتِ احرام میں تھے کہ اُن کے پاس سے ٹڈیوں کا ایک دَل گزرا، وہ یہ بھول گئے (کہ حالتِ احرام میں ہیں) اور ٹڈیوں کو پکڑ کر آگ میں ڈالا اور بھون لیا۔ انہوں نے یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتایا تو آپؓ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔[1]

جہاں تک مچھلی کا تعلق ہے تو اس امر میں فقہاء کے درمیان اجماع ہے کہ سمندر کے جتنے جانور ہیں اگر انہیں وہاں سے زندہ نکال لیا جائے تو ذبح کئے بغیر اُن کا کھانا جائز ہے کیونکہ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ: "اُس (سمندر) کا پانی پاک ہے اور مُردہ حلال"۔ ایک دوسری حدیث میں حضورؐ کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ: "حلال کر دیئے گئے ہمارے لئے دو مُردہ (جانور) مچھلی اور ٹڈی"۔

سمندری جانور

لیکن جہاں تک سمندری حیوانات کا تعلق ہے تو اس مسئلے میں امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ سمندری حیوانات میں سے جو خشکی پر رہتے ہیں ذبح کئے بغیر اُن کا کھانا جائز نہیں، سوائے کیکڑے کے کہ اُسے ذبح نہیں کیا جائے گا کیونکہ اُس میں بہنے والا خون نہیں ہوتا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "اس (سمندر) کا پانی پاک ہے مُردہ حلال" کے عموم کے مطابق انہیں ذبح کئے بغیر کھانا جائز ہے لیکن افضل یہ ہے کہ ذبح کر لیا جائے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ: "سمندر میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے لئے ذبح کر دیا ہے"۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرتِ شریح سے اور انہوں نے ایک ایسے شخص سے جس نے

---

[1] دیکھیے المغنی ۸/۵۷۳

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا روایت بیان کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "سمندر میں جو شے ہے ذبح شدہ ہے"۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "سمندر کی ہر شے اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے لئے ذبح کر دی ہے"[1]

لیکن اس امر پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ جو پرندے خشکی اور تری دونوں جگہ میں رہتے ہیں انہیں ذبح کئے بغیر اُن کا کھانا حلال نہیں[2]۔

---

[1] دیکھیے المغنی ۳۰۶/۸ ۔ العدہ ۴۵۵ ۔ المجموع ۲۶/۹

[2] دیکھیے المغنی ۳۰۶/۸ ۔ العدہ ۴۵۵ ۔ المجموع ۲۶/۹

چوتھی فصل

اہلِ کتاب کا ذبیحہ

اس فصل میں مندرجہ ذیل مباحث شامل ہیں:

۱ ــــــ اہل کتاب کا ذبیحہ

۲ ــــــ غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کی مشکلات

۳ ــــــ درآمد شدہ گوشت

اہل کتاب کا ذبیحہ

اللہ تعالیٰ عز اسمہ ارشاد فرماتے ہیں:

وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ

وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ (المائدہ: آیت ۵)

(اور اہلِ کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن کو حلال ہے)

یہی وہ آیتِ کریمہ ہے جو طعام اہل کتاب کے حلال ہونے کی اصل ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، ابوامامہؓ، مجاہدؒ، سعیدؒ بن جبیرؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ، الحسنؒ، مکحولؒ، ابراہیمؒ نخعی، السدیؒ اور مقاتلؒ ابن حیان نے کہا ہے کہ اس آیت میں طعام سے مراد اہلِ کتاب کے ذبائح ہیں[1]۔

---

[1] ابن کثیر ۱۹/۲

وہ اہل کتاب جن کا طعام حلال ہونے پر ائمہ کرام متفق ہیں، یہود اور نصاریٰ ہیں۔ یہی قول جمہور فقہاء کا ہے جن میں حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ شامل ہیں۔ اس مسئلے میں ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں سوائے اس کے کہ مالکیہ کہتے ہیں مسلمانوں کے لئے اہل کتاب کا صرف وہ کھانا حلال ہے جو اُن کی شریعت میں مباح ہے۔

لیکن جو چیز اُن کی شریعت میں اُن کے لئے حرام ہے وہ مسلمانوں کے لئے بھی حرام ہے جیسے اونٹ کا گوشت اور وہ تمام جانور جن کے کھُر یا پنجے درمیان سے پھٹے ہوئے نہ ہوں۔ جیسے ہنس اور بطخ وغیرہ۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ: وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ کے مطابق مسلمانوں کے لئے اُن کا کھانا جائز نہیں کیونکہ اہل کتاب کا کھانا وہ ہے جو اُن کی شریعت میں اُن کے لئے حلال ہے اور وہی اس آیت کی رُو سے مسلمانوں کے لئے حلال ہے اور جو اُن کے لئے حلال نہیں ہے وہ مسلمانوں کے لئے بھی حرام ہے۔ مذہب مالکیہ میں معتمد قول یہ ہے کہ چربی مذبوح کے تابع ہے لہذا اُس کا کھانا جائز ہے مگر کراہت کے ساتھ[1]

لیکن جمہور فقہاء مالکیہ کی مذکورہ بالا رائے کے مخالف ہیں کیونکہ وہ اہل کتاب کے ہر طعام کو جائز سمجھتے ہیں خواہ وہ اُن کی شریعت میں اُن کے لئے حلال ہو یا حرام، سوائے اُن چیزوں کے جو (ہماری شریعت میں) ہمارے لئے حرام قرار دے دی گئی ہیں۔ ایسی چیزوں کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

اس مسئلے میں جمہور فقہاء نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن مغفل سے ثابت اُس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:

"(جن دنوں) ہم نے خیبر کے قلعے کا محاصرہ کر رکھا تھا، کسی شخص نے ایک تھیلا پھینکا جس میں چربی تھی، میں اُچھلا تاکہ اُسے پکڑلوں لیکن جب میری نظر اچانک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو مجھے آپؐ سے شرم آگئی۔"

---

[1] دیکھیئے حاشیۃ الدسوقی شرح الکبیر ج ۲/۱۰۲

صحیح مسلم میں یہ حدیث جن الفاظ کے ساتھ نقل کی گئی ہے اُن کا ترجمہ یہ ہے۔

" عبداللہؓ نے کہا کہ میں نے چربی کا ایک تھیلا پایا تو میں اُس کی جانب متوجہ ہوا، جب اچانک میری نظر حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو آپؐ تبسم فرما رہے تھے[1]"

صابیوں، سامریوں اور مجوس کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا یہ لوگ اہلِ کتاب میں شامل ہیں یا نہیں اور ان کا ذبیحہ کھانا جائز ہے یا نہیں۔ اکثر فقہاء صابیوں اور سامریوں کے ذبیحے کو جائز سمجھتے ہیں کیونکہ یہ لوگ درحقیقت اہلِ کتاب ہیں جو اپنے آپ کو حضرتِ ابراہیم اور حضرت شیث علیہما السلام وغیرہ انبیاء کرام کے دین کے پیروکار بتاتے ہیں۔

اسی طرح عرب کے نصرانیوں، جیسے بنی تغلب، بہرا، جذام اور لخم کے ذبائح سے متعلق بھی فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ چنانچہ شافعیہ کے نزدیک اُن کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔ یہ مذہب حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہے[2]۔

لیکن احناف کا مسلک یہ ہے کہ اُن کا ذبیحہ کھایا جائے گا، اس لئے کہ اسم اہلِ کتاب اُن کو بھی شامل ہے[3]۔

مسلکِ امام احمدؒ کی رُو سے بھی اُن کا ذبیحہ کھایا جائے گا۔ امام احمدؒ اہلِ کتاب کے درمیان فرق نہیں کرتے خواہ وہ عربی ہوں یا غیر عربی اور خواہ حربی ہوں، خواہ ذمی، کیونکہ آیتِ مذکورہ بالا کے عموم کے پیشِ نظر وہ سب برابر ہیں۔ المغنی میں اسی قول کو صحیح کہا گیا ہے اور یہ قول جمہور فقہاء کا ہے[4]۔

---

[1] دیکھیے تفسیر قرطبی ۱۲۷/۷

[2] دیکھیے تفسیر ابن کثیر ۲۰/۲

[3] دیکھیے فتح القدیر ۴۸۸/۹ (احناف)

[4] دیکھیے المغنی ۵۶۸/۸

اسی طرح اُس شخص کا ذبیحہ کھانے میں بھی اختلاف ہے جس کے والدین میں سے ایک ایسا کتابی ہو جس کا ذبیحہ حلال نہیں اور دوسرا ایسا جس کا حلال ہو۔ چنانچہ امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ اُس کا ذبیحہ حلال نہیں۔

امام شافعی کے نزدیک اگر اُس کا باپ کتابی ہو تو اس مسئلے میں دو قول ہیں: ایک قول کی رُو سے اس کا ذبیحہ مباح ہے۔ یہ قول امام مالکؒ اور ابوثورؒ کا ہے، اور دوسرے قول کی رُو سے جائز نہیں کیونکہ اُس میں تحریم اور اباحت دونوں کا مقتضیٰ پایا جاتا ہے اور تحریم کا مقتضیٰ غالب ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آیت (بالا) کے عموم کے پیشِ نظر اُس کا ذبیحہ مطلقاً جائز ہے۔

لیکن اگر وہ بت پرستوں یا مجوسیوں کا بیٹا ہو اور اُس نے اہلِ کتاب کا دین اختیار کر لیا ہو تو ایسی صورت میں ائمۂ ثلاثہ کے مذہب کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اُس کا ذبیحہ حرام ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کا مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ حلال ہے، کیونکہ اعتبار ذبح کرنے والے کے دین کا کیا جائے گا نہ کہ اُس کے والدین کے دین کا اس اعتبار سے کہ قبولِ جزیہ میں اسی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح آیت کے عموم اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے۔[1]

اس مسئلے میں (مختلف فقہاء کے دلائل کا مطالعہ کرنے سے) جو چیز واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (الفاطر: ۱۸)

(اور نہ اُٹھائے گا کوئی اُٹھانے والا بوجھ دوسرے کا)

اور ظاہر ہے کہ اُس کے باپ یا ماں کا جو دین ہے اُس میں اس کا کوئی دخل نہیں۔

لیکن جہاں تک مجوسیوں کا تعلق ہے تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ارشاد:

سنوا بهم سنة اهل الكتب غير ا كلى ذبائحهم و ناكحى نسائهم

---

[1] المغنی ۷/ ۵۶۸، اور دیکھیے بدائع الصنائع ۶/ ۲۷۷

(اُن کے ساتھ ایسا سلوک کرو جیسا اہلِ کتاب کے ساتھ کرتے ہو لیکن نہ اُن کا
ذبیحہ کھاؤ نہ اُن کی عورتوں سے نکاح کرو)

کے مطابق تمام فقہاء اُن کے ذبیحے کو حرام سمجھتے ہیں۔ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ حضورؐ کے مندرجہ بالا ارشاد کی مُراد یہ ہے کہ جزیے کے معاملے میں مجوسیوں کے ساتھ اہلِ کتاب کا سا سلوک کرو۔

ابو ثورؒ اور ابراہیم بن خالد کے سوا کسی نے اُن کے ذبیحے کو حلال نہیں کیا اور یہ ظاہریہ کا مذہب ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ مجوسی اہلِ کتاب ہیں۔ مجوسیوں کے اہلِ کتاب ہونے پر یہ فقہاء مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

اوّل: حضرت زید بن وہب سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

"میں حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ وہاں مجوسیوں کا ذکر چھڑ گیا، اس پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ: بے شک مجوسی اہلِ کتاب کا ایک گروہ ہیں، چنانچہ انہیں اسی مقام پر رکھو جس مقام پر اہلِ کتاب کو رکھتے ہو"

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے ذکر کیا ہے کہ حدیثِ مذکورہ بالا میں جو استثناء (غیر ناکحی نسائہم) آیا ہے وہ مدرج (بعد میں کیا گیا اضافہ) ہے لیکن اس کو اُس حدیث سے تقویت پہنچتی ہے جو عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے الحسن بن محمد بن علی کے طریق سے روایت کی ہے اور جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں کو خط لکھا اور انہیں اسلام قبول کر لینے کی دعوت دی۔ چنانچہ جو اسلام لے آیا اُس کا اسلام قبول کر لیا گیا اور جنہوں نے (اپنے سابقہ مذہب

---

[1] اس حدیث کو عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے، دیکھیے نصب الرایۃ ۴/۱۸۱

کی پیروی پر) اصرار کیا اُن پر جزیہ لگا دیا گیا، سوائے اس کے کہ اُن کا نہ تو کوئی ذبیحہ کھایا جائے گا، نہ اُن کی کسی عورت سے نکاح کیا جائے گا"

ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس طریق سے بھی (یہ حدیث) مُرسَل[1] ہے اور اس کی اسناد میں ایک راوی قیس بن الربیع ہے جو ضعیف ہے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ (اس حدیث پر) اکثر مسلمانوں کا اجماع اس کی تائید کرتا ہے۔

دوم: مجوسیوں کو اہلِ کتاب سمجھنے والے فقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے جزیہ لیا حالانکہ اللہ عزوجل نے اہلِ کتاب کے سوا کسی سے جزیہ لینے کی اجازت نہیں دی۔ اور مانعین کی دلیل کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ (حدیث میں وارد) استثنا مدرج ہے اور اس کی بنیاد پر جو رائے قائم کی گئی ہے وہ مُرسَل ہے[2]۔

اس میں کیا حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر ادیان کے پیروکاروں کے سوا اہلِ کتاب کے ذبیحے ہمارے لئے حلال قرار دے دیئے ہیں؟ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا علم اللہ نے اپنے لئے مخصوص رکھا ہے۔ وہ علام الغیوب ہیں، نہ کسی ایسے کام کا حکم دیتے ہیں جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو اور نہ کسی ایسی چیز سے روکتے ہیں جو انسان کے لئے کسی منفعت یا بھلائی کی حامل ہو۔

بہر حال اس سلسلے میں جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ اہلِ کتاب کے ساتھ خوش اخلاقی اور اپنائیت کا رویہ اختیار کریں تاکہ اُن کے اور ہمارے درمیان قربت بڑھے اور ہم ایک دوسرے سے ملیں جلیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے اُن کی عورتوں سے نکاح جائز قرار دیا ہے۔

---

[1] مُرسَل اُس حدیث کو کہتے ہیں جس کے سلسلۂ اسناد میں صحابی راوی کا نام مذکور نہ ہو۔

[2] الروض النضیر شرح مجموع الفقہ الکبیر ۳/۱۶۸ - ۱۷۰

یہ قربت اور اپنائیت کا یہ احساس مکہ مکرمہ میں دعوتِ اسلامیہ کے آغاز کے وقت سے موجود تھا۔
چنانچہ جب اہلِ فارس رومیوں پر غالب آگئے تو اس سے قریش کو بہت خوشی ہوئی لیکن مسلمانوں کو غم ہوا کیونکہ مسلمان بھی اہلِ کتاب (قرآن والے) تھے اور رومی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دلاسا دینے کے لئے فرمایا کہ فتح کے لئے جو وقت مقرر ہے، وہ اس پر ضرور ہوگی اور یہ کہ عنقریب رومیوں کو اہلِ فارس کے خلاف مدد دی جائے گی۔ چنانچہ سورۂ الروم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ
فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ (آیت ۱ تا ۴)

(مغلوب ہوگئے رومی ملتے ہوئے اور وہ اس مغلوب ہونے کے بعد عنقریب
غالب ہوں گے چند برسوں میں اللہ کے ہاتھ ہیں سب کام پہلے اور پچھلے)

یہ تو تھا مسئلے کا ایک رُخ، اب دوسرے پہلو سے دیکھئے۔ اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والے ہیں ——
بات یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے اپنی اپنی کتاب کے اوامر و نواہی کے پابند ہیں، اگرچہ انہوں نے اپنی کتابوں میں تبدیلی کرلی ہے اور انہیں بدل لیا ہے تاہم وہ اپنے کھانے پینے اور ذبیحوں کے بارے میں ان کتابوں کے اوامر و نواہی، شروط اور احکامات کی پابندی کرتے ہیں۔
لیکن ان کے سوا جو دوسرے کفار ہیں وہ کتابی اوامر و نواہی اور شرائط کے پابند نہیں کیونکہ اُن کے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں جو انہیں یہ بتلائے کہ کون سی چیزیں حلال ہیں اور کون سی حرام، چنانچہ ہوسکتا ہے کہ وہ آج ایک چیز کو حلال قرار دیں اور دوسرے روز اُسی کو حرام ٹھہرائیں۔ اسی لئے حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے عربی نصرانیوں کے ذبائح کو حرام قرار دیا۔ عرب کے نصرانیوں کے متعلق حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ: "یہ لوگ اہلِ کتاب نہیں، انہوں نے اُن سے سوّر کا گوشت کھانا اور شراب پینا (ہی) لیا ہے"۔ اس مسئلے میں حضرت شافعیؒ کے مذہب کی بنیاد حضرت عمرؓ کے اسی قول پر ہے۔[1]

---

[1] دیکھیے کفایۃ الاخیار، ۲۲ اور کتاب الام ۲/۱۹۶

حاشیۃ المقنع میں لکھا ہے کہ بنی تغلب کے ذبیحوں کے متعلق امام احمدؒ سے ماخوذ صحیح مسلک یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے واجبات اور ممنوعات کے بارے میں اہل کتاب کے دین کی پیروی نہیں کرتے بلکہ انہوں نے اُن سے فقط حرام چیزوں کا حلال کرنا ہی لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اہل کتاب کے دین سے شراب خوری کے سوا کچھ نہیں لیا۔[1]

یہ اس لئے کہ اُن کے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں جس کی تعلیمات حلال و حرام کے بارے میں اُن کے لئے واجب العمل ہوں۔

اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ اگر اہل کتاب جانوروں کے ذبح کرنے میں مسلمانوں کے طریقے کی پیروی کریں تو اُن کا کھانا حلال ہے۔ اختلاف اُس صورت میں ہے جب وہ مسلمانوں کا طریقہ چھوڑ کر اور کسی طریقہ سے جانور کو ذبح کریں۔

مسلمانوں کے نزدیک اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہونے کی شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) یہ کہ مذبوح کوئی ایسا جانور نہ ہو جسے شریعت اسلامیہ نے حرام قرار دیا ہو۔

(ب) ذبیحے پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام نہ لیا گیا ہو۔

(ج) جانور کو مشروع طریقے سے ذبح کیا گیا ہو۔

(د) چوتھی شرط جس کے بارے میں اہل فقہ مختلف الرائے ہیں، ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینے کو واجب سمجھنا ہے۔

درج ذیل سطور میں ان شرائط کی وضاحت کی جاتی ہے:

اولاً: اگر کوئی کتابی اپنے لئے ایک ایسا جانور حلال ٹھہرا لے جو اسلام میں حرام ہے اور اُس کا گوشت ہمیں پیش کرے تو ہم اُسے قبول نہیں کریں گے، جیسے سُوّر کا گوشت، یا مُردار، یا خون۔۔۔۔ کیوں؟

---

[1] حاشیۃ المقنع ۳/۵۳۵ - ۵۳۶۔

اس لئے کہ یہ ہماری شریعت میں حرام ہے۔ اور اس پر پوری اُمت کا اجماع ہے۔

ثانیاً: دوسری شرط یہ ہے کہ ذبیحے پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام نہ لیا گیا ہو۔ چنانچہ اگر کتابی نے اپنے ذبیحے پر حضرت مسیح علیہ السلام یا حضرت عزیر علیہ السلام یا کسی گرجا یا اسی طرح کسی اور کا نام لیا تو اکثر فقہاء کے نزدیک جن میں ائمۂ ثلاثہ حضرت امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ شامل ہیں، وہ ذبیحہ حرام ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے پیش نظر نہیں کھایا جائے گا۔ یہ قول حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، طاؤسؒ اور الحسنؒ کا ہے۔

یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ ہم کتابی کو غیر اللہ کا نام لیتے ہوئے سن لیں لیکن اگر وہ ہماری عدم موجودگی میں ذبح کرے تو ہم اُس سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اہلِ کتاب کے ذبیحے کے بارے میں پوچھا گیا در آنحالیکہ وہ اپنا جانور ذبح کرتے وقت زبان سے ایسے کلمات ادا کرتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے مطابق صحیح نہیں تو آپؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذبیحے حلال قرار دے دیئے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ (عالم الغیب پوری اچھی طرح) جانتے ہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ لیکن اگر کتابی کو ذبیحے پر صرف حضرت مسیحؑ کا نام لیتے ہوئے سن لیا جائے یا وہ اللہ تعالیٰ کا نام لے اور اس کے ساتھ حضرت مسیحؑ کا بھی نام لے تو وہ ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔ یہ مسئلہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح مروی ہے اور کسی نے اس کی تردید نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُمت کا اس پر اجماع ہو چکا ہے[1]۔

عطاءؒ، مکحولؒ، زہریؒ، ربیعہؒ اور شعبی نے کہا ہے کہ ہمارے لئے نصرانی کا ذبیحہ کھانا جائز ہے خواہ اس نے اُس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد:

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ

---

[1] بدائع الصنائع ۲/۶ ۲۷

(اور کھانا اُن کا جو دیئے گئے کتاب حلال ہے تمہارے لئے)

کے مطابق اُن کا کھانا بغیر کسی قید یا شرط کے ہمارے لئے مُباح قرار دے دیا ہے - یہی بات مجاہدؒ نے کہی ہے[1] لیکن ارشادِ باری عزاسمہ: "وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ" کے پیشِ نظر یہ قول مردود ہے -

مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی کتابی نے اپنے ذبیحے پر غیر اللہ کا نام تبرکاً لیا، جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کا نام یا کسی گرجا کا نام تو اُس کا کھانا مکروہ ہے لیکن حرام نہیں - ہاں اگر اُس نے جانور اپنے خداؤں کے نام پر ذبح کیا، اور یہ وہ ذبیحے ہیں جنہیں وہ لوگ اپنے خداؤں کے نام پر قربان کرتے ہیں یا زندہ چھوڑ دیتے ہیں اور ان سے کوئی استفادہ نہیں کرتے، تو ایسے ذبیحے حرام ہیں کیونکہ یہ اُن کا طعام نہیں ہیں[2]

سوم: تیسری شرط یہ ہے کہ جانور شریعت کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق ذبح کیا گیا ہو، یعنی یہ کہ اُسے کسی تیز دھار والی چیز سے اس طرح ذبح کیا گیا ہو کہ جانور کا گلا، غذا کی نالی اور خون کی دونوں رگیں (ودجین) اس کتاب کی پہلی فصل میں بیان کردہ شرطوں کے مطابق کٹ گئی ہوں -

اہلِ یورپ کا طریقۂ ذبح - ذبح برقی (جھٹکا)

ذبح کرنے کے اسلامی اور مغربی طریقوں کے درمیان موازنہ:

۱- جانوروں کو ذبح کرنے کا اسلامی طریقہ انسانی ہے اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے کلی مطابقت رکھتا ہے -

---

[1] دیکھیے المجموع ۶۸/۹

[2] دیکھیے حاشیہ الدسوقی علی شرح الکبیر ۱۰۱/۲

۲۔ خوراک اور غذا کے بارے میں یورپ کی موجودہ روایات اور عادات رومی ہیں اور رومی شہنشاہ قسطنطین کے مسیحی عقیدہ (یعنی اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا طریقہ) اپنا لینے کے باوجود بغیر کسی تبدیلی کے یورپی اقوام میں جاری وساری ہیں، حالانکہ مسیحی عقیدہ وہی عقیدہ تھا جو انبیاء سابقین حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کا عقیدہ تھا اور اس حیثیت سے رومی روایات سے مختلف تھا اور اسلامی طریقے سے مماثلت رکھتا تھا۔

۳۔ ذبح کرنے کا اسلامی طریقہ جانوروں کو ہلاک کرنے کے تمام یورپی طریقوں سے قطعاً مختلف اور اجتماعی قتل حیوانات کے طریقے کے بالکل برعکس ہے۔ ذبح اسلامی کا طریقہ جو اللہ خالقِ کائنات کا مقرر کیا ہوا ہے، پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ومعروف ہے۔ نرمی، باقاعدگی اور نظم وضبط اس طریقہ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

۴۔ اگر جانور کو اسلامی طریقے کے مطابق ذبح کیا جائے تو اس صورت میں اُس کا خون اُس کی جان نکلنے تک بہتا رہتا ہے اور اُسے ایذا کم پہنچتی ہے۔ اس طرح یہ طریقہ انسان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے سے مشابہت رکھتا ہے اور یہ مشابہت کسی اور طریقے میں نہیں پائی جاتی۔

۵۔ اس طریقے سے جانور کی موت تیزی سے واقع ہوتی ہے اور اس کی جان جلدی نکل جاتی ہے اس لئے کہ جانور کو مناسب جگہ سے ذبح کرنے (یعنی گردن کے سامنے والے حصے میں تیز اور گہری کاٹ لگانے) کے باعث اُس کا خون فوراً نکل جاتا ہے اور وہ کمزور ہو جاتا ہے۔

۶۔ ذبح کرنے کا عمل تخدیر سے عبارت ہے (یعنی اس میں جانور کو تکلیف کا احساس نہیں ہوتا) بخلاف تخدیر کے جس میں چوٹ یا صدمے کے باعث جانور بے ہوش ہو جاتا ہے۔ یہ جانداروں کو ہلاک کرنے کی بڑی بھونڈی صورت ہے جسے اب انسان کئی برس سے ترک کر چکا ہے۔

۷۔ عمل ذبح کے ذریعے ہمیں خون سے پاک گوشت حاصل ہوتا ہے جو لذیذ ہونے کے علاوہ حفظانِ

صحت کے اُصولوں کے مطابق معیاری ہوتا ہے۔ مزید برآں (جانوروں کو ذبح کرنے کا یہ طریقہ) انسانی بھی ہے۔

لیکن جہاں تک اُن اشیاء کا تعلق ہے جنہیں جانوروں کو ہلاک کرنے والے غیر تکلیف دہ آلات کہا جاتا ہے تو یہ محض تدویخ (بے ہوش کرنے) کی مشینی صورتیں ہیں، جنہیں صرف اس لئے زیر استعمال لایا جا رہا ہے کہ ہلاک کردہ جانوروں کی بہت بڑی تعداد سے مشینی گوشت تیار کیا جا سکے اور بچایا جا سکے۔

گوشت کی مشینی صنعت سے پہلے ہتھوڑے کی طرز کا ایک آلہ استعمال ہوتا تھا جس سے جانور کے دماغ پر ضرب لگائی جاتی تھی۔ اسی طرح کا آلہ اب مشینی صنعت میں بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہمارے نقطۂ نظر سے مسئلہ صرف چھری تھامنے کا نہیں بلکہ زیادہ اہم بات اللہ تعالیٰ رحیم وکریم کی صفات پر اعتقاد رکھنے کا ہے۔

جانوروں کو مارنے کے مشینی آلات، جنہیں قتل کے انسانی آلات کہا جاتا ہے، وہ محض احساس کو ختم کرنے والے آلات کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں جو ماضی میں غیر مشینی تھے۔ چنانچہ مسدس کے نام سے آج کل جو آلہ استعمال کیا جا رہا ہے وہ ہتھوڑے کی مشینی شکل ہے جو اس سے پہلے زیر استعمال تھا۔ یہ آلہ حیوان کو احساس سے محروم یا بیہوش کر دیتا ہے۔

اس آلے (یعنی مسدس) کے رائج ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے بہت تھوڑے وقت میں اتنے زیادہ جانوروں کو ہلاک کیا جا سکتا ہے جن کا ہتھوڑے کے ذریعے ہلاک کرنا ممکن نہ تھا، حالانکہ ہتھوڑا سب سے زیادہ بے ہوش کرنے والا آلہ تھا۔ موجودہ آلہ کاربن ڈائی آکسائڈ کے ذریعے جانوروں کو بے ہوش کرتا ہے جو گلا گھونٹنے کی ایک کیمیائی شکل ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں خون کا استعمال جائز نہ تھا، لیکن جب رومی شہنشاہ نے مذہب عیسوی اپنایا، تو اُس نے رومی قوانین کے بجائے، جو اُن کے ہاں سے رائج تھے، کتاب مقدس کے قوانین نافذ نہیں کئے۔

مغربی مسیحیت، رومی مسیحیت اور ان کے ذیلی مذہب پروٹسٹنٹزم میں کھانے پینے کے جو قوانین ان طوائل

رائج ہیں وہ رومی قوانین ہی پر مبنی ہیں۔ ان قوانین کا اُن قوانین سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں جن پر حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والتسلیم عمل پیرا تھے۔

مغرب کے مسیحی، بت پرست اور خصوصی خون کو کالے مشروب کی صورت میں استعمال کرتے ہیں، اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ جانور کے رگ و ریشہ سے خون کے اخراج کا طریقہ، جس پر مسلمان اور یہودی عمل پیرا ہیں جو خون کو استعمال نہیں کرتے ایک طرف، اور دوسری طرف وہ لوگ جو اسے استعمال کرتے ہیں، مختلف اقدار سے متاثر ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں اور یہودیوں کے لئے ممکن نہیں کہ وہ کسی ایسے طریقے کو قبول کریں جس کے ذریعے خون کا کافی مقدار میں اخراج ممکن نہ ہو، اور جسے وہ لوگ پسند کریں جو خون کو استعمال میں لاتے ہیں۔

علم وظائف الاعضاء کا مطالعہ کرنے والے کہتے ہیں کہ ذبح کرنے کے عمل سے جانور کو صدمۂ نزیفہ (خون بہادینے والی تکلیف) پہنچتا ہے جس کے باعث پورا بہنے والا خون کھنچ کر اُن رگوں میں پہنچ جاتا ہے۔ جن میں وہ گردش کرتا ہے اور بالآخر کٹی ہوئی رگوں کے ذریعے جسم سے خارج ہوجاتا ہے۔ لیکن اس صورت میں جب کہ جانور کو ہلاک کرنے سے پہلے بے ہوش کر دیا جائے، اس کے برعکس عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ تدویخ کا طریقہ زیادہ تکلیف دہ ہونے کے علاوہ ایسا ہے کہ اس سے جانور کا خون پوری مقدار میں خارج نہیں ہوتا۔ تدویخ کے طریقے میں اگر جانور کو تحکم کے تحت نہ رکھا جائے۔ تو اُس کے خون کا اخراج ممکن نہیں، اگر رکھا جائے تو ممکن ہے ایسی حالت میں (صدمے کے سبب اُس کے دل کی حرکت بند ہوجائے اور) وہ مُردار ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت اخراجِ خون کا کوئی فائدہ نہیں۔

ہوسکتا ہے تدویخ کا طریقہ اجتماعی قتل حیوانات کے اُس طریقے کے مقابلے میں زیادہ رحیمانہ اور نرمی والا ہو جو ماضی میں مغربی ممالک میں زیرِ استعمال تھا، لیکن ذبح کرنے کے مقابلے میں زیادہ رحیمانہ نہیں۔ ذبح کے طریقے میں عملِ قطع کی ابتدا ہی سے خون پوری شدت سے خارج ہوتا ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ جانور کا خون قطع کی ابتداء سے خارج ہونا شروع ہوتا ہے اور جب اُس کے دل کی حرکت بند ہوجاتی ہے، رُک جاتا ہے۔ تدویخ میں اخراجِ خون کا وقت طویل ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں اس کا وقت ہی نہیں رہتا۔ چنانچہ اخراجِ

خون سے پہلے تدریج ایک عیب ہے جو صدمۂ عصبیہ پیدا کرتی ہے اور یہ ایک ایسی حالت ہے جس میں خون کی گردش بند ہو جاتی ہے۔

یورپ میں جانوروں کو ہلاک کرنے کے طریقے

بھیڑ:

بھیڑ کو ایک پلیٹ فارم پر اس کی تین ٹانگیں باندھ کر یا پکڑ کر رکھا جاتا ہے اور زور سے اُس کی گردن کھینچ کر چھری گردن میں یا کانوں کے نیچے گھونپ دی جاتی ہے اور پھر ایک مستقل حرکت کے ساتھ اُس کی نوک ریڑھ کی ہڈی کے جوڑوں میں داخل کر دی جاتی ہے تاکہ نخاعِ شوکی (SPINAL-MARROW) کٹ جائے اور جانور کا ہلنا جلنا بند ہو جائے اور ذبیحہ کھانے کے لئے تیار ہو جائے۔

بچھڑا:

بچھڑے کو اُس کے پاؤں باندھ کر لٹکا دیا جاتا اور پھر اُس کا خون سے پاک گوشت حاصل کرنے کے لئے اس کی گردن کاٹ دی جاتی۔

(اہل یورپ کے نزدیک) حیوانات کے ذبح کرنے کا سب سے ماہرانہ طریقہ وہ تھا جو "انگریزی طریقہ" کہلاتا تھا۔ اس طریقے کا آغاز ۱۸۳۸ء میں کارسون کے واسطے سے ہوا۔ اس میں جانور کو بے حس و حرکت کھڑا رکھا جاتا یا لٹا لیا جاتا اور اس کے بعد چوتھی اور پانچویں پسلی کے درمیان سینے کی دیوار میں شگاف ڈالا جاتا اور پھر اس کھلے ہوئے شگاف کے راستے کسی دھونکنی کے ذریعے جانور کے جسم میں ہوا داخل کی جاتی جس سے جانور کے دونوں پھیپھڑوں پر دباؤ پڑتا اور وہ دم گھٹ کر مر جاتا۔ لیکن اس عمل کے نتیجے میں نہ جانور کا خون بہتا نہ وہ کمزور ہوتا۔

بیل :

چھوٹے حیوانات کے برعکس جنہیں تدویخ کے بغیر ذبح کیا جاتا تھا، بڑے جانوروں، جیسے بیل وغیرہ کو ان کے سر پر ہتھوڑا مار کر انہیں بے ہوش کیا جاتا تھا اس لئے نہیں کہ یہ طریقہ تکلیف دہ نہ تھا بلکہ اس لئے کہ بڑے جانوروں کو قابو کرنے کا عملی طریقہ یہی تھا اور اس کے بغیر انہیں قابو نہ کیا جا سکتا تھا۔

بے ہوش کرنے والے مشینی آلات :

بے ہوش کرنے کا پہلا مشینی آلہ جو ہتھوڑے کے بجائے زیر استعمال آیا اُسے عربی میں "مسدس" کہا جاتا ہے اور اس کے استعمال سے بھی جانور کو وہی نقصان پہنچتا ہے جو ہتھوڑے کے استعمال سے پہنچتا تھا، یعنی دباؤ پڑتے ہی جانور پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

مسدس کے استعمال سے جانور پر جو کپکپی اور اہتزاز طاری ہوتا ہے وہ اُس اہتزاز سے مختلف نہیں ہوتا جو ہتھوڑے کے ذریعے چوٹ لگانے کے نتیجے میں رونما ہوتا تھا کیونکہ دونوں حالتوں میں اس کا سبب بھیجے کا اہتزاز ہوتا ہے مسدس کی واحد خوبی اس کی سرعت عمل ہے کیونکہ اس کے ذریعے تھوڑے وقت میں بہت سے جانوروں کو ہلاک کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک حیوانات کا تعلق ہے انہیں مسدس کے استعمال سے بھی اتنی ہی تکلیف پہنچتی ہے جتنی ہتھوڑے کی ضرب سے پہنچتی تھی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مسدس جانوروں کو ہلاک کرنے کا غیر تکلیف دہ آلہ ہے محض ایک علمی مغالطہ ہے۔

قریباً گیارہ سال تک مسدس استعمال کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں اسے ترک کر دیا گیا اور اس کے بجائے جانوروں کو بجلی کے ذریعے بے ہوش کرنے کا طریقہ اپنا لیا گیا۔

تدویخ برقی

بجلی کے ذریعے بے ہوش ہونے کی صورت میں چونکہ حیوان نسبتہً زیادہ تیزی کے ساتھ مرتا ہے اس لئے یہ امر ضروری ہوتا ہے کہ کسی تاخیر کے بغیر اُس کا خون خارج ہو جائے۔ تدویخ برقی کے عمل کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ جانور کے گوشت میں بڑی سرعت کے ساتھ تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور اُس کا ذائقہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ ڈنمارک کے گوشت پیدا کرنے والوں نے اپنی حکومت سے قانونِ تدویخ کو موقوف کرنے کا جو مطالبہ کیا تھا اُس کا ایک سبب اُن کی یہی شکایت تھی۔

اس کی سائنسی توجیہ یہ ہے کہ حیوانی گوشت میں نمکیات کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے جس کے باعث حیوانات جراثیم کے حملے سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ نمکیات خون کے بسرعت بہنے میں خارج ہو جاتی ہیں (چنانچہ گوشت جلدی خراب نہیں ہوتا) اس کی تفصیل (کالو۔ ا۔ اٹش) نے اپنی کتاب "صحتِ غذائی" میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہے۔

گرم خطوں کے گوشت درآمد کرنے والوں کے لئے یہ چیز بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں بجلی کے جھٹکے سے طاری ہونے والی کپکپی کے نتیجے میں گوشت کے اندر جو نزیف (کمزوری) پیدا ہوتی ہے اس میں اور بیماری کے سبب پیدا ہونے والی کمزوری میں امتیاز کرنا محال ہو جاتا ہے

۱۹۷۰ء سے پرندوں اور مُرغیوں کی تدویخ برقی میں جو ایک تبدیلی آئی ہے وہ بجلی کے خودکار آلۂ تدویخ کا استعمال ہے جس کی بنیاد پانی کے حمام کے نظریئے پر رکھی گئی ہے۔ اس طرح درحقیقت پانی میں ڈبو کر مارنے اور بجلی کے جھٹکے سے ہلاک کرنے کے عمل کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

تدویخ برقی میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ جانور کے حقیقی معنوں میں بے ہوش ہونے سے پہلے اُس کے اعصاب شل ہو جاتے ہیں۔ اور مشکل یہ ہے کہ اگر برقی رو کم آ رہی ہو تو اُس سے جانور سرے سے بے ہوش ہی نہیں ہوتا بلکہ صرف مشلول ہو کر پڑا رہتا ہے اور تکلیف کا پورا پورا احساس کرتا ہے۔ اور دوسری طرف ایسا بھی ہوتا ہے

کہ برقی رو کی شدت سے جانور کو سکتۂ قلبیہ ہو جاتا ہے جس سے اُس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں ذبح شدہ جانور کے جسم سے خون کے اخراج میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

تدویخ اور خون کا اخراج

تدویخ کا عمل خواہ کسی طریقے سے بروئے کار لایا جائے اُس سے جانور کو صدمۂ معصبیہ پہنچتا ہے اور یہ ایک ایسی حالت ہے جس میں خون کی گردش رُک جاتی ہے۔

لیکن جانور کے جسم سے اخراجِ خون کا عمل صدمۂ نزیفیہ (خون بہا دینے والی تکلیف) پیدا کرتا ہے کیونکہ اس صورت میں خون بافتوں سے کھینچ کر گردش میں آجاتا ہے۔ لہذا ایسی حالت میں جب کہ خون معمول کے مطابق گردش کر رہا ہو چھری کے ذریعے اُس کا اخراج ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے گوشت خون سے اچھی طرح پاک ہو سکتا ہے۔

تدویخ کے مشینی آلات کی تاریخ سے جو حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے اور جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ ہے کہ نصف صدی سے زیادہ عرصے کے تجربات ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ تدویخ کا کوئی ایک آلہ بھی ایسا نہیں جسے بے خطر استعمال کیا جا سکے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سائنسی ترقی کا انکار کر رہے ہیں، اس لئے کہ اگر ہم انسانوں کی تدویخ (مدہوش کرنے) کے ابتدائی طریقوں کا مقابلہ اُن کی تخدیر (سن کرنا) کے جدید طریقوں سے کریں تو واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں سائنس نے قابلِ لحاظ ترقی کی ہے۔ لیکن انسانوں کو تو آپریشن سے قبل سن کیا جاتا ہے جب کہ جانوروں کو پہلے ہی کی طرح بے ہوش (تدویخ) کرنے کا عمل جاری ہے۔

یہ بات ممکن نہیں کہ تخدیر کے طریقے میں جو ترقی ہوئی ہے اُس کا انطباق، اُس کی موجودہ حالت میں جانوروں پر کیا جائے، اور چونکہ ایسا کرنے میں بڑے اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اس لئے لوگوں میں اس کی کوئی خواہش بھی موجود نہیں۔ بہر حال اگر طبی اُصولوں کو نظر انداز کر دیا جائے یا طبی نقطۂ نظر سے اس کے جواز کی سند

حاصل ہوجائے تو مسلمانوں کو اس امر پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ خون بہانے سے پہلے جانوروں کو سُن کر دیا جائے۔

اگر ہمارا مقصد حیوانات کے ساتھ نرمی اور انسانیت کا سلوک کرنا ہو تو ہم یہ دیکھیں گے کہ آخری تجزیے میں کھانے کے لئے جانوروں کو ذبح کرتے وقت نزیف شدید (خون بہہ جانے کے سبب شدید کمزوری) پیدا کرنے کے لئے چھری کا استعمال ہی وہ واحد طریقہ ہے جسے انسانی (یعنی غیر تکلیف دہ) کہا جا سکتا ہے[1]

ہماری مندرجہ بالا گزارشات سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام دینِ رحمت ہے، کمال اور حکمت کا دین ہے۔ صحت اور صفائی کا ضامن ہے۔ یہ دین پورے کا پورا خیر اور برکت ہے۔ یہاں تک کہ انسان جو غذا کھاتا ہے جس سے اُس کی نشو و نما ہوتی ہے اس کے سلسلے میں بھی ہمیں کبھی اس امر کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ ہم قرآن و سنت کے سوا کسی اور مصدر و ماخذ کی تعلیمات کی طرف رجوع کریں، کہیں اور سے رہنمائی حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ
مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ (الانعام: ۱۱۹)

(اور کیا سبب کہ تم نہیں کھاتے اُس جانور میں سے کہ جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا اور وہ واضح کر چکا ہے جو کچھ کہ اُس نے تم پر حرام کیا ہے مگر جب کہ مجبور ہو جاؤ اس کے کھانے پر)

جوں جوں سائنس ترقی کرے گی توں توں اس دین کے اسرار، اور اس کی تعلیمات، اس کے نظم و انتظام اور قواعد و ضوابط کی حکمت واضح سے واضح تر ہوتی جائے گی (کیونکہ شارع علیہ السلام) ارشاد باری تعالیٰ:

---

[1] ۔ مندرجہ ذیل کتاب سے ترجمہ کیا گیا

Al-Zabah, Slaying Animals for Food the Islamic Way by Dr. Ghulam Mustafa Khan.

"وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" (النجم: ۳، ۴)

(اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا)

کے مطابق وہی بات کہتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ پر وحی کی جاتی تھی۔

اگر دورِ حاضر میں یورپ کے لوگوں کا طریقہ ذبح یہ ہوتا کہ جانور کی گردن، جس میں مری، حلقوم اور دونوں شہ رگیں شامل ہیں، پوری تیزی سے کاٹ دی جاتی، خواہ سامنے سے، خواہ پیچھے سے تو اسلام ذبح کرنے کے اس طریقے کو تسلیم کر لیتا۔ لیکن اس طریقے کے علاوہ جانوروں کو ہلاک کرنے کے جتنے اور طریقے ہیں، اسلام انہیں تسلیم نہیں کرتا۔

اگر جانور کی گردن سامنے سے کاٹی جائے تو اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں، تمام فقہاء کے نزدیک ذبح کرنے کی صحیح صورت یہی ہے۔ لیکن اگر قطع کا عمل گردن کے پیچھے سے ہو تو اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ آیئے دیکھیں اس طریقے کے بارے میں کون کیا کہتا ہے۔

حاشیۃ المقنع میں لکھا ہے: اگر جانور کو غلطی سے (گردن کے) پیچھے سے ذبح کیا، اور جانور کے مرنے سے پہلے چھری مقام ذبح تک پہنچ گئی، تو اسے کھایا جائے گا۔ لیکن اگر جان بوجھ کر بالارادہ ایسا کیا تو اس کی دو صورتیں ہیں:

شرح میں کہا گیا ہے: اس سلسلے میں دو روایتیں منقول ہیں ایک روایت کے مطابق اُس کا کھانا جائز ہے جب کہ چھری حلقوم اور مری تک پہنچ گئی ہو بشرطیکہ ان کے کٹنے سے قبل جانور میں حیاتِ مستقرہ باقی ہو۔ قاضی اور شیرازی وغیرہما نے یہی رائے اختیار کی ہے۔ المغنی اور الشرح میں بھی اسے صحیح کہا گیا ہے۔ یہ مذہب امام شافعیؒ کا ہے۔ اس لئے کہ اگر ذبح کا عمل ایسے جانور پر واقع ہو جس میں حیاتِ مستقرہ پائی جاتی ہو تو اس کا کھانا جائز ہے جیسے کسی درندے کا بھنبھوڑا ہوا اور نطیحہ اور متردیہ جانور کا (بعد ذبح) کھانا جائز ہے۔

دوسری رائے کے مطابق ایسے جانور کا کھانا جائز نہیں (جسے بالارادہ گردن کے پیچھے سے ذبح کیا گیا ہو)۔ الوجیز کی عبارت سے بظاہر یہی نکلتا ہے اور امام احمدؒ سے مروی روایت ایسے جانور کی مطلق اباحت

پر دلالت کرتی ہے چنانچہ اگر تلوار سے جانور کی گردن ماری اور اس کا سر اڑا دیا تو وہ بھی جائز ہے۔ یہی رائے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اسے کھانے کا فتویٰ دیا ہے یہی قول امام شعبیؒ، امام ابو حنیفہؒ اور امام ثوری کا ہے۔ اس لئے کہ عمل ذبح کے ساتھ وہ تمام چیزیں کٹ گئیں جن کے کٹ جانے کے بعد زندگی باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ ایسے جانور کا کھانا جائز ہے[1]

امام احمدؒ وغیرہ سے جو کچھ نقل ہوا ہے وہ تمام کا تمام ایسے آلۂ ذبح پر منطبق ہوتا ہے جو ایک دفعہ میں گردن کاٹ دے۔

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ "اگر جانور کو (گردن کے) پیچھے سے ذبح کیا تو گناہ کیا لیکن بہر حال اگر جلدی سے حلقوم اور مری کاٹ دی، درانحالیکہ جانور میں حیاتِ مستقرہ باقی تھی، تو اس کا کھانا حلال ہے اور اگر (حیاتِ مستقرہ باقی) نہیں تھی تو حلال نہیں[2]"

قوانین الاحکام الشرعیہ میں لکھا ہے: "جو (جانور گردن کے) پیچھے سے ذبح کیا جائے گا نہیں کھایا جائے گا، اسی طرح وہ جانور بھی نہیں کھایا جائے گا جسے گردن کی کسی جانب سے ذبح کیا گیا ہو جب کہ وہ چیزیں کٹ گئی ہوں جن کا کاٹنا ذکاۃ میں واجب ہے[3]"

امام قرطبی لکھتے ہیں: "اگر جانور کو گردن کے پیچھے سے ذبح کیا اور قطع کا عمل مکمل ہو گیا اور خون بہہ گیا اور گلا اور دونوں شہ رگیں کٹ گئیں (تب بھی) اسے نہیں کھایا جائے گا[4]"

فتح القدیر میں ہے: "اگر بھیڑ کو گردن کے پیچھے سے ذبح کیا اور وہ رگیں کٹنے تک زندہ رہی تو اس کا کھانا

---

[1] حاشیۃ المقنع ۳/۵۳۸

[2] دیکھیے المغنی ۸/۱۷۱ (الحنابلہ)

[3] قلیوبی وعمیرہ ۴/۲۴۲ (الشافعیہ) قوانین الاحکام الشرعیہ ۱۹۳ (المالکیہ)

[4] القرطبی ۶/۵۴ (مذہب المالکیہ)

جائز ہے[1]:

المختصر فقہاء کے اقوال سے جن میں شافعیہ، حنفیہ اور حنابلہ شامل ہیں، جو چیز ہم اخذ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس طریقے سے ذبح کرنا جائز ہے، خواہ کراہت کے ساتھ خواہ بغیر کراہت کے۔

رابعاً: ذبیحے پر اللہ کا نام لینا

اس سلسلے میں جو بحث ہم اس سے پہلے کر آئے ہیں اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اکثر فقہاء کے نزدیک جن میں ائمہ ثلاثہ شامل ہیں یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد (رحمہم اللہ تعالیٰ عنہم) ذبیحے پر اللہ کا نام لینا اُس کے صحیح ہونے کی شرط ہے۔ لیکن امام شافعیؒ اسے شرط قرار نہیں دیتے۔ چنانچہ اگر ہم جمہور فقہاء کے قول کے مطابق یہ کہیں کہ ذبیحے پر اللہ کا نام لینا مسلمان کے لئے واجب ہے اور اُس کا ایسا کرنا ایک عبادت ہے تو کیا کتابی کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے؟

آیئے دیکھیں فقہاء اس مسئلے میں کیا کہتے ہیں۔

شافعیہ کے نزدیک اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے، خواہ اُس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو، اس لئے کہ وہ مسلمان کے لئے بھی اللہ کا نام لینے کو (ذبیحہ کے حلال ہونے کی) شرط قرار نہیں دیتے، چنانچہ غیر مسلم کے بارے میں تو اولیٰ ہے (کہ اسے شرط قرار نہ دیا جائے) علامہ نووی نے لکھا ہے: "ابن المنذر نے یہ رائے علی نخعیؒ، حمادؒ بن سلیمان، ابوحنیفہؒ، احمدؒ اور اسحٰقؒ وغیرہ[2] سے نقل کی ہے اور یہی اکثر فقہاء کا قول ہے۔

حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک کتابی کا ذبیحہ حلال ہے بشرطیکہ وہ ذبح سے متعلق اُن شرطوں کی پابندی کرے جن کی پابندی مسلمان کرتے ہیں اور جن میں سے ایک شرط ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا ہے[3]۔

---

[1] فتح القدیر ۹/۴۹۷ (احناف)

[2] دیکھیے المجموع ۹/۶۸

[3] دیکھیے المغنی ۸/۵۸۱

مالکیہ کے نزدیک اللہ کا نام لینا مسلمان کے ذبیحے کے حلال ہونے کی تو شرط ہے لیکن ذبیحۂ کتابی کے حلال ہونے کی شرط نہیں۔

ظاہر ہے کہ اس مسئلے میں مالکیہ اور شافعیہ کا مذہب ارجح ہے۔ اس کے دلائل یہ ہیں۔

اول: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ" اس ارشادِ باری تعالیٰ سے اہل کتاب کے طعام کی اباحت بغیر کسی قید اور شرط کے ثابت ہوتی ہے باستثناء ان اشیاء کے جنہیں ہماری شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

دُوم: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی وہ حدیث جس میں کہا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ ہمارے ہاں بعض لوگ گوشت لے کر آتے ہیں جس کے متعلق ہم نہیں جانتے کہ اُس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں؟ حضورؐ نے فرمایا تم اُس پر اللہ کا نام لو اور کھاؤ۔ کہا گیا ہے کہ وہ لوگ (گوشت لے کر آنے والے) نئے نئے کفر سے اسلام میں داخل ہوئے تھے[1]

حدیثِ بالا سے جو مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ:

اول: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کفار کے متعلق یہ بات معلوم تھی کہ وہ جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتے۔

دوم: مسلمانوں کے نزدیک اللہ کا نام لینا شروع تھا یہ امر اُن کے لئے واجب تھا، ذاتی طور پر اُن کے لئے۔ اسی لئے حضورؐ نے فرمایا: تم اللہ کا نام لو اور کھاؤ۔ گویا کہ حضورؐ نے فرمایا: چونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کا طعام تمہارے لئے مباح قرار دے دیا ہے اس لئے تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کہ انہوں نے اللہ کا نام لیا یا نہیں لیا، اللہ کا نام لینا تمہارے لئے واجب ہے نہ کہ اُن کے لئے۔

---

[1] بخاری، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ۔ دیکھیے نیل الاوطار ۱۴۲/۸

اس رائے کی تائید اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خیبر کے یہودیوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بھنی ہوئی بھیڑ پیش کی جس کی ران کو انہوں نے زہر آلود کر دیا تھا حضورؐ کو ران کا گوشت بہت پسند تھا چنانچہ آپؐ نے اُسے لے لیا اور اُس کا ایک لقمہ دانتوں سے کاٹ کر کھایا۔ جب آپؐ کو بتایا گیا کہ گوشت زہر آلود ہے تو آپؐ نے اُسے پھینک دیا لیکن اُس سے آپؐ کے اگلے دو دندانِ مبارک اور شہ رگ کو تکلیف پہنچی۔ آپؐ کے ساتھ وہ گوشت بشر بن البراء بن معروف نے بھی کھایا جس سے اُن کا انتقال ہو گیا۔[۱]

اس روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودِ خیبر کا طعام یہ پوچھے بغیر کھایا کہ آیا اُس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں۔

علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ ابن التینؒ نے کہا ہے کہ:

"اگر غیر مسلم کوئی جانور ذبح کریں تو وہ اس امر کے مکلف نہیں کہ اُس پر اللہ کا نام لیں۔ اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ امرِ واقعہ اس کے خلاف ہے تو اسے غیر صحیح ہونے پر محمول کیا جائے گا۔ اس امر کا احتمال ہے کہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی) مُراد یہ ہو کہ تمہارا اب تسمیہ کہنا اُس جانور کو مباح کر دے گا جس کے متعلق تم نہیں جانتے کہ اُس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں جب کہ اس کا ذبح کرنے والا کوئی ایسا شخص ہو جس کا ذبح کرنا صحیح ہے۔[۲]"

سوم: اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مباح کیا ہے کہ ہم کتابی عورتوں سے شادی کریں، لہٰذا اگر کوئی مسلمان کتابیہ سے شادی کرے تو کیا اُس عورت کے لئے لازم ہے کہ وہ اسلام کے فرائض اور واجبات

---

[۱] نیل الاوطار ۸/۱۵۸۔

[۲] یہ حدیث بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے۔

جیسے نماز روزہ، زکوٰۃ وغیرہ اسی طرح بجالائے جیسے اُس کی مسلمان بیوی بجالاتی ہے!

اس کا جواب ظاہر ہے کہ علماء میں سے کسی نے ایسا فتویٰ نہیں دیا، اس لئے کہ جب تک وہ عورت اپنے دین پر قائم ہے وہ اِن امور کی مکلف نہیں۔ اسی طرح ہم کسی کتابی کے لئے اس امر کو لازم قرار نہیں دے سکتے کہ وہ اپنے ذبیحے پر اللہ کا نام لے۔

کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمانے میں اہلِ کتاب اپنے ذبیحوں پر اللہ کا نام لیتے تھے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذبیحوں کو مباح قرار دیا۔ لیکن آج کل وہ ایسا نہیں کرتے اور یہ ہمارا روز کا مشاہدہ اور احساس ہے (جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اہل کتاب عہد نبویؐ میں اپنے ذبیحوں پر اللہ کا نام لیتے تھے۔ جیسا کہ حدیث سابق سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ (کہ وہ ذبح کرتے وقت تسمیہ نہیں کہتے تھے)۔

اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ وہ اللہ کا نام لیتے تھے تو اللہ کے نام کا اُن کے ہاں جو مفہوم تھا وہ اللہ بزرگ و برتر کی ذات پاک کے بارے میں مسلمانوں کے مفہوم سے مختلف تھا۔ مسلمان اللہ سبحانہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتقاد رکھتے ہیں جب کہ نصاریٰ تثلیث کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک اِلٰہ کا نام تین اقنوموں کا مرکب ہے یعنی اقنوم الاب، اقنوم الابن اور اُس کلمہ کا اقنوم جو باپ کی جانب سے بیٹے پر ڈالا گیا۔ اُن کے تینوں فرقے یعقوبیہ، نسطوریہ اور ملکانیہ یہی اعتقاد رکھتے ہیں[1]۔ اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ (المائدۃ ۷۳)

(بے شک کافر ہوئے جنہوں نے کہا اللہ ہے تین میں کا ایک)

اسی طرح یہودی بھی حضرت عُزیرؑ کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

---

[1] دیکھیے "الفصل فی الملل والاھواء والنحل"، تالیف علامہ ابن حزم ۳۹/۱

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ (التوبۃ : ۳۰)[1]

(اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے)

لیکن آیتِ کریمہ،

وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (الانعام : ۱۲۱)

(اور اُس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا)

کا کیا جواب ہے جب کہ اہل کتاب کے بارے میں یقین سے یہ بات معلوم ہے کہ وہ اپنے ذبیحے پر اللہ کا نام نہیں لیتے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ کتاب کا طعام اس سے مستثنیٰ ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے ہمیں عام مشرکہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کیا، پھر کتابیہ عورتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ فرما دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ عزاسمہ ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (البقرۃ : ۲۲۱)

(اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لے آئیں)

پھر کتابیہ عورتوں کو اس حکم سے اپنے قول:

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (المآئدۃ : ۵))

(اور پاک دامن عورتیں اُن میں سے جن کو دی گئی کتاب)

کے تحت مستثنیٰ فرمایا۔

یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہے۔ امام مالک بن انسؒ، امام سفیان ثوریؒ، اور امام اوزاعیؒ نے بھی یہی کہا ہے۔ قتادہؒ اور سعیدؒ بن جبیر نے کہا ہے کہ آیت میں وارد لفظ (المشرکات) ہر کافرہ

---

[1] تفصیل امام قرطبی نے امام جریر الطبری سے نقل کی ہے۔ دیکھیے تفسیر قرطبی ۶/۷۶

کے حق میں عام ہے اور اس سے مُراد کتابیات کا خصوص ہے اس خصوص کو آیت سورۃ المائدہ نے بیان کیا ہے۔
یہ قول امام شافعیؒ کے دو اقوال میں سے ایک ہے[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ (الانعام: ۱۲۱)

(اور اُس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا)

پھر اس سے استثنیٰ کیا اور فرمایا:

وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ[2]

(اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے)

اُوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس میں سے مندرجہ ذیل اُمور واضح ہوتے ہیں:

اوّل: اگر کتابی ایسی چیز اپنے لئے مباح ٹھہرائے جو ہماری شریعت میں حرام ہو، جیسے مردار، خون، سُور کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے لئے ذبح کیا گیا ہو یا منخنقہ جانور وغیرہ ..... اور اسے ہمارے سامنے پیش کرے تو ہم اسے رد کردیں گے۔

دوم: اگر مسلم کسی کتابی کو سُنے کہ اُس نے ذبیحے پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا ہے تو وہ اُس ذبیحے کا گوشت نہیں کھائے گا۔ لیکن اگر کتابی نے جانور مسلمان کی غیر موجودگی میں ذبح کیا تو ایسی صورت میں اُس سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ آیا اُس نے ذبیحے پر اللہ یا کسی اور کا نام لیا ہے یا نہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہی قول مروی ہے۔

---

[1] دیکھیے القرطبی ۲/۶۷۔ ابن کثیر ۱/۲۵۷

[2] دیکھیے القرطبی ۶/۷۶

سوم: اگر کتابی نے جانور کسی ایسے طریقے سے ذبح کیا جو مسلمانوں کے طریقے سے مختلف ہے، جیسے کوئی شخص گردن کے بجائے کسی اور جگہ سے ذبح کرے جس سے نہ تو حلقوم کٹے نہ مری اور نہ خون کی رگیں (ودجین) تو ہم ایسے ذبیحے کو رد کر دیں گے کیونکہ اُس کا حکم مُردار کا حکم ہے۔

چہارم: ہم کسی کتابی کے لئے اس امر کو لازم قرار نہیں دے سکتے کہ وہ اپنے ذبیحے پر اللہ کا نام لے، چنانچہ اگر اُس نے جانور ذبح کیا اور اُس پر اللہ کا نام نہیں لیا، تو اُس ذبیحے کا گوشت کھانا ہمارے لئے جائز ہے۔

مندرجہ بالا اقوال فقہاء کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل کتاب کے ذبیحوں کا کھانا مسلمانوں کے لئے مباح ہے۔ یہ حکم کسی خاص مقام یا زمانے سے متعلق نہیں بلکہ ہر مقام اور ہر زمانے کے لئے عام ہے، چونکہ متعلقہ آیت کریمہ مطلق اور واضح ہے۔ لیکن اگر اہل کتاب اپنے جانور مسلمانوں کے معروف طریقے یعنی حلقوم، مریٔ اور خون کی رگیں کاٹنے کے بجائے کسی اور طریقے سے ذبح کریں یا ذبیحے پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیں، اور مسلمان اس کو سن لیں، تو ایسے ذبیحے کا کھانا جائز نہیں۔

ذبائح اہل کتاب کے بارے میں جو چیزیں مسلمانوں کو شک میں ڈالتی ہیں وہ یہ ہیں۔

اوّل: یہ کہ وہ لوگ اپنے ذبیحے پر اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ چیز ایک امر واقع اور محسوس ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

دوم: دوسری چیز اُن کا بجلی کے ذریعہ ذبح کرنے کا طریقہ ہے۔ اس کے متعلق گزشتہ صفحات میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اگر حلقوم، مریٔ اور خون کی رگیں کٹ جائیں، خواہ جانور کو گردن کے پیچھے سے ذبح کیا گیا ہو، تو جمہور فقہاء نے اسے جائز قرار دیا ہے خواہ کراہت کے ساتھ یا بغیر کسی کراہت کے[1]

---

[1] میں نے سنا ہے کہ بعض اسلامی ممالک، جو مغربی ملکوں سے گوشت درآمد کرتے ہیں، وہ اُن ممالک میں عمل ذبح کی نگرانی کرتے ہیں اور اپنے سامنے اسلامی طریقے کے مطابق جانور ذبح کرواتے ہیں۔ میں نے بعض مرغیوں کے گوشت پر بھی یہ لکھا ہوا دیکھا ہے کہ: "اسلامی طریقے کے مطابق ذبح شدہ"۔ اگر یہ صحیح ہے تو ایسے ذبیحوں کا گوشت حلال ہونے میں کوئی شبہ اور اختلاف نہیں۔

جہاں تک ایسے گوشت کے شرعی حکم کا تعلق ہے تو ہم اس کے بارے میں یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ حرام ہے لیکن جہاں تک تقویٰ کے نقطۂ نظر سے اس کے کھانے نہ کھانے کا تعلق ہے تو اگر کسی مسلمان کے دل میں اس کے متعلق شکوک و شبہات راہ پا چکے ہوں تو اس کے لئے افضل اور احسن عمل یہ ہے کہ وہ اس سے اجتناب کرے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ :

"ومن اتقی الشبہات فقد استبرأ لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبہات

وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشک أن یرتع فیہ"[1]

(اور جو شخص بچا شبہے کی چیزوں سے پاک کیا اُس نے اپنے دین کو اور اپنی آبرو کو

اور جو پڑا شبہے کی چیزوں میں پڑے گا حرام میں مانند چرواہے کے کہ چراتا ہے گرد گمی

(چراگاہ ممنوعہ) کے قریب ہے کہ چر پڑیں اس میں جانور...)

علامہ ابن دقیق العید نے کہا ہے کہ :

حدیث مذکور درا صل تقویٰ سے متعلق ہے چنانچہ ہمارے اساتذہ کے اساتذہ کا مسلک اپنے معاصر علماء سے مختلف تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ مباح کے اختیار کرنے میں تقویٰ نہیں ہے کیونکہ مباح تو ہے ہی وہ جس میں جواز اور عدم جواز کے ہر دو پہلو برابر ہوں جبکہ تقویٰ ترک کے پہلو کو ترجیح دینے میں ہے۔ اور کسی ایک جانب کو برابری کے ساتھ ترجیح دینا محال اور دو متضاد باتوں کو جمع کرنا ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

ہماری جانب سے اس کا جواب دو طرح دیا جا سکتا ہے :

۱ - ایک تو اس طرح کہ لفظ مباح کا اطلاق اُس فعل پر ہوتا ہے جس کے کرنے میں کوئی حرج نہ ہو، خواہ اُس کی دونوں طرفین برابر نہ ہوں۔ مباح کی یہ قسم زیادہ عام ہے اور جہاں تک متساوی الطرفین باتوں کا تعلق ہے تو یہی وہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں بار بار گفتگو کی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا : یا تو اولاً کوئی

---

[1] بخاری اور مسلم۔ دیکھیے احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام ۲/۱۸۳

چیز) مباح ہوگی یا نہ ہوگی۔ پس اگر وہ مباح ہو تو مستوی الطرفین ہوگی اور ہم لے اس مفہوم پر محمول نہیں کریں گے کیونکہ مباح متساوی الطرفین سے عام ہوگا اور تساوی پر دلالت نہیں کرے گا کہ اس طرح عام کی دلالت خاص پر ہو جائے گی۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ممکن ہے مباح ذاتی اعتبار سے متساوی الطرفین ہو اور کسی خارجی امر کے اعتبار سے اس کی کوئی ایک طرف راجح ہو۔ اس صورت میں دونوں حکموں میں کوئی تناقض باقی نہیں رہے گا۔

مختصر یہ کہ یہ مسئلہ ایسا ہے جس میں بحث و گفتگو کی گنجائش ہے۔ چنانچہ اگر کسی مشتبہ فعل کا کرنا اخروی زندگی میں سبب ضرر ہو تو وہ متعین ہوگا ورنہ اس کے ترک کو ترجیح دینا متعین ہوگا الّا یہ کہ یہ کہا جائے کہ اس کے ترک سے ثواب ہوگا یا درجات میں ترقی ہوگی لیکن پرہیزگاروں (ورعین) کے افعال سے جو کچھ مفہوم ہوتا ہے یہ بات اس کے خلاف ہے کیونکہ وہ تو اس فعل کو احتیاط کے طور پر اور (اللہ تعالیٰ کے) خوف کی وجہ سے ترک کرتے ہیں اور حدیث کے الفاظ سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ " مَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ " کو دو معنوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ جب کسی کا نفس مشتبہ چیزوں کے بارے میں عدم احتیاط اور انہیں معمولی سمجھنے کے باعث اس کا عادی ہو جاتا ہے تو یہ استہانت اور بے پروائی اس کی طبیعت پر اثر کرتی ہے جس کے باعث وہ جانتے بوجھتے حرام میں جا پڑتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جب کوئی شخص مشتبہ افعال کا ارتکاب کرتا ہے تو فی الحقیقت وہ حرام میں پڑ جاتا ہے۔ اس سبب مشتبہ افعال کرنے سے روک دیا گیا۔[1]

اسی لئے حضرت امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: "میرے نزدیک صاحب تمیز بچے اور حائضہ عورت کا ذبح کرنا اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ کوئی کتابی ذبح کرے۔"

---

[1] احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام ۴/۱۸۲

حاشیہ ابن عابدین میں لکھا ہے کہ: "بہتر یہ ہے کہ نہ اُن کا ذبیحہ کھایا جائے اور نہ ضرورت کے بغیر ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے جیسا کہ علامہ الکمال بن الہمام نے ثابت کیا ہے[1]"

لیکن ایسا کرنا تنزیہ کے طور پر اور شبہات سے بچنے کے لئے ہوگا کیونکہ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم تحریم مطلق کا فیصلہ دیں۔

مناسب ہوگا کہ ہم یہاں قارئین کے استفادے کے لئے اس صدی کے سب سے زیادہ مشہور اور جلیل القدر عالم دین علامہ رشید رضا کا وہ فتویٰ نقل کر دیں جو موصوف نے اس سلسلے میں دیا ہے۔ مرحوم نے لکھا ہے کہ:

"ہم یہ امر وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ یہ مسئلہ (یعنی جانوروں کا ذبح کرنا) نہ تعبدی مسئلہ ہے نہ دین کی روح اور اس کے جوہر کی فروعات اور اس کی جزئیات سے تعلق رکھتا ہے، سوائے اس امر کی تحریم کے کہ جانور کو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا جائے کیونکہ ایسا کرنا بت پرستوں کی عبادت اور مشرکین کے شعائر میں سے ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے حرام کر دیا ہے کہ ہم اس عمل میں اُن کی پیروی کریں یا اُن کے شریک ہوں۔

اگرچہ اہل کتاب نے بہت سی بدعتیں ایجاد کر لی تھیں اور اُن کے دین میں جو بت پرست داخل ہوئے اُن کی وجہ سے بہت سی مشرکانہ رسوم و عادات اُن کے ہاں رواج پا گئی تھیں، خصوصاً نصاریٰ کے ہاں، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ ہم اُن کے ساتھ حسن سلوک سے کام لیں اور اُن سے مشرکین جیسا معاملہ نہ کریں چنانچہ ان کے طعام کو (مشرکین کے طعام) سے مستثنیٰ فرمایا اور اُسے ہمارے لئے بغیر کسی قید اور شرط کے مباح قرار دیا۔ اسی طرح اُن کی عورتوں سے نکاح جائز ٹھہرایا باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ اُن مشرکانہ رجحانات سے آگاہ تھے جو ان کے ہاں پائے جاتے تھے جن کی صراحت اللہ تعالیٰ نے اپنے درج ذیل ارشاد گرامی میں فرمائی ہے۔

---

[1] حاشیہ ابن عابدین ۲۹۸/۶

سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (یونس ۱۸)

(وہ پاک ہے اور برتر ہے اُس سے جس کو شریک کرتے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ مشرکہ عورتوں سے نکاح نص صریح کے ذریعہ ہمارے لئے حرام ٹھہرایا بلکہ اُس ذبیحے کو بھی حرام قرار دیا جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ نکاح کا معاملہ فی نفسہٖ کھانے کے معاملے سے زیادہ اہم ہے۔ مشرکوں کے بارے میں جو عام قطعی نص ہے اُس نے کتابیہ عورتوں سے نکاح ممنوع نہیں ٹھہرایا اور اہل کتاب کا کھانا حلال ہونے کے لئے سورۂ مائدہ میں تفصیل سے مذکور محرمات سے اُس کا استثناء وارد ہوا۔ چنانچہ اُن کا ذبیحہ کھایا جائے گا جب کہ اس پر اجماع ہے کہ اگر کوئی مسلمان نبی یا کعبے کے نام پر ذبح کرے تو اُس کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔ یہ تمام تفصیل امام ابن جریر الطبری کی تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس مسئلے کے متعلق ہم نے المنار میں ابن جریر اور دیگر علماء سے جو کچھ نقل کیا ہے وہ کافی ہے۔

میں نے تفسیر (المنار) میں اپنے اور اہل کتاب کے مابین اس نسبت اور اس سلسلے میں جو کچھ وارد ہوا ہے اور اُن کے ساتھ حسن سلوک اور بھلائی کرنے کی بابت جن اُمور کی جانب سبحانہ تعالیٰ نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے، اُس کے متعلق تفصیل سے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

پس اہل کتاب کا طعام حلال ہونے کی یہ حکمت ہے، نہ یہ کہ وہ لوگ جانور کو کسی خاص طریقے سے ذبح کرتے ہیں یا کسی خاص طریقے سے پکاتے ہیں۔

اگر ہمارے لئے یہ جائز ہوتا کہ ہم کتاب اللہ کی مطلق نصوص کو اس طرح کی تقییدات سے مقید کریں تو ہمارے لئے ضروری ہوتا کہ ہم ہر حکم کا جائزہ لیں اور کہیں کہ: اس کا حلال کرنا یا حرام قرار دینا اُس کیفیت کے ساتھ مقید ہے جو اُس زمانے میں موجود تھی۔ چنانچہ ہم اُسے اس کیفیت کے ساتھ مقید کریں گے جس پر قرن اول کے لوگ اپنی تمام عادات و احوال کے لحاظ سے تھے کیونکہ ان احکام کے مخاطب وہی لوگ تھے اور وہ اس کیفیت پر تھے۔ لیکن اس میں لوگوں کے لئے بڑی مشقت اور حرج ہے۔ اور یہ امر مسلّم ہے کہ کسی نے یہ بات نہیں کہی بلکہ علمائے اصول نے کہا ہے کہ مطلق حکم کو اس کے اطلاق ہی پر رکھا جائے گا۔ اسی وجہ سے ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون سازی یا فیصلے کے وقت

اس امر پر بحث کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں کہ نماز جمعہ یا عیدین کی دو رکعتیں کیوں ہیں یا یہ کہ مسجد کی کیفیت یا جو لوگ اس میں نماز پڑھیں اُن کی کیفیت کیا ہونی چاہیے کیونکہ یہ تو نماز کے صحیح ہونے کی شرطیں ہیں۔[1]

ملاحظہ

اہلِ کتاب کے ذبیحے حلال ہیں، خواہ وہ دارالحرب میں رہتے ہوں یا دارالاسلام میں اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں۔ امام نووی نے کہا ہے کہ ابن المنذر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔[2]

۱۔ فتاویٰ شیخ محمد رشید رضا ۲۵۲/۱-۲۵۴

۲۔ دیکھیے المجموع ۶۸/۹

پانچویں فصل

مباح جانور

یہ فصل دو مباحث پر مشتمل ہے۔

پہلی بحث : کھانے کے لئے اباحت کا اصول

دوسری بحث: اس امر کے بیان میں کہ اشیاء کی اصل اباحت ہے۔

پہلی بحث

اباحت کا اصول

اس بحث میں صرف اُن جانوروں کے بیان پر اکتفا کیا جائے گا جن کے متعلق فقہاء کا اتفاق ہے کہ وہ مباح ہیں لیکن جہاں تک اُن حیوانات کا تعلق ہے جن کے بارے میں فقہاء مختلف الرائے ہیں کہ آیا وہ حلال ہیں یا حرام تو اُن کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ تیسرے باب میں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَآ أُحِلَّ لَهُمْ ۖ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ ٱلطَّيِّبَٰتُ (المائدۃ : ۴)

(تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز اُن کے لئے حلال ہے کہہ دے تم کو حلال ہیں ستھری چیزیں)

طیبات کی تفسیر میں علماء کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ اس سے مراد مباح ذبیحے ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ چیزیں جنہیں عرب پسند کرتے تھے اور وہ حرام نہیں کی گئیں[1]۔

فقہاء کا اس امر پر اجماع ہے کہ تمام شرعی ذبیحے ـــــ جنہیں شرائط مندرجہ بالا کے مطابق ذبح کیا گیا ہو ـــــ اور وہ تمام جانور جنہیں آئندہ بیان ہونے والی شرائط کے مطابق شکار کیا گیا ہو اور جنہیں شارع علیہ السلام نے مباح قرار دیا ہو ـــــ طیبات میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَمَا عَلَّمْتُم مِّنَ الْجَوَارِحِ

مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللهُ (المائدۃ: ۴)

(تم کو حلال ہیں ستھری چیزیں اور جو سدھاؤ شکاری جانور شکار پر دوڑانے کو کہ ان کو سکھاتے ہو اس میں سے جو اللہ نے تم کو سکھایا ہے)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (الاعراف: ۱۵۷)

(اور حلال کرتا ہے اُن کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے اُن پر ناپاک چیزیں)

طیب وہ ہے جسے انسان کی طبیعت پسند کرے اور اُس کی طرف راغب ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ اس مسئلے میں کن لوگوں کی پسندیدگی کا اعتبار کیا جائے گا؟

ائمۂ کرام اس امر پر متفق ہیں کہ وہ لوگ جن کی پسندیدگی اس معاملے میں معتبر ہے، وہ شہروں میں رہنے والے اہلِ حجاز ہیں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہاں رہتے تھے، اس لئے کہ قرآن مجید انہی پر نازل ہوا اور یہی اُس کے مخاطبِ اول تھے۔ بادیہ میں رہنے والے عربوں کا اس معاملے میں کوئی اعتبار نہیں کیونکہ وہ قحط اور ضرورت کے وقت جو کچھ ملتا تھا کھا جاتے تھے چنانچہ ایسی چیزیں جو مسلمانوں کے شہروں میں ملتی ہیں اور اہلِ حجاز اُن سے واقف نہیں،

---

[1] زاد المسیر ۲۹۱/۲

انہیں بلادِ حجاز میں پائی جانے والی چیزوں سے ملا کر دیکھا جائے گا، اگر وہ وہاں کی (مباح) چیزوں سے ملتی جلتی ہوں تو مباح ہیں[1]۔

خشکی پر رہنے والے جانوروں کی دو قسمیں ہیں: انسی اور وحشی (انسان سے مانوس یا پالتو جانور اور غیر مانوس جنگلی جانور) انسی جانوروں میں جن کے حلال ہونے پر فقہاء کا اجماع ہے، گائے، بھیڑ بکریاں اور اونٹ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ (المآئدة ۱:۱)

(حلال ہوئے تمہارے لئے چوپائے)

امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"(اس آیت میں) خطاب اُن تمام لوگوں سے ہے جنہوں نے ایمان کو صحیح طریقے سے اور اُس کی مکمل صورت میں اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ جانوروں کے بارے میں عربوں کے کچھ رواج تھے جن کے مطابق وہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام جانوروں کو (جن کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے) حرام سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی جس نے ان تمام خیالی توہمات اور بے بنیاد آراء کا خاتمہ کر دیا۔"

اس مسئلے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ "بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ" سے کیا مراد ہے۔ اسم بہیمہ کا اطلاق ہر چوپایہ جانور پر ہوتا ہے۔ انہیں بہیمہ کہنے کی وجہ ان کا وہ ابہام ہے جو اُن کے نطق، فہم اور عقل کے نقص اور عدم تمیز کی بناء پر ان میں پایا جاتا ہے۔ الفاظ "باب مبہم" (یعنی بند دروازہ) اور "لیل مبہم" (تاریک رات) اسی سے نکلے ہیں۔

"انعام میں اونٹ، گائے اور بھیڑ بکریاں شامل ہیں۔ انہیں انعام کہنے کی وجہ وہ نرمی ہے جو ان کے چلنے میں پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ .....

---

[1] دیکھیے حاشیہ ابن عابدین ۳۰۵/۶ - المغنی ۵۸۵/۸ - کفایۃ الاخیار ۲۳۰/۲

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ (النحل : ۵-۷)

(اور جو چوپائے بنا دیئے تمہارے واسطے اُن میں جڑاول (جاڑے کا کپڑا) ہے اور کتنے فائدے

اور بعضوں کو کھاتے ہو اور تم کو اُن سے عزت ہے جب شام کو چرا کر لاتے

ہو اور جب چرانے لے جاتے ہو اور اٹھا لے چلتے ہیں بوجھ تمہارے)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا (الانعام: ۱۴۲)

(اور پیدا کئے مواشی میں بوجھ اٹھانے والے اور زمین سے لگے ہوئے)

یعنی بڑے اور چھوٹے۔ سورۃ النحل میں ارشاد ہے:

وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ

ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۸۰

(اور بنا دیئے تم کو چوپاؤں کی کھال سے ڈیرے جو ہلکے رہتے ہیں تم پر جس دن سفر

میں ہو اور جس دن گھر میں اور بھیڑوں کی اون سے اور اونٹوں کی ببریوں سے

اور بکریوں کے بالوں سے کتنے اسباب اور استعمال کی چیزیں وقت مقرر تک)

یہ تین دلیلیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انعام کے لفظ میں اونٹ، گائے اور بھیڑ بکریاں شامل ہیں۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور الحسن کا ہے۔ علامہ ہروی فرماتے ہیں کہ جب لفظ "النعم" (واحد) استعمال کیا جائے تو اس سے خصوصیت کے ساتھ صرف اونٹ مراد ہوتا ہے۔

امام طبری لکھتے ہیں، "بعض لوگوں نے کہا ہے کہ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ سے مراد ہرن، جنگلی گائے اور جنگلی گدھا وغیرہ جیسے حیوانات ہیں۔ یہ قول طبری کے سوا کسی اور شخص نے سُدی ربیع قتادہ اور ضحاک سے نقل کیا ہے۔ گویا کہ کہا گیا: احلت لکم الانعام (حلال ہوئے تمہارے لئے چوپائے) اور اُن میں سے زیادہ خاص جنس کا اضافہ کر دیا

گیا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ یہ حسن کا قول ہے[1]۔

بہتر یہ ہے کہ ہم اس آیت کو اس کے عموم پر محمول کریں۔

فقہاء کا اس امر پر اجماع ہے کہ خشکی پر رہنے والے ہر قسم کے شکار شدہ جانور مباح ہیں سوائے اُن کے جن کی کچلیاں ہوں یا وہ گندے اور پلید سمجھے جاتے ہوں۔

جنگلی جانوروں میں سے جن کے حلال ہونے پر فقہاء کا اجماع ہے اُن میں ہرن اور جنگلی گدھے شامل ہیں اس لئے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو قتادہؓ اور اُن کے ساتھیوں کو اجازت دی تھی کہ وہ اپنا شکار کیا ہوا جنگلی گدھا کھا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر قسم کی جنگلی گائے، اونٹ، تیتل، پہاڑی بکرے، ملہا اور شتر مرغ کے مباح ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

اسی طرح انسی اور وحشی خرگوشوں کی اباحت کے متعلق بھی فقہاء کا اجماع منقول ہوا ہے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی اُس حدیث کے مطابق جس میں کہا گیا ہے کہ: "ہم نے ایک خرگوش کو اس کے بل سے نکالا تو لوگ اُس کے پیچھے بھاگے اور اُس سے کھیلنے لگے، پھر میں اُسے پکڑ کر ابو طلحہ کے پاس لے آیا جنہوں نے اُسے ذبح کیا اور اُس کا گوشت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جسے آپؐ نے قبول فرمالیا"[2]

ہر قسم کے بحری اور بری پرندوں کی اباحت پر بھی فقہاء کا اجماع ہے سوائے اُن کے جو چنگل رکھتے ہوں یا مُردار کھاتے ہوں۔ حلال پرندوں میں مرغی، بطخ، مرغابی، رومی مرغا، ہر قسم کی چڑیاں، جوازل میں سے ہر قسم کے کبوتر اور فاختائیں قرالی، قطاۃ[3]، حجل (مرغی سے ملتے جلتے پرندے) وغیرہ، اسی طرح سارس، غرانیق، (ایک آبی پرندہ جس کا رنگ سفید یا

---

[1] تفسیر القرطبی ۶/۳۲

[2] اس حدیث کو جماعت نے روایت کیا ہے۔

[3] کبوتر جیسا ایک پرندہ جس کی جمع قطا آتی ہے (دیکھیے مصباح المنیر)

سیاہ ہوتا ہے) مور اور حباری[1] شامل ہیں۔

فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ہر قسم کی مچھلی حلال ہے سوائے اُن کے جن کی شکلیں خشکی پر رہنے والے حرام جانوروں سے ملتی جلتی ہوں یا جو خشکی اور تری دونوں جگہ رہتی ہوں۔ ان کی تفصیلی بحث ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں آئے گی۔

دوسری بحث

کیا اشیاء کی اصل اباحت ہے؟

امام خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

علماء کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف رائے ہے کہ آیا اشیاء کی اصل اباحت ہے یا ممانعت (یعنی چیزیں فی الاصل مباح ہیں یا ممنوع) اصول فقہ کے مسائل میں سے یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ چنانچہ بعض فقہاء کی رائے ہے کہ چیزوں کی اصل اباحت ہے اور بعض فقہاء کے خیال میں تمام اشیاء فی الاصل ممنوع ہیں۔ ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ ان دونوں اقوال میں سے کسی ایک قول کا تمام اشیاء پر اطلاق کرنا غلط ہے، کیونکہ یہ امر ضروری ہے کہ بعض چیزیں ممنوع ہوں اور بعض مباح، اور دلیل سے اُن کا حکم اپنے اپنے مقام پر معلوم ہو[2]۔

بعض عراقی فقہاء کی رائے ہے کہ عقلی نقطۂ نظر سے (جانوروں کا) ذبح کرنا ممنوع ہے اس لئے کہ اس عمل سے جانوروں کو ضرر اور تکلیف پہنچتی ہے لیکن شرع نے انہیں حلال قرار دے دیا ہے۔

---

[1] حباری ایک بڑا پرندہ جس کا گوشت پرندوں میں سب سے زیادہ لذیز اور آواز سُریلی ہوتی ہے۔ آج کل اس کا وجود نادر ہے۔ دیکھیے المغنی ۸/۵۹۱-۵۹۲۔

[2] معالم السنن ۴/۲۴۷۔ نیز دیکھیے احکام القرآن تالیف ابن عربی ۱/۱۳-۱۴

شمس الائمہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ خیال باطل ہے، اس لئے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے قبل بھی گوشت تناول فرمایا کرتے تھے اور آپ کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ آپؐ مشرکین کا ذبیحہ کھاتے ہوں کیونکہ مشرکین جانور اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ خود جانور ذبح فرماتے تھے اور اُن کا شکار کرتے تھے[1]۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اشیاء کی اصل اباحت ہے وہ اپنی رائے کی تائید میں درج ذیل آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرۃ: ۲۹)

(وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب)

امام شوکانی فرماتے ہیں کہ ابن کیسان نے کہا ہے: (خلق لکم) سے مُراد ہے تمہارے لئے اور اس میں اس امر کی دلیل پائی جاتی ہے کہ تمام اشیائے مخلوقہ کی اصل اباحت ہے یہاں تک کہ اس اصل سے ہٹنے کے لئے کوئی دلیل قائم ہو جائے۔ اور اس سلسلے میں حیوانات اور دوسری اشیاء کے درمیان، جن سے کسی ضرر کے بغیر فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے کوئی فرق نہیں[2]۔

صحیح بات یہی ہے کہ اصلاً ہر شے مباح ہے جب تک کہ کسی چیز کی تحریم کے متعلق کوئی نص وارد نہ ہو یا اُس کے پیچھے کوئی ضرر نہ ہو۔ یہ جمہور کا قول ہے اور مندرجہ ذیل حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔

"حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] فتح القدیر تالیف کمال بن الہمام ۹/۴۹۷۔ ضروری نہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خود ذبح فرماتے ہوں کیونکہ مشرکین میں ایسے لوگ ابھی موجود تھے جو اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھتے تھے اور ملت حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی پیروی کرتے تھے۔ یہ لوگ نہ تو بتوں کی پوجا کرتے تھے نہ اُن کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے۔ ان کے نام سیرت کی کتابوں میں ذکر کئے گئے ہیں۔

[2] فتح القدیر تالیف علامہ شوکانی ۱/۵۹۔

سے پوچھا گیا کہ مکھن، پنیر اور سمور کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا: حلال وہ ہے جسے اللہ کی کتاب میں حلال قرار دیا گیا ہو اور حرام وہ ہے جو کتاب اللہ میں حرام ٹھہرایا گیا ہو اور جن چیزوں کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے وہ تمہیں معاف کر دی گئی ہیں[1]۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک اور ارشادِ گرامی ہے۔

"مسلمانوں میں جرم کے اعتبار سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے کسی ایسی شئی کے بارے میں سوال کیا جو لوگوں کے لئے حرام نہیں کی گئی تھی اور اس کے سوال کرنے کی وجہ سے حرام ٹھہرا دی گئی[2]۔"

---

[1] ابن ماجہ، ترمذی۔ دیکھیے نیل الاوطار ۱۲۱/۸ ۔

[2] متفق علیہ۔ دیکھیے نیل الاوطار ۱۲۱/۸-۱۲۲ ۔ اور الاشباہ والنظائر تالیف علامہ سیوطی ص ۶۰ ۔

دوسرا باب

شکار

یہ باب مندرجہ ذیل پانچ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

پہلی فصل، صید (شکار) کی لغوی اور شرعی تعریف، صید کا حکم اور محل کتاب و سنت اور اجماع سے اس کی دلیل

دوسری فصل: شکاری سے متعلق اُمور

تیسری فصل: شکار (جانور) سے متعلق اُمور

چوتھی فصل: آلۂ شکار سے متعلق احکام

پانچویں فصل: شکار کی ملکیت کب حاصل ہوتی ہے؟

پہلی فصل

صید (شکار) کی لغوی اور شرعی تعریف،

صید کے حکم اور محل کا بیان، کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ

اور اجماع سے اس کی دلیل

صید کی تعریف

"الصید" ایک اسم ہے جو اُس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جسے شکار کیا جائے، اس لفظ کا اطلاق التصید (یعنی شکار کرنا) کے معنی میں مصدر پر بھی کیا جاتا ہے[1]۔

داؤد بن علی الاصبہانی نے کہا ہے کہ: "صید سے مراد ہر وہ (جانور) ہے جو نا ممکن الحصول ہو، جس کا کوئی مالک نہ ہو، جس کا کھانا حلال ہو۔ پس اگر کسی (جانور) میں یہ سب خصوصیتیں موجود ہوں تو وہ صید (شکار) ہے"[2]۔

تمام پہلی اور بعد میں آنے والی قومیں، خواہ وہ متمدن ہوں یا غیر متمدن، شکار کے عمل سے واقف تھیں، شکار کرتی تھیں اور کھاتی تھیں سوائے برہمنوں اور بعض فلسفیوں کے —— جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا —— جنہوں نے اپنے آپ کو اس نعمت سے محروم کر رکھا ہے۔

---

[1] دیکھیے المصباح المنیر

[2] النظم المستعذب فی شرح غریب المہذب ۱/۲۵۱

جہاں تک عربوں کا تعلق ہے، تو شکار کرنا اُن کا تفریحی شغلہ تھا اور وہ اس کے بہت زیادہ شوقین تھے۔ جو شخص سیر و شکار سے متعلق اُن کے اشعار پڑھے گا اُس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

فقہاء کا اس امر پر اجماع ہے کہ شکار مباح ہے اور درجِ ذیل آیتِ کریمہ کی رُو سے اس کا شمار طیبات میں ہوتا ہے:

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ

صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا (المآئدة: ۹۶)

(حلال ہوا تمہارے لئے دریا کا شکار اور دریا کا کھانا تمہارے فائدے کے واسطے

اور سب مسافروں کے اور حرام ہوا تم پر جنگل کا شکار جب تک تم احرام میں رہو)

مزید ارشاد ہے:

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنتُمْ حُرُمٌ (المائدہ ۵:۱)

(مگر حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں)

مزید ارشاد فرماتے ہیں:

وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا (المائدۃ: ۲)

(اور جب احرام سے نکلو تو شکار کر لو)

علامہ ابن رُشدؒ نے لکھا ہے کہ:

"علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیتِ بالا میں شکار کی ممانعت کے بعد اُس کا حکم دینا اُس کی اباحت پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ علماء کا اتفاق ہے کہ چونکہ ارشادِ باری تعالیٰ:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ (۶۲: ۱۰)

(پھر جب تمام ہو چکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا)

کے بارے میں اتفاق ہے کہ چونکہ اس آیت میں حکم نہی کے بعد واقع ہوا ہے اس لئے اس سے مقصود اباحت ہے۔ اگرچہ اس مسئلے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ ممانعت کے بعد فوری حکم صرف جواز بتلاتا ہے یا اپنی اصل کے مطابق اس سے

وجوب، مفہوم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی (شکار کا مباح ہونا ثابت ہوتا ہے کہ)،

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ (المائدۃ: ۴)

(اور جو سدھاؤ شکاری جانور شکار پر دوڑانے کو)

نیز درج ذیل آیت کریمہ سے،

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ

تَنَالُهٗ أَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ (المائدۃ: ۹۴)

(اے ایمان والو البتہ تم کو آزمائے گا اللہ ایک بات سے اس شکار میں کہ جس پر پہنچتے
ہیں ہاتھ تمہارے اور نیزے تمہارے)

علماء کا اس امر پر اجماع ہے کہ (شکار کا) محل سمندر ہے۔ یعنی اس میں پائی جانے والی ہر قسم کی مچھلیاں، اور خشکی پر رہنے والے حیوانات جن کا کھانا حلال ہو اور جو انسان سے مانوس نہ ہوں[1]۔

سنت سے (شکار کے مباح ہونے کی دلیل) حضرت ابو ثعلبہ الخشنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ حدیث ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:

"میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ہمارے علاقے میں شکار بہت ملتا ہے چنانچہ میں اپنی (تیر) کمان اور اپنے تربیت یافتہ کتے اور اپنے غیر تربیت یافتہ کتے کے ذریعے شکار کرتا ہوں، مجھے بتائیے میرے لئے صحیح کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: جیسا کہ تم نے کہا کہ تم شکار والی زمین میں رہتے ہو، سو جو تم نے اپنی کمان سے شکار کیا اور اس پر اللہ کا نام لے لیا، اسے کھاؤ اور جو تم نے اپنے تربیت یافتہ کتے کے ذریعے شکار کیا اور اس پر اللہ کا نام لے لیا، اسے کھاؤ اور جو تم نے اپنے غیر تربیت یافتہ کتے کے ذریعے شکار کیا اور اس کا تذکیہ

---

[1] بدایۃ المجتہد ۱/۱۳۹ — ۱۴۰۔

لیا اُسے کھاؤ۔ [1]

حضرت عدی بن حاتم سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم تربیت یافتہ کتا چھوڑتے ہیں اور وہ (شکار کو) ہمارے لئے پکڑ لیتا ہے، آپ نے فرمایا: کھاؤ خواہ اُس نے (شکار کو) مار ڈالا ہو لیکن اس میں کوئی دوسرا کتا شریک نہ ہو۔ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس شکار کے بارے میں پوچھا گیا جو معراض (یعنی چپٹے تیر) سے کیا گیا ہو۔ آپؐ نے فرمایا جس شکار میں وہ کھب گیا ہو اُسے کھاؤ اور جو شکار اُس کی عرض یعنی (چپٹی طرف) لگنے سے ہلاک ہو گیا ہو اُسے مت کھاؤ۔"

شکار کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

مباح: جب کہ شکار کا مقصد حصولِ معاش اور کمائی کرنا ہو۔

مندوب: جب کہ اُس کا مقصد اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے خوش حالی اور سہولت کا حاصل کرنا ہو۔

واجب: جب کہ زندگی بچانے کے لئے شکار کیا جائے۔

مکروہ: جب کہ اُس کا مقصد محض تفریح ہو۔

حرام: جب کہ بغیر کسی مقصد کے بیکار کسی جانور کا شکار کیا جائے۔

---

[1] متفق علیہ

دوسری فصل

شکاری سے متعلق اُمور

یہ فصل پانچ مباحث پر مشتمل ہے،

مبحثِ اوّل: شکاری کی اہلیت۔

مبحثِ دوم: شکار کے وقت نیت یا ارادے کا واجب ہونا۔

مبحثِ سوم: کیا شکار کرنے سے پہلے صید (جانور) کا تعین ضروری ہے؟

مبحثِ چہارم: شکار کرتے وقت تسمیہ (یعنی اللہ کا نام لینا) کا واجب ہونا۔

مبحثِ پنجم: شکار کے آداب۔

پہلی بحث

شکاری کی اہلیت

شکاری کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان یا کتابی ہونے کی حیثیت سے اُس میں بھی وہ تمام شرائط پائی جائیں جن کا پایا جانا ذبح کرنے والے میں ضروری ہے اور جن پر ائمہ کا اتفاق ہے یا جن کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے جن کا ذکر پہلے باب میں کیا گیا۔[1]

---

[1] دیکھئے پہلا باب ص۳۶ و مابعد

ان شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے، اور اس پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ جب مسلم اور مجوسی یا بت پرست شکار پر تیر
پھینکیں یا اس پر شکاری جانور چھوڑیں، یا مسلمان کے کتے کے ساتھ مجوسی یا بت پرست کا کتا شکار کے قتل میں شریک
ہو جائے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل ارشاد مبارک کے مطابق وہ شکار حلال نہ ہوگا۔ آپؐ کا ارشاد
ہے کہ:

"جب کہ تو نے اپنا تربیت یافتہ کتا چھوڑا اور اس پر اللہ کا نام لے لیا تو کھا اور اگر تو نے اپنے کتے کے ساتھ
کوئی اور کتا پایا تو (اس شکار کو) نہ کھا کیونکہ تو نے اللہ کا نام اپنے کتے پر لیا تھا، دوسرے کتے پر نہ لیا تھا[1]۔"

(ایسے شکار کا کھانا) اس لئے بھی حرام ہے کہ اس کے قتل میں ایک مبیح (شکار کو مباح کرنے والا) اور ایک محرم
(حرام کرنے والا) کتا شامل ہے لہذا اس میں تحریم کا پہلو غالب آگیا۔ اور چونکہ (اس مسئلے میں) اصل ممانعت ہے لہذا
جب مبیح کے بارے میں شک پیدا ہوگیا تو اسے اصل (یعنی ممانعت) کی جانب لوٹا دیا۔

اگر شکار کو ایک شکاری کا چلایا ہوا تیر لگا اور دوسرے کا نہ لگا تو حکم اس کے تیر پر لگایا جائے گا جس کے تیر سے
ہلاک ہوا۔

فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اگر مجوسی یا بت پرست کسی ایسی چیز کا شکار کریں جس کا تذکیہ کرنا ضروری نہ ہو جیسے
مچھلی اور ٹڈی، تو اس کا کھانا حلال ہے[2]۔

اسی طرح فقہاء کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ شکاری حالت احرام میں نہ ہو۔ اگر کسی نے حالتِ احرام میں شکار
ارشادِ باری تعالیٰ:

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ (المائدۃ: ۹۵)

(اے ایمان والو نہ مارو شکار جس وقت تم ہو احرام میں)

---

[1] دیکھیے حاشیۃ المقنع ۳/۵۲۴ اور المغنی ۸/۵۵۰

[2] متفق علیہ۔ دیکھیے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۷۸

اور

وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا (المائدہ ۹۶)

(اور حرام ہوا تم پر جنگل کا شکار جب تک تم احرام میں رہو)

اور

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ (المائدہ ۱)

(مگر نہ حلال جانو شکار کو احرام کی حالت میں)

کے مطابق اُس کا کھانا اُس پر حرام ہوگا۔ لیکن اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے کہ آیا حالتِ احرام میں شکار کرنے والے کا شکار دوسرے لوگوں کے لئے حلال ہے یا نہیں؟

حضرت امام مالکؒ کی رائے ہے کہ ایسا شکار مُردار کے حکم میں ہے جس کا کھانا نہ حالتِ احرام والے شکاری کے لئے حلال ہے نہ کسی اور کے لئے۔ لیکن حضرت امام شافعیؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ابوثورؒ کی رائے میں اس کا کھانا ایسے شخص کے لئے جائز ہے جو حالتِ احرام میں نہ ہو۔

اس مسئلے میں اختلاف کا سبب یہ مشہور اصل ہے کہ آیا نہی منہی عنہ (جس سے منع کیا گیا ہے یعنی شکار) کے فساد کی طرف لوٹتی ہے یا نہیں؟ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے چور اور غاصب کا ذبیحہ۔[1]

اس رائے پر بھی فقہاء متفق ہیں کہ جو شخص حالتِ احرام میں ہو اس کے لئے کوئی ایسا شکار کھانا حلال نہیں جو اُس کے لئے کیا گیا ہو۔ الا یہ کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص جو حالتِ احرام میں نہ ہو اُس کی اجازت سے شکار کرے جو حالت احرام میں ہو تو اس کا کھانا حالتِ احرام والے شخص کے لئے حلال نہیں۔ لیکن اگر اُس کی اجازت کے بغیر شکار کیا گیا تو اس مسئلے میں دو روایتیں ہیں۔[2]

مندرجہ بالا تمام مسائل خشکی پر رہنے والے شکار سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن جہاں تک بحری شکار کا تعلق

---

[1] دیکھیے بدایۃ المجتہد ۱/۳۴۸

[2] دیکھیے الافصاح ۲۹۶

اس کے بارے میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ محرم (حالتِ احرام والا) بغیر کسی قید اور شرط کے جس وقت چاہے اس کا شکار کر سکتا ہے۔

دوسری بحث

نیت کی شرط

فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ تیر چلاتے وقت یا کتے کو چھوڑتے ہوئے (شکار کی) نیت کرنا ضروری ہے یا نہیں؛ چنانچہ بعض فقہاء نے (نیت کو شکار کے حلال ہونے کی) شرط قرار دیا ہے اور بعض نے اس کی شرط نہیں لگائی۔

جمہور فقہاء کا قول ہے، اور ان میں ائمہ اربعہ حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شامل ہیں، کہ (شکار کے لئے تیر یا کتا) چھوڑتے وقت نیت کرنا شرط ہے، اگر نیت نہیں کی گئی تو شکار کا کھانا حلال نہ ہوگا۔

امام عطاءؒ اور امام اوزاعیؒ کی رائے ہے کہ ایسے تیر اور کتے کا شکار جسے چھوڑتے وقت نیت نہیں کی گئی تھی کھایا جائے گا اگر اس نے شکار کو مجروح کر دیا ہو۔ امام عطاء نے کہا ہے کہ اگر کتے کے لوٹتے وقت اللہ کا نام لے لیا تو شکار مباح ہے انہوں نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ اگر کتے اپنے مرابض (بیٹھنے کی جگہ) سے لوٹتے ہوئے شکار کریں تو آیا اس کا کھانا جائز ہے؟ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اگر اللہ کا نام لے لیا ہو تو کھاؤ۔ اسحٰق نے کہا ہے کہ میں نے یہی قول اختیار کیا ہے جبکہ شکاری جانور کو جان بوجھ کر بسم اللہ پڑھے بغیر نہ چھوڑا گیا ہو۔ خلال نے کہا ہے کہ یہ قول ابوعبداللہ کا ہے۔

جمہور فقہاء کی دلیل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ: "اگر تو نے (شکار پر) اپنا تربیت یافتہ کتا چھوڑا اور اس پر اللہ کا نام لے لیا تو کھا[1]"۔

---

[1] متفق علیہ۔ دیکھیے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۷۸۔ اور حاشیۃ المقنع ۳/۵۵۲

مالکیہ کے نزدیک اگر کسی نے غار یا درختوں کے جھنڈ میں اپنا تربیت یافتہ کتا چھوڑا یا باز، حالانکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس میں شکار ہے اور چھوڑتے وقت (شکار کی) نیت کی، کتا یا باز وہاں داخل ہوا اور اُسے شکار ملا جسے اُس نے مار ڈالا تو اس نیت کے سبب وہ شکار حلال ہے۔ گویا امر غالب کو امر معلوم کے درجے میں کر دیا گیا[1]۔

المغنی میں لکھا ہے کہ اگر کسی نے اپنا کتا چھوڑا، جب کہ نہ اُسے کوئی چیز نظر آ رہی تھی نہ محسوس ہو رہی تھی اور کتے نے کسی چیز کا شکار کر لیا تو وہ شکار مباح نہیں۔ اکثر فقہاء کا یہی قول ہے اس لئے کہ اُس نے اپنا کتا کسی شکار پر نہیں چھوڑا تھا بلکہ وہ کتا از خود گیا تھا۔ اسی طرح اگر کسی نشانے پر تیر مارا گیا اور وہ کسی شکار کو جا لگا، یا تیر شکار کے سر کے اوپر سے چلایا گیا لیکن وہ شکار کو جا لگا جس سے وہ مر گیا تو اُس کا کھانا حلال نہیں کیونکہ اُس جانور کو شکار کرنے کی نیت سے نہیں چلایا گیا تھا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص چھری نصب کرے لیکن اُس سے بکری ذبح ہو جائے (تو اُس کا کھانا حلال نہیں)۔ یہ قول حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا ہے[2]۔

شافعیہ کے نزدیک اگر کسی نے کسی چیز پر یہ گمان کرتے ہوئے تیر چلایا کہ وہ پتھر ہے لیکن وہ شکار تھا جو تیر سے ہلاک ہو گیا تو صحیح مسئلہ یہ ہے کہ اُس کا کھانا حلال ہے کیونکہ اُسے تیر چلانے والے نے اپنے ارادی فعل سے ہلاک کیا ہے[3]۔

اگر کسی نے شکار پر تیر چلایا جسے وہ دیکھ رہا تھا یا نہیں دیکھ رہا تھا لیکن تاریکی میں یا اوٹ کے پیچھے سے اُس کا احساس کر رہا تھا جیسے گھنے درختوں کے پیچھے کوئی شکار ہو اور اُسے شکار کرنے کی نیت کی تو وہ حلال ہے لیکن اگر وہ شکار سے آگاہ نہ تھا اور تیر چلایا درآنحالیکہ وہ شکار کی اُمید نہ رکھتا تھا لیکن تیر کسی شکار کو جا لگا تو صحیح منصوص حکم کے مطابق اُس کا کھانا حلال نہیں[4]۔

---

[1] حاشیۃ الدسوقی ۲/۱۰۴

[2] دیکھیے المغنی ۸/۵۴۵ اور بدائع الصنائع ۷/۴۳-۴۸

[3] دیکھیے المجموع ۹/۱۰۹

[4] المجموع ۹/۱۰۷-۱۰۹

اگر ہرنوں کی کسی ڈار پر تیر چلایا یا کتا چھوڑا اور اُس سے اُن میں سے کسی ایک ہرن کو شکار کرلیا اور اُسے ہلاک کر ڈالا تو وہ کسی اختلاف کے بغیر حلال ہے[۱]۔

تیسری بحث

کیا تیر چلانے یا کتا چھوڑنے سے پہلے شکار کا تعین کرنا ضروری ہے؟

حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب کی رُو سے تیر چلانے یا کتا چھوڑنے سے پہلے شکار کا تعین کرنا (اُس کے حلال ہونے کی) شرط ہے۔ لیکن حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حضرت امام احمدؒ شکار کے تعین کو شرط قرار نہیں دیتے۔ چنانچہ اگر کسی نے ایک حیوان پر جسے وہ دیکھ رہا تھا، تیر چلایا یا اُس پر اپنا کتا یا باز چھوڑا لیکن اُس کے بجائے کوئی دوسرا جانور شکار ہو گیا تو امام مالکؒ کے مذہب کی رُو سے اُس کا کھانا حلال نہ ہوگا۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے مذہب کے مطابق وہ حلال ہوگا۔

حضرت امام شافعی کی رائے ہے کہ جو جانور شکار ہوا اگر وہ اسی سمت میں تھا جس سمت میں شکاری نے تیر چلایا یا کتا چھوڑا تھا تو اُس کا کھانا جائز ہے۔ لیکن اگر کسی دوسری سمت میں تھا تو اس کے متعلق امام شافعی کے اصحاب کی دو رائیں ہیں[۲]۔

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک شکاری کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ (جانور کے شکار ہو جانے کے بعد) اُس تک پہنچنے میں تاخیر نہ کرے۔ چنانچہ اگر اُس نے تاخیر کی اور جانور کو زخم جسم کے (ایسے) نازک مقام پر لگا تھا (جس سے موت واقع ہو جاتی ہے) تو اُس کا کھانا حلال ہے۔ لیکن اگر اُسے زخم کسی عام مقام پر لگا تھا تو اُس کا کھانا حلال نہ

---

[۱] دیکھیے بدائع الصنائع ۶/۲۷۸۸۔ الافصاح ۲۹۸۔

[۲] حاشیۃ الدسوقی ۲/۱۰۴۔ المجموع ۹/۱۰۹۔ المغنی ۸/۵۵۱۔

ہوگا کیونکہ (ایسی صورت میں) یہ بات شکاری کے امکان میں تھی کہ وہ اُسے زندہ پالیتا اور اُسے ذبح کرلیتا۔[1]

چوتھی بحث

اللہ کا نام لینا (تسمیہ)

اس امر میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ شکار پر اللہ کا نام لینا (شکار کے حلال ہونے کی) شرط ہے یا نہیں؟ چنانچہ جمہور فقہاء نے کہا ہے جن میں امام مالکؒ، امام ابوحنیفہ اور امام احمدؒ شامل ہیں کہ شکار پر اللہ کا نام لینا واجب ہے، اس کے بغیر اُس کا کھانا حلال نہ ہوگا۔ تاہم مالکیہ اور ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اگر شکاری نے عمداً تسمیہ چھوڑا تو شکار حلال نہ ہوگا لیکن اگر سہواً رہ گیا تو حلال ہوگا، جیسا کہ ذبح اختیاری میں اُن کا اصول ہے۔

لیکن حنابلہ کی رائے ہے کہ دونوں صورتوں میں حلال نہ ہوگا، خواہ تسمیہ عمداً چھوڑا گیا ہو یا سہواً۔ حنابلہ حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم):

"میری اُمت سے بھول چوک اور جو کام انہوں نے کسی کے جبر سے کیا ہو اُس کی ذمہ داری اٹھائی گئی ہے۔"

کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ (بھول چوک کے باعث) انہیں گناہ نہ ہوگا، لیکن اس سے شرط کی نفی نہیں ہوتی جیسے کوئی شخص نماز کی شرائط میں سے کوئی شرط بھول جائے تو اُسے نماز لوٹانی پڑے گی (اگرچہ گنہگار نہ ہوگا)۔ وہ ذبح اور شکار میں فرق کی علت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا بھول جائے تو ذبیحے کا کھانا حلال ہے لیکن اگر شکار پر تسمیہ بھول جائے تو اُسے نہیں کھایا جائے گا۔ اس لئے کہ ذبح کا عمل اپنے محل پر واقع ہوتا ہے لہٰذا جائز ہے کہ اُس میں تسامح ہوجائے بخلاف شکار کے[2] (کہ اس کی صورت مختلف

---

۱ بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۵

۲ دیکھیے العدۃ ۴۵۸ اور المغنی ۸/۵۴۰

ہوتی ہے)۔

شافعیہ کا ذبح میں جو اصول ہے اُسی کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ شکار پر تسمیہ کہنا (اس کے حلال ہونے کی) شرط نہیں ہاں ذبح کی طرح مستحب ہے۔ صحیح قول کے مطابق شکار پر تسمیہ نہ کہنا مکروہ ہے، جیسا کہ امام نووی نے کہا ہے[1]۔

جہاں تک تسمیہ کہنے کے صحیح وقت کا تعلق ہے تو اس مسئلے میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ تسمیہ تیر چلاتے اور کتا چھوڑتے وقت کہنا چاہیئے، نہ کہ اُس وقت جب کہ وہ جانور کو زخمی کریں۔ اس رائے کی دلیل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب حضرت عدیؓ بن حاتم نے آپؐ سے چپٹے تیر اور کتنے کے ساتھ شکار کرنے کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا:

"جب تو نے چپٹا تیر چلایا اور اُس پر اللہ کا نام لے لیا تو کھا اور اگر تو نے (شکار پر) تربیت یافتہ کتا چھوڑا اور اُس پر اللہ کا نام لے لیا تو کھا[2]۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ ذکاۃ اضطراری میں تسمیہ تیر چلاتے یا شکاری جانور چھوڑتے وقت کیا جائے گا، بخلاف ذکاۃ اختیاری کے کہ اُس میں تسمیہ کا صحیح وقت ذبح کرنے کا وقت ہے۔ یہ اس لئے کہ ذکاۃ اضطراری انسان کا عمل نہیں، نہ بالواسطہ نہ بلا واسطہ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عمل ہے۔ یہ مذہب اہل سنت وجماعت کا ہے۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ اگر کوئی شخص کسی خاص شکار پر کتا چھوڑے یا تیر چلائے اور وہ غلطی سے کسی دوسرے کو جا لگے تو اگر اُس نے تیر چلاتے یا کتا چھوڑتے وقت اللہ کا نام لے لیا تھا، تو جو جانور شکار ہوا وہ کھایا جائے گا۔ لیکن اگر کسی ایک بکری پر اللہ کا نام لیا جائے اور اُسے چھوڑ کر دوسری ذبح کر لی جائے تو اسے نہیں کھایا جائے گا۔ اور اگر کسی بکری کو ذبح کرنے کے لئے زمین پر لٹایا اور اُس پر اللہ کا نام لیا، لیکن ہاتھ کی چھری پھینک کر کوئی دوسری چھری لی اور اُس سے اُسے ذبح کیا تو اس کا کھانا حلال ہوگا[3]۔

---

[1] دیکھیے امام نووی کی شرح مسلم ۱۴۳/۸

[2] متفق علیہ۔ دیکھیے مسلم شرح نووی کے ساتھ ۸/۱۳ ۷

[3] بدائع الصنائع ۶/۲۷۸۵

پانچویں بحث

شکار کے آداب

یہ امر شکار کے آداب میں سے ہے کہ شکاری بغیر کسی مقصد کے بیکار شکار نہ کرے۔ اس لئے کہ اسلام نے مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ جانوروں کے ساتھ رحمت و شفقت کا سلوک کریں۔ چنانچہ جانوروں کو کسی فائدے یا مقصد کے بغیر محض تفریح اور لہو ولعب کے طور پر عبث ہلاک نہ کرنا چاہیئے۔ اور نہ انہیں تیر اندازی یا نشانہ بازی کا ہدف بنانا چاہیئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس شخص نے کسی چڑیا کو بے فائدہ مارا تو وہ قیامت تک چلا چلا کر کہتی رہے گی، اے میرے رب! اے میرے رب! فلاں شخص نے مجھے بلا کسی مقصد کے عبث قتل کیا، کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لئے ہلاک نہیں کیا۔[1]

ایک دوسری حدیث میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی انسان کسی چڑیا یا اس سے بھی معمولی کسی جاندار کو اس کے حق کے بغیر ہلاک کرے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں اس سے باز پرس فرمائیں گے صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ! "اس کا حق" کیا ہے؟ فرمایا: یہ کہ اُسے ذبح کرے اور کھائے، نہ یہ کہ اس کا سر کاٹے اور پھینک دے۔[2]

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر سے منع فرمایا ہے کہ جانوروں کو "باندھا" جائے۔[3]

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ علماء نے کہا ہے: "جانوروں کا باندھنا یہ ہے کہ انہیں زندہ حالت میں

---

[1] احمد اور نسائی۔ دیکھیے نیل الاوطار ۸/۱۵۵۔

[2] اسے نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

[3] متفق علیہ دیکھیے مسلم شرح نووی کے ساتھ ۱۳/۱۰۶۔

ٹانگیں وغیرہ باندھ کر رکھا جائے تاکہ انہیں تیر اندازی کی مشق یا اسی طرح کے دیگر مقاصد کے لئے نشانے یا ہدف کے طور پر استعمال کیا جا سکے یہ حضورؐ کے ارشادِ پاک "کسی ذی روح کو نشانہ یا ہدف نہ بناؤ" کے معنی بھی یہی ہیں کہ کسی زندہ جانور کو ہدف نہ بناؤ کہ اس پر اس طرح تیر باری کرو جس طرح چمڑے وغیرہ کے بنے ہوئے نشانے پر کرتے ہو۔ یہ ممانعت تحریمی ہے۔[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"کسی ذی روح کو تیر باری کے لئے نشانے کے طور پر استعمال نہ کرو۔"[2]

امام صنعانی رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے کہ: اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک پرندے کے پاس سے ہوا جسے لوگوں نے باندھ رکھا تھا اور اس پر تیر باری کر رہے تھے (یہ دیکھ کر آپؐ نے فرمایا کہ) جو شخص ایسا کرے اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور اس ممانعت کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ یہ چیز جانور کے لئے تکلیف دہ ہے اور اس میں اس کی مالیت کا ضیاع ہے۔ اگر وہ ایسا ہو جس کی ذکاۃ کی جاتی، ہو تو اس عمل سے اس کی ذکاۃ ضائع ہو جائے گی۔ اور اگر وہ جانور ایسا ہو جس کا تذکیہ نہیں کیا جاتا تو اس کی منفعت ضائع ہو جائے گی۔[3]

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا گزر قریش کے چند نوجوانوں کے پاس سے ہوا جنہوں نے ایک پرندے کو قابو کر رکھا تھا اور اس پر تیر باری کر رہے تھے ان کے تیروں میں سے جو تیر نشانے پر نہ لگتا وہ مالک پرندہ کی ملکیت قرار پاتا۔ لیکن جب انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کو دیکھا تو منتشر ہو گئے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہؓ ابن عمرؓ نے فرمایا: جس نے ایسا کیا، بے شک حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے جس نے کسی ذی روح

---

[1] مسلم شریف شرح نووی کے ساتھ ۱۰۸/۱۳ ۔

[2] اسے امام مسلم اور ابن ماجہ نے روایت کیا۔ دیکھیے ابن ماجہ ۱۰۶۳/۲ ۔

[3] سبل السلام ۸۵/۴

کو نشانہ بازی کے لئے ہدف بنایا۔[1]

جہاں تک رات کے وقت شکار کرنے کا مسئلہ ہے تو اس کے متعلق امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ آپ سے کہا گیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: "اقروا الطیر علی وکناتہا" (یعنی پرندوں کو اُن کے گھونسلوں میں رہنے دو) تو اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ پہلے لوگ جب کوئی کام کرنا چاہتے تو پرندوں کو اُڑاتے تاکہ اُن سے فال نکالیں۔ چنانچہ اگر پرندہ اڑ کر اُن کی دائیں طرف سے آتا تو کہتے ایسا ہوگا اور اگر بائیں طرف سے آتا تو اُس کے برخلاف فال نکالتے، اس پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پرندوں کو اُن کے گھونسلوں سے نہ اڑاؤ۔[2]

---

[1] اسے امام مسلم نے روایت کیا دیکھیے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۱۰۹

[2] المغنی ۸/۵۵۶

تیسری فصل

شکار (جانور) سے متعلق اُمور

یہ فصل پانچ مباحث پر مشتمل ہے:

پہلی بحث: اُس صورت کا بیان جب کہ جانور کو زخم پہنچے اور وہ فوراً ہی ہلاک ہو جائے۔

دوسری بحث: اُس حالت کا بیان جب کہ جانور زخمی ہونے کے بعد زندہ ہاتھ آجائے۔

تیسری بحث: اُس صورت کا بیان جب کہ جانور زخم پہنچنے کے بعد غائب ہو جائے یا کسی اونچی جگہ سے نیچے لڑھک جائے یا پانی میں گر پڑے۔

چوتھی بحث: اُس جانور کا حکم جس کے جسم کا کوئی حصہ کٹ کر الگ ہو گیا ہو۔

پہلی بحث

اس صورت کا بیان

جب کہ جانور کو زخم پہنچے اور وہ فوراً ہی ہلاک ہو جائے

فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ شکار (جانور) کی ذکاۃ اُسے عقر کرنا (یعنی جسم کے کسی حصے پر زخم لگا کر خون بہا دینا) ہے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ جانور انسان کے قابو میں نہ ہو (اگر قابو میں ہو تو اس صورت میں اُسے ذبح کرنا ضروری ہوگا)۔ چنانچہ اگر جانور کو کسی ہتھیار یا شکاری جانور کے ذریعے سے جسم کے کسی حصے میں زخم پہنچایا، جس سے اُس کا خون بہہ گیا اور وہ فوراً مر گیا تو اُس کا کھانا حلال ہے۔ اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں

پایا جاتا۔

زیر قابو جانور کے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ اُس کا (گلا، غذا کی نالی اور خون کی دونوں رگیں کاٹ کر اُس کا) خون بہایا جائے اور اس طرح اُس کا تذکیہ کیا جائے، لیکن چونکہ شکار کا ذبح کرنا انسان کے مقدور میں نہیں ہوتا، لہٰذا ضروری ہے کہ اُس کے جسم کے کسی حصے (میں زخم پہنچا کر اُس کا) خون بہا دیا جائے تاکہ اُس کا گوشت بہنے والے خون سے پاک ہو جائے۔ علماء کے درمیان یہ اُصول مشہور ہے کہ ضرورت کے وقت سبب مسبب کے قائم مقام ہو جاتا ہے جیسے مشقت کی جگہ سفر، وطی کی جگہ نکاح اور حدث کی جگہ لیٹ کر سونا اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔

یہی حکم اُس انسی جانور کا ہے جو انسان کے قابو سے نکل کر بھاگ گیا ہو (اور جسے ذبح کرنا اب انسان کے لئے ممکن نہ رہا ہو) جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک اُس جانور کا بھی یہی حکم ہے جسے کسی شکاری کُتے یا پرندے نے شکار کیا ہو لیکن شرط یہ ہے کہ اُس نے اس کے جسم پر کہیں نہ کہیں زخم پہنچایا ہو یا اُس کا کوئی عضو توڑا ہو جس سے اُس کا خون بہہ گیا ہو۔

لیکن اگر (شکاری کتے یا پرندے نے) جانور کو زخمی کرنے کے بجائے اُسے دھکا دیا ہو یا زمین پر پٹخا ہو یا اس کا گلا گھونٹ دیا ہو تو ایسی صورت میں حضرت امام ابوحنیفہؒ سے مروی مشہور روایت کے مطابق اُسے نہیں کھایا جائے گا۔ کیونکہ وہ ارشاد باری تعالیٰ،

يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَآ أُحِلَّ لَهُمْ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ ٱلطَّيِّبَٰتُ وَمَا عَلَّمْتُم مِّنَ ٱلْجَوَارِحِ

(تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز اُن کے لئے حلال ہے کہہ دے تم کو حلال ہیں

ستھری چیزیں اور جو سدھاؤ شکاری جانور)

کے مطابق موقوذہ (چوٹ لگ کر مرا ہوا) کے حکم میں ہوگا۔

آیت مذکورۃ الصدر میں لفظ "جوارح" "جراحت (زخم، چیر پھاڑ)" سے مشتق ہے لہٰذا ضروری ہے کہ شکار شدہ جانور کا جسم کہیں نہ کہیں سے زخمی ہوا ہو۔ (ایسے جانور کا کھانا) اس لئے بھی (حرام ہوگا) کہ (جانور کی ذکاۃ کا) ایک رکن

خون کا بہنا ہے جب کہ گلا گھٹ کر یا چوٹ لگ کر مرنے کی صورت میں جانور کا خون نہیں بہتا۔ جب کہ قرآن مجید میں منخنقہ اور موقوذہ جانوروں کو صریح طور پر حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا جانور کے کسی عضو کا ٹوٹ جانا اس کے قائم مقام ہے۔

لیکن حضرت امام شافعی کے نزدیک ارشاد باری تعالیٰ:

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ

(اور جو سدھاؤ شکاری جانور شکار پر دوڑانے کو)

کے عموم کے پیش نظر اگر جانور زخمی نہ بھی ہوا ہو (اور خون نہ بھی نکلا ہو تب بھی) اُس کا کھانا جائز ہوگا[1]

دوسری بحث

اس حالت کا بیان
جب کہ جانور زخمی ہونے کے بعد زندہ ہاتھ آجائے

فقہاء کا اس مسئلے میں بھی اتفاق ہے کہ اگر جانور زخمی ہونے کے بعد زندہ ہاتھ آجائے اور اُس میں حیاتِ مستقرہ باقی ہو،[2] نیز اُس کا ذبح کرنا ناممکن نہ ہو[3] تو اُس کا کھانا صرف اُس صورت میں حلال ہوگا جب کہ اُسے بابِ اول میں مذکور شرائط کے مطابق حلال کر لیا جائے۔ بمطابق ارشادِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام: "اگر تو نے اُسے زندہ پالیا تو اُسے ذبح کر لے" یہ قول حضرت امام شافعیؒ، مالکؒ اور ابو حنیفہؒ کا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب کا صحیح قول بھی یہی ہے۔

امام حسن بصریؒ اور امام نخعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر شکار کو زندہ پالیا لیکن شکاری کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں

---

[1] دیکھیے بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۷۷ - المغنی ج ۸ ص ۵۸

[2] یعنی اُس کی حرکت مطلقاً حرکتِ مذبوح سے بہتر ہو۔

[3] جیسے کسی نے چھری نکالی لیکن جانور ذبح ہونے سے قبل ہی مر گیا۔

جس سے اُسے ذبح کیا جاسکے تو ایسی صورت میں اُسے چاہیئے کہ وہ شکاری کتے وغیرہ کو اُس پر مسلط کر دے تاکہ وہ اُسے ہلاک کر دے جیسا کہ قولِ باری تعالیٰ: فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ [۱] (سو کھاؤ اُس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے) کے عموم سے ظاہر ہوتا ۔ مذہبِ امام احمدؒ کی ایک روایت میں بھی یہی رائے ظاہر کی گئی ہے[۲]

لیکن امام نووی فرماتے ہیں: "اس مسئلے میں فقہاء کا اجماع ہے (کہ جو شکار زندہ ہاتھ آئے اُس کا ذبح کرنا ضروری ہے) اور امام حسنؒ بصری اور امام نخعیؒ سے اس کے برخلاف جو رائے (مذکورہ بالا) نقل کی گئی ہے وہ باطل ہے، میرا گمان نہیں کہ انہوں نے ایسا کہا ہو"

اور اگر جانور اس حالت میں ملا کہ اُس میں حیاتِ مستقرہ باقی نہیں تھی، اس طرح کہ اُس کا گلا اور غذا کی نالی کٹ چکی تھی یا پیٹ پھٹ چکا تھا یا اُس کی آنتیں وغیرہ باہر نکل آئی تھیں تو ایسی صورت میں بغیر ذبح کئے اُس کا کھانا بالاجماع جائز ہے ۔ تاہم بعض فقہاء کی رائے میں جانور کو آرام پہنچانے کے لئے مستحب یہ ہے کہ اُس کے گلے پر چھری پھیر دی جائے[۳]

تیسری بحث

جب کہ شکار زخمی ہو کر غائب ہو جائے یا کسی اونچی جگہ سے نیچے یا پانی میں گر پڑے

اس مسئلے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ اگر کسی نے شکار پر تیر چلایا یا شکاری جانور چھوڑا جس نے شکار کو زخمی کر دیا ۔ لیکن شکار زخمی ہونے کے بعد فوراً ہاتھ نہ آیا بلکہ غائب ہو گیا اور بعد میں ملا تو اُس کا کیا حکم ہے ؟

مالکیہ نے کہا ہے کہ اگر شکار کو زخم جسم کے ایسے نازک حصے پر لگا ہو جس سے موت واقع ہو جاتی ہے تو اُس

---

[۱] المائدہ: آیت ۴

[۲] دیکھیے بدایۃ المجتہد ۱/۳۵۴ - المغنی ۸/۵۴۵ ۔

[۳] شرح مسلم ۱۳/۷۷

کے کھانے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ جانور کو رات گزرنے سے پہلے ڈھونڈ لیا گیا ہو، لیکن اگر رات گزر گئی تو ان کے نزدیک ایسے شکار کا کھانا مکروہ ہے۔ امام مالکؒ ہی سے مروی ایک قول یہ ہے کہ اُسے نہیں کھایا جائے گا خواہ زخم جانور کے کسی نازک حصے ہی پر کیوں نہ لگا ہو۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قیاس یہ کہتا ہے کہ ایسے جانور کو نہیں کھایا جائے گا۔ مذہب شافعی کا مشہور قول یہی ہے اور یہی قول امام داؤدؒ کا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر شکار نظروں سے اوجھل ہو جائے اور کتا اُس کی تلاش میں ہو اور اُسے قتل شدہ حالت میں پالیا جائے تو اُس کا کھانا جائز ہے جب تک کہ کتا اُس کی تلاش ترک نہ کر دے۔ یہی مذہب امام احمدؒ کا ہے۔

اس مسئلے میں اختلاف کا پہلا سبب یہ ہے کہ ایسی صورت میں خود شکار کے بارے میں شک پیدا ہو جاتا ہے کہ آیا یہ وہی شکار ہے جس پر تیر چلایا گیا تھا یا شکاری جانور چھوڑا گیا تھا یا کوئی اور۔

اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اس مسئلے میں سلف سے جو آثار و احادیث مروی ہیں اُن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوثعلبہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ آپؐ سے اُس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جسے اپنا گم شدہ شکار تین دن کے بعد ملے، تو آپؐ نے فرمایا "کھاؤ جب تک کہ اُس میں سڑاند پیدا ہو جائے۔

علامہ شوکانی فرماتے ہیں: "حدیہ مقرر ہوئی کہ جب تک شکار میں سڑاند نہ پیدا ہو جائے اُسے کھاؤ۔ چنانچہ اگر کسی کو اپنا کھویا ہوا شکار تین دن کے بعد اس حالت میں ملا کہ اُس میں سڑاند پیدا نہ ہوئی تھی تو اُس کا کھانا جائز ہے لیکن اس کے برعکس اگر شکار تین دن سے پہلے مل گیا، مگر اُس میں سڑاند پیدا ہو چکی تھی، تو اُسے نہیں کھایا جائے گا حدیث کے ظاہر سے یہی ثابت ہوتا ہے"۔

لہ یہ روایت امام مسلمؒ، احمدؒ، نسائیؒ، ترمذیؒ اور ابو داؤدؒ نے نقل کی ہے۔ دیکھیے شرح صحیح مسلم از علامہ نووی ۱۲/۸۱

امام نوویؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ سڑا ہوا شکار کھانے کی ممانعت پاکیزگی کے نقطۂ نظر سے ہے اگرچہ حدیث کے ظاہر سے حرمت نکلتی ہے۔

لیکن آئندہ کسی باب میں مچھلی سے متعلق وہ حدیث آئے گی جس میں کہا گیا ہے کہ مسلمان لشکر کے لوگ ایک پندرھواڑے تک اس مچھلی کا گوشت کھاتے رہے جسے سمندر نے کنارے پر پھینک دیا تھا۔ اور جب یہ لوگ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس گوشت کا کچھ حصہ آپؐ کو بھی ہدیۃً پیش کیا جسے آپؐ نے تناول فرمایا حالانکہ گوشت اکثر حالات میں اتنی مدت تک سڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔

خصوصاً حجاز کے مقام پر جہاں سخت گرمی پڑتی ہے۔ غالباً یہی حدیث ہے جس سے امام نوویؒ نے سڑے ہوئے گوشت کی کراہیت پر استشہاد کیا ہے۔ لیکن احتمال اس امر کا ہے کہ ان لوگوں نے اس گوشت کو نمک لگا کر سکھا لیا ہوگا جس کی وجہ سے اس میں سڑاند پیدا نہ ہوئی ہوگی۔ جہاں تک مالکیہ کا تعلق ہے انہوں نے سڑی ہوئی چیز کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے[1]

صحیح رائے وہی ہے — اللہ تعالیٰ بہتر جاننے والے ہیں — جس کا ذکر علامہ شوکانی نے کیا ہے اور جو مالکیہ کا قول ہے کہ ظاہر حدیث کے بموجب سڑاند کا پیدا ہو جانا شے کو مطلقاً حرام کر دیتا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ سڑاند خبائث میں سے ہے اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ویحرم علیہم الخبائث (آپؐ ان کے لئے خبیث چیزوں کو حرام ٹھہرانے والے ہیں)۔

طب جدید کی رو سے بھی سڑی ہوئی اشیاء کا کھانا صحیح نہیں اس لئے کہ ایسی چیزیں صحت کے لئے نقصان دہ ہیں۔

جہاں تک اس مچھلی کا تعلق ہے جس کا گوشت صحابہؓ پندرہ دن تک کھاتے رہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اس گوشت کو نمک لگا کر سکھا لیا ہوگا، کیونکہ یہ بات عقل میں نہیں آسکتی کہ مچھلی کا گوشت گرم ممالک میں

---

[1] نیل الاوطار ۸/۱۵۴-۱۵۵

اتنی مدت تک بغیر کسی تغیر کے باقی رہے۔

حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تو اپنا تیر چلائے اور یہ پتا نہ چلے کہ شکار کہاں گرا تو کھا جب تک کہ رات نہ گزر جائے" (یعنی اگر رات گزرنے سے پہلے پہلے شکار مل جائے تو اُس کا کھانا جائز ہے)[1]

حضرت عدیؓ بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تو شکار میں اپنا چلایا ہوا تیر لگا پائے اور اُس میں کسی درندے (کے پہنچائے ہوئے زخموں) کا کوئی نشان نہ ہو اور تو یہ جان لے کہ اُس کی موت تیرے تیر سے واقع ہوئی تو تو اُسے کھا"[2]

اسی بنیاد پر حنابلہ نے اس مسئلے میں دو شرطیں ضروری قرار دی ہیں یعنی:

اوّل: یہ کہ شکاری کا چلایا ہوا تیر یا اُس کا نشان جانور کے جسم میں پایا جائے۔ اس شرط پر حنابلہ بہت زور دیتے ہیں۔

دوم: یہ کہ جانور کے جسم پر شکاری کے چلائے ہوئے تیر کے علاوہ کسی اور چیز کا نشان نہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جب تک تو اپنے تیر کے علاوہ اس میں کوئی اور نشان نہ پائے"[3]

اسی طرح اُس شکار کے بارے میں بھی علماء کے درمیان اختلاف ہے جو تیر لگنے یا شکاری جانور کے حملے سے زخمی ہو کر پانی میں یا کسی اونچے مقام سے نیچے گر پڑے (اور مر جائے)۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اگر جانور کو زخم ایسے نازک حصۂ جسم پر لگے کہ اُس کی موت یقینی ہو اور ایسا کوئی شک موجود نہ ہو کہ جس چیز سے اُس کی موت واقع ہوئی وہ زخمی کرنے والا آلہ یا شکاری جانور ہے نہ کہ پانی میں

---

[1] یہ روایت امام مسلمؒ نے نقل کی ہے۔ دیکھیے صحیح مسلم بشرح النووی ۸۱/۱۳

[2] دیکھیے بدایۃ المجتہد ۴۴۶/۱۔ نیز دیکھیے المجموع ۱۰۵/۹

[3] اسی مفہوم کی احادیث دارقطنی اور نسائی میں بھی روایت کی گئی ہیں۔ نیز دیکھیے المغنی ۵۵۵/۸

یا اونچائی سے گرنا، تو اُس کا کھانا جائز ہے۔ لیکن اگر زخم کسی نازک حصے کے بجائے دوسرے عام حصے پر لگا ہو تو اُسے نہیں کھایا جائے گا کیونکہ ایسی صورت میں شکاری کو معلوم نہ ہوگا کہ شکار کی موت زخم پہنچانے والے آلے یا شکاری جانور کے زخم پہنچانے سے ہوئی یا پانی میں یا اونچائی سے نیچے گرنے کے باعث۔ یہی قول جمہور فقہاء کا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر جانور زخمی ہونے کے بعد پانی میں گر پڑے تو اُسے نہیں کھایا جائے گا، خواہ زخم جسم کے کسی نازک حصے پر لگا ہو۔ لیکن اونچائی سے گرا ہوا جانور کھایا جائیگا خواہ زخم اس کے نازک حصۂ جسم کے بجائے کسی اور حصے پر لگا ہو۔

امام عطاءؒ کی رائے ہے کہ ایسا شکار ہرگز نہیں کھایا جائے گا، خواہ وہ زخمی ہونے کے بعد بلندی سے نیچے گرا ہو یا پانی میں جا پڑا ہو اور خواہ زخم اُس کے جسم کے کسی نازک حصے پر لگا ہو یا کسی اور حصے پر، کیونکہ ممکن ہے اُس کی روح نیچے گرنے کی وجہ سے نکلی ہو۔ مذہب امام احمدؒ کی مشہور رائے یہی ہے اور یہی قول حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے[1]۔

تمام فقہاء کا اس مسئلے میں اتفاق ہے کہ اگر شکار ایسا زخم کھانے کے بعد، جو اُسے حرکت مذبوح تک پہنچانے والا نہ ہو، (یعنی زخم معمولی ہو) پانی میں یا بلندی سے نیچے گر کر مر جائے تو وہ مُردار ہے جس کا کھانا جائز نہ ہوگا، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"جب تم شکار پر تیر چلاؤ تو اللہ کا نام لو، پھر اگر تم دیکھو کہ شکار مر چکا ہے تو کھاؤ، الا یہ کہ تم اُسے پانی میں پڑا ہوا پاؤ، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ اُس کی موت پانی سے واقع ہوئی یا تمہارے تیر سے[2]۔"

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ اگر تیر لگنے سے جانور حرکت مذبوح کرنے لگے یعنی تڑپنے لگے تو اُس کا کھانا جائز ہے کیونکہ ایسی صورت میں یہ معلوم ہو جائے گا کہ اُس کی موت تیر لگنے ہی سے واقع ہوئی[3]۔

---

[1] دیکھیے بدایۃ المجتہد ۱/۲۷۷، اور نیل الاوطار ۸/۱۵۲، اور المغنی ۸/۵۵۵

[2] متفق علیہ، دیکھیے صحیح مسلم امام نووی کی شرح کے ساتھ ۱۳/۷۹

[3] دیکھیے نیل الاوطار ۸/۱۵۳

اسی طرح فقہاء کا اس مسئلے میں بھی اتفاق ہے کہ اگر شکار زخمی ہونے کے بعد پانی میں اس طریقے سے گرے جس سے اس کی موت واقع نہ ہوتی ہو جیسے مثلاً اُس کا سر پانی سے باہر رہے یا یہ کہ وہ آبی پرندہ ہو جو پانی سے ہلاک نہیں ہوتا یا یہ کہ اُس کا گرنا ایسا ہو جس سے اس قسم کا حیوان ہلاک نہیں ہوتا تو ایسی تمام صورتوں میں اُس کا کھانا حلال ہوگا۔ اُس کی اباحت کے سوال پر فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔[1]

اگر کسی نے ہوا میں اڑتے ہوئے شکار کو تیر مارا اور وہ زخمی ہو کر زمین پر گرا (اور مر گیا) تو اُس کا کھانا جائز ہے۔ یہ قول جمہور فقہاء کا ہے جن میں شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ شامل ہیں۔

لیکن مالکیہ کہتے ہیں کہ اُس کا کھانا جائز نہ ہوگا الّا یہ کہ اُسے جو زخم پہنچا ہو وہ ایسا ہو جس سے اُس کی موت کا واقع ہونا یقینی ہو یا یہ کہ وہ گرنے سے پہلے مر چکا ہو۔[2]

اسی طرح اُس شکار کے مباح یا غیر مباح ہونے میں بھی اختلاف ہے جو گری ہوئی درانتی پر آ کر گرا ہو۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور جمہور فقہاء نے اُس کا کھانا ممنوع قرار دیا ہے لیکن حضرت حسنؒ بصری اور امام احمدؒ نے اسے کھانے کی اجازت دی ہے۔

اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ جو جانور جال یا رسی کے ذریعے ہلاک ہو جائے اُس کا کھانا حرام ہے۔[3]

انہی مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شکار پر تیر چلائے جس سے وہ مقعر (زخمی) ہو جائے، پھر دوسرا تیر مارے جس سے وہ ٹھہر جائے، پھر تیسرا تیر مارے جس سے وہ ہلاک ہو جائے تو اس مسئلے کا فیصلہ اس طرح کیا جائے گا کہ اگر وہ تیر جس سے شکار کی موت واقع ہوئی شکار کی ذبح کرنے کی جگہ پر لگا ہو تو اُس کا کھانا جائز ہوگا۔

---

[1] دیکھیے حاشیہ المقنع ۳/۵۴۹

[2] حاشیہ المقنع ۳/۵۴۹

[3] دیکھیے بدایۃ المجتہد ۱/۳۴۶، اور المغنی ۸/۵۵۸، اور المجموع ۹/۹۸-۱۰۶

لیکن اگر مقام ذبح کے بجائے کسی اور جگہ لگا تو کھانا حلال نہ ہوگا اس لئے کہ جب دوسرا تیر لگنے کے باعث وہ رک گیا تھا تو اُس وقت وہ قابو میں آگیا تھا اور ذبح کیا جا سکتا تھا اور زیرِ قابو جانور کو ذبح کئے بغیر اُس کا کھانا حلال نہیں۔ ائمہ اربعہ کا مذہب یہی ہے[1]۔

چوتھی بحث

اُس جانور کا حکم جس کا کوئی عضو کٹ کر الگ ہو گیا ہو

اگر کسی شکار ہونے والے جانور کا کوئی عضو کٹ کر الگ ہو جائے تو اس کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے یہ ہے کہ جس وقت کسی جانور کا کوئی عضو کٹ کر الگ ہوا اگر اُس وقت اُس جانور میں حیاتِ مستقرہ باقی تھی تو کٹے ہوئے عضو کا کھانا حلال نہ ہوگا کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: زندہ جانور کے جسم سے کاٹا ہوا گوشت مُردار ہے[2]۔

لیکن اگر کسی جانور کا کوئی حصہ کاٹا گیا اور وہ جانور فوراً مر گیا تو سارے جانور کا گوشت (یعنی کٹا ہوا حصہ اور باقی ماندہ جسم) حلال ہے خواہ جانور دو مساوی حصوں میں کاٹا گیا ہو یا کوئی حصہ بڑا اور کوئی چھوٹا ہو۔ یہی قول امام شافعیؒ کا ہے اور عکرمہؒ، نخعیؒ اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی یہی منقول ہے[3]۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر اُس حصے سے، جو شکار کے جسم سے کٹ کر الگ ہوا، شکار کی موت واقع ہو گئی تو شکار

---

[1] المغنی ۸/۵۶۰۔

[2] اس حدیث کو امام احمدؒ، ترمذیؒ، ابو داؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے اسی مفہوم میں روایت کیا ہے۔
دیکھیے نیل الاوطار ۸/۱۶۴۔

[3] دیکھیے الروضہ ۳/۲۴۲۔

اور کٹا ہوا حصہ دونوں حلال ہیں لیکن اگر الگ ہونے والے حصے سے جانور کی موت واقع نہ ہو تو وہ حصہ حلال نہ ہوگا لیکن اصل شکار (یعنی شکار ہونے والے جانور کا اصل جسم) حلال ہوگا۔

حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: اگر (شکار کو) دو مساوی نصف حصوں میں کاٹا جائے یا سر کی طرف والا حصہ دُم کی طرف والے حصے سے کم ہو تو (دونوں حصوں کا) کھانا جائز ہے۔ لیکن اگر دُم کی طرف والا حصہ تھوڑا ہو تو اس حصے کا کھانا جائز نہ ہوگا جب کہ سر کی طرف والے (یعنی بڑے) حصے کا کھانا حلال ہوگا[1]۔

اگر کوئی عضو کٹ کر جلد کے ساتھ لٹکا رہے تو اُس کا کھانا امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حلال نہیں۔ لیکن اگر کٹا ہوا عضو گوشت کے ساتھ معلق ہو تو اُس کا کھانا حلال ہے[2]۔

اس مسئلے میں ائمہ کے درمیان اختلافِ آراء کا سبب وہ تعارض ہے جو حدیثِ نبویؐ۔

مَا قُطِعَ مِنَ الْبَهِيمَةِ وَهِيَ حَيَّةٌ فَهُوَ مَيْتَةٌ

(زندہ جانور کے جسم سے کاٹا ہوا گوشت مردار ہے)

اور قولِ باری تعالیٰ عزاسمہٗ۔

فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ

(سو کھاؤ اس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے)

تَنَالُهُ[4] أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ

(بس پر پہنچتے ہیں ہاتھ تمہارے اور نیزے تمہارے)

---

[1] دیکھیے حاشیہ المقنع ۳/۵۵۰، اور بدائع الصنائع ۶/۲۷۷۵

[2] دیکھیے حاشیہ المقنع ۳/۵۵۰، اور بدائع الصنائع ۶/۲۷۷۵

[3] المائدہ: آیت ۴۔

[4] المائدہ: آیت ۹۴۔

کے عموم میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے شکار کے حکم کو، جو مطلق ارادہ کرتا ہے، غالب رکھا ہے، اُن کے نزدیک شکار کا کھانا بھی جائز ہے اور شکار کے کٹے ہوئے عضو کا کھانا بھی۔ ان لوگوں نے حدیث کے حکم کو پالتو جانوروں پر محمول کیا ہے۔

اور جن لوگوں نے اس حدیث نبوی کو وحشی اور انسی دونوں قسموں کے جانوروں پر محمول کیا ہے اور ارشادِ باری تعالیٰ کے عموم کا کٹے ہوئے عضو والی حدیث سے استثنا کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ شکار کھایا جائے گا لیکن کٹا ہوا نہیں کھایا جائے گا۔ اور جن لوگوں نے ارشادِ نبوی " وھی حیۃ " (اور وہ زندہ ہو) کے مطابق شکار میں حیاتِ مستقرہ کا اعتبار کیا ہے، انہوں نے موت کا سبب بننے والے اور نہ بننے والے عضو کے درمیان فرق کیا ہے۔[۱]

تاہم فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف رائے نہیں کہ زندہ مچھلی کا جو گوشت کٹ کر الگ ہو جائے اُس کا کھانا حلال ہے، اس لئے کہ مچھلی کو ذبح کرنا ضروری نہیں۔

---

[۱] بدایۃ المجتہد ۱/۳۲۸

چوتھی فصل

آلۂ شکار سے متعلق احکام

آلۂ شکار کی دو قسمیں ہیں:

(الف) دھاردار (آلات)

(ب) شکاری (جانور اور پرندے)

دھاردار آلہ ہائے شکار میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں، جو دھار والی ہوں جیسے تیر، نیزہ اور تلوار وغیرہ۔ چنانچہ فقہاء کا اس امر پہ اتفاق ہے کہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ان چیزوں کے ذریعے مارا ہوا شکار حلال ہے: [1]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ

مومنو! کسی قدر شکار سے جن کو تم ہاتھوں اور نیزوں سے پکڑ سکو اللہ تمہاری آزمائش کرے گا۔

احادیث نبوی:

۱۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چپٹے تیر (معراض) کے ذریعہ مارے ہوئے شکار کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: اگر تیر شکار کو چوڑائی کے رخ لگا ہو تو تم اُسے نہ کھاؤ، کیونکہ اس صورت میں وہ وقیذ[2] (یعنی چوٹ لگ کر مرے ہوئے جانور کے حکم میں ہوگا)۔

۲۔ حضرت ابو ثعلبہ الخشنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] المائدہ۔ آیت نمبر ۹۴۔ دیکھئے روضۃ الطالبین ۲/۲۴۴

[2]: صحیح بخاری اور مسلم۔ دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۷۷

ان سے فرمایا: جو جانور تم اپنے تیر کمان کے ذریعے شکار کرو اس پر اللہ کا نام لو اور کھاؤ"۔ [۱]

لیکن جہاں تک وزن دار چیزوں کا تعلق ہے یعنی لوہے یا رانگ وغیرہ کی ایسی چیزیں جن کی دھار نہ ہو، یا مٹی کی بنی ہوئی گولیاں، تو ایسی کوئی چیز اگر شکار کو ماری گئی اور (اس کی ضرب سے) وہ مر گیا تو اس کا کھانا حلال نہ ہوگا کیونکہ اس کی موت کا سبب چوٹ کا لگنا ہوگا، خواہ اس کی جلد پھٹی ہو یا نہ پھٹی ہو، اور خواہ اس کا سر کٹا ہو یا نہ کٹا ہو۔

اسی طرح اس شکار کا کھانا بھی حلال نہیں جو کسی دھاردار آلے کی دھار کے بجائے اس کے بوجھ سے ہلاک ہوا ہو۔ یہی حکم اس شکار کا ہے جو کسی گڑھے میں گر کر مر جائے یا کسی رسی سے اس کا گلا گھٹ جائے یا اسے کوئی ایسا تیر لگے جس کی نہ پیکان ہو نہ دھار، یا اسے تیر چپٹی جانب سے لگے، یا تلوار (کی دھار کے بجائے اس) کے بوجھ سے مرے تو ایسے تمام جانور موقوذہ کے حکم میں ہونے کے باعث حرام ہوں گے۔ کسی مقتول جانور کا کھانا حلال نہیں۔

اسی طرح وہ جانور جسے معراض[۲] (یعنی بے پر کا تیر) چپٹی جانب سے لگا ہو اور اس سے وہ ہلاک ہو گیا ہو تو ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "اگر تم شکار پر معراض چلاؤ اور وہ اس کے جسم کو پھاڑ دے (یعنی اس میں کھب جائے) تو اسے کھاؤ اور اگر وہ اس کو چپٹی جانب سے لگے تو نہ کھاؤ" کے مطابق اس کا کھانا حلال نہیں۔ [۳]

یہ رائے حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام ثوریؒ کی ہے، لیکن شام کے فقہاء میں سے امام اوزاعیؒ اور امام مکحولؒ کے نزدیک معراض کے ذریعے مارا ہوا شکار کھانا مطلقاً جائز ہے۔

---

[۱]: صحیح بخاری اور مسلم، دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۸۰/۱۳

[۲]: معراض ایک بھاری لکڑی یا عصا جس کا ایک یا دونوں سرے نوکدار ہوتے تھے اور کبھی کبھی ان میں لوہا بھی جڑا ہوا ہوتا تھا۔

[۳]: صحیح مسلم، دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۷۵/۱۳

اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے کا سبب یہ ہے کہ ایک تو یہاں ایک اُصول کا دوسرے اصول سے تعارض ہو رہا ہے ۔ اور دوسرے حضرت عدیؓ بن حاتم سے مروی مذکورہ بالا اثر اس اُصول سے متعارض ہے۔ یعنی اس مسئلے میں اُصول یہ ہے کہ وقیذ (یعنی چوٹ لگ کر مرا ہوا جانور) کتاب و سنت اور اجماع اُمت کے مطابق حرام ہے۔ دوسری جانب یہ بھی ایک اصول ہے کہ شکار کا عقر (یعنی زخمی ہو جانا) اس کی ذکوٰۃ (ذبح ہو جانا) ہے۔ چنانچہ جو فقہاء یہ سمجھتے ہیں کہ معراض کی ضرب سے مرا ہوا شکار وقیذ ہے، انہوں نے اسے مطلقاً ممنوع ٹھہرایا ہے۔ اور جن فقہاء نے معراض کے ذریعے لگی ہوئی چوٹ کو عقر سمجھا ہے، جو شکار کے ساتھ مخصوص ہے، انہوں نے اس کا کھانا مطلقاً جائز ٹھہرایا ہے۔ اور وقیذ کو غیر معتبر سمجھا ہے۔ اسی طرح جن فقہاء نے ایسے جانور جس کا جسم پھٹ گیا ہو اور ایسے جانور جس کا جسم نہ پھٹا ہو، کے درمیان فرق کیا ہے انہوں نے حضرت عدیؓ سے مروی مندرجہ بالا حدیث کے پیش نظر ایسا کیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی یہ رائے صحیح ہے۔ [1]

اسی طرح احادیث میں کنکریوں کے ذریعے شکار کی ممانعت آئی ہے جیسا کہ حضرت عبداللہؓ بن مغفل سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کے ذریعے شکار سے منع فرمایا اور کہا کہ وہ نہ کسی چیز کا شکار کرتی ہیں نہ دشمن کو دکھ پہنچاتی ہیں، بلکہ دانتوں کو توڑتی اور آنکھوں کو پھوڑتی ہیں [2]

امام صنعانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"کنکریوں کے ذریعے مارے ہوئے شکار کی حرمت کے بارے میں بھی ایسا ہی اختلاف ہے جیسا بھاری اشیاء کے ذریعے کئے ہوئے شکار کی نسبت بیان ہوا، اس لئے کہ کنکریاں شکار کو اپنے بوجھ سے ہلاک کرتی ہیں، نہ کہ دھار سے۔ چنانچہ حدیث میں کنکریوں کے ذریعے شکار کی ممانعت وارد ہوئی ہے اس لئے کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ مذکورہ برائی کا خوف ہوتا ہے اور اس سے جو برائی ہے وہ سب اس سے متعلق ہو جاتی ہے۔

فقہاء کے درمیان اس شکار کے بارے میں اختلاف رائے ہے جسے غلّے (یعنی مٹی کی بنی ہوئی گولی)

---

۱ : سبل السلام ۴/۸۴

۲ : متفق علیہ۔ دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۱۰۶

کے ذریعے مارا گیا ہو۔ چنانچہ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ: "شکار کو غلّے اور کنکریاں مارنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس پر قابو پایا جائے۔ اور اکثر صورتوں میں خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے ہلاک نہیں ہوگا۔ چنانچہ اگر شکاری ایسے شکار کو پالے اور اسے ذبح کر لے تو یہ جائز ہے۔ جیسا کہ بڑے پرندوں کو غلّوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے (اور انہیں پکڑ کر ذبح کر لیا جاتا ہے) جہاں تک اس مسئلے میں حضرت ابن عمرؓ کے اثر کا تعلق ہے تو وہ وہ ہے جو امام بیہقی نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے "مقتولہ بھی موقوذہ ہے"۔ یہاں مقتول جانور سے حضرت ابن عمرؓ کی مراد وہی جانور ہے جسے غلّے کے ذریعے ہلاک کیا گیا ہو۔ اور جہاں تک امام نووی کے قول کا تعلق ہے وہ اس جانور کے بارے میں ہے جو (غلّے یا کنکر سے) ہلاک نہ ہو بلکہ (زخمی ہونے کے باعث) شکاری کی دسترس میں آجائے اور وہ اسے ذبح کر لے۔ سلف کے اکثر فقہاء کی رائے ہے کہ جو شکار غلّے کی ضرب سے ہلاک ہو جائے اس کا کھانا حلال نہیں کیونکہ وہ وزن دار چیز کے وزن سے ہلاک ہوا ہے [1]

گوپھن اور منشاب[2] کے ذریعے مارے ہوئے شکار کا بھی وہی حکم ہے جو کنکریوں کے ذریعے مارے ہوئے شکار کا، یعنی اس کا کھانا بھی حلال نہیں

اگر شکار دو ایسی چیزوں کے لگنے سے مرا جن میں سے ایک اُسے حرام کرنے والی تھی اور دوسری مباح کرنے والی، مثلاً اس طرح کہ اس کی موت ایک غلّے اور ایک تیر کے لگنے سے واقع ہوئی جو اس پر ایک یا دو شکاریوں نے چلایا تھا، یا اُسے تیر کی پیکان کا کنارہ لگا جس سے وہ زخمی ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ وہ تیر گزرتے ہوئے چوڑائی کے رُخ اس سے ٹکرایا اور ان دونوں کے صدمے سے شکار مر گیا، یا کسی شخص نے شکار پر تیر چلایا اور وہ (زخمی ہو کر) کسی چھت کے کنارے یا پہاڑ پر گرا اور پھر وہاں سے لڑھکتا ہوا نیچے آرہا اور مر گیا تو ایسے تمام جانور حرام ہیں، ان کا کھانا حلال نہیں۔ [3]

اگر کوئی شخص شکار کو زہر آلود تیر کا نشانہ بنائے جس سے وہ مر جائے تو اس کا کھانا حلال نہ ہوگا،

---

[1] سبل السلام ۴/۸۵۔ دیکھئے حاشیۃ المقنع ۳/۴۸۵، و بدایۃ المجتہد۔

[2] ان دونوں آلات میں پتھر رکھ کر چلائے جاتے ہیں اور شکار کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔

[3] روضۃ الطالبین ۳/۲۴۴

کیونکہ اس صورت میں غالب گمان یہ ہوگا کہ اس کی موت زہر کے سبب واقع ہوئی۔ [1]

آتشیں بندوقیں

جہاں تک آج کل کی آتشیں بندوقوں کا تعلق ہے ان کے ذریعے مارے ہوئے شکار کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں علماء کرام کی جو آراء ہیں انہیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں :۔

امام صنعانی فرماتے ہیں :

"آج کل جو بندوقیں زیر استعمال ہیں، اُن کے ذریعے رانگ (کی بنی ہوئی گولیاں) چلائی جاتی ہیں۔ یہ گولیاں جب بندوق سے نکلتی ہیں تو بارود کی آگ کی وجہ سے سلائی کی (سی نوکدار) شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ چنانچہ یہ شکار کو اپنی نوک سے مارتی ہیں نہ کہ صدمے یا دباؤ سے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ذریعے مارا ہوا شکار کھانا حلال ہے۔ [2]

فتاویٰ شیخ محمد رشید رضا میں لکھا ہے :

"علاوہ ازیں رانگ کی گولی کے زیر استعمال آنے کے بعد مشرق و مغرب کے بہت سے علماء نے اس امر کا فتویٰ دیا ہے اور اس مسئلے میں رسائل لکھے ہیں کہ رانگ کی گولی سے مارا ہوا شکار حلال ہے۔ ان علماء میں تونس کے نامور حنفی عالم شیخ بیرم، اہل حدیث کے امام شوکانی جن کا شمار یمن کے مجتہد علماء میں ہوتا ہے اور ہندوستان کے سید صدیق حسن خان شامل ہیں، جو وہاں کی جدید دینی و علمی تحریک کے بانی ہیں۔ سید صدیق حسن خان اپنی کتاب "الروضۃ الندیہ" جو امام شوکانی کی کتاب "الدرۃ البہیہ" کی شرح ہے، کے شکار سے متعلق باب میں لکھتے ہیں کہ : حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراض (یعنی بے پر کے چپٹے تیر) کو جارح (شکاری پرندے) کے مماثل قرار دیا ہے جب کہ وہ شکار کو لگے اور (اُس کے جسم کو) پھاڑ دے۔ اس معاملے میں حضورؐ نے مجرد جسم کے پھٹ جانے کو کافی قرار دیا ہے جیسا کہ حضرت عدیؓ بن حاتم کی مذکورہ حدیث میں ہے، یہ حدیث صحیحین میں بھی مذکور ہے۔

---

[1] : المقنع ۳/ ۵۴۸

[2] : سبل السلام ۴/ ۸۵

امام احمدؒ بن حنبل نے حدیثِ عدیؓ بن حاتم کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے وہ یہ ہیں (حضرت عدیؓ) فرماتے ہیں: "میں نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم لوگ تیرکمان کے ذریعے شکار کرتے ہیں کیا (اس کا کھانا) ہمارے لئے حلال ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: "جس شکار کو تم زندہ حالت میں پکڑ کر) ذبح کرلو تو وہ تمہارے لئے حلال ہے اور جس پر تم اللہ کا نام لے کر (تیر چلاؤ) اور تیر لگنے سے (اس کا جسم) پھٹ جائے تو اسے کھاؤ"۔ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجرد (جسم کے) پھٹ جانے کو کافی قرار دیا۔

پس جس جانور کو آج کل کی جدید آتشیں بندوق کی رانگ اور بارود سے بنی ہوئی گولی کا نشانہ بنایا جائے، اس کا کھانا حلال ہوگا۔ کیونکہ رانگ کی گولی دیگر اقسام کے ہتھیاروں سے زیادہ جانور کے جسم کو پھاڑتی ہے۔ لہٰذا اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو (جسم کو پھاڑنے والے) دوسرے ہتھیاروں کا۔

کتاب "الشفا" کے حاشیے میں امام شوکانی نے اس مسئلے کی نسبت جو کچھ لکھا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:
"میں کہتا ہوں جن آلات کے ذریعے شکار کھیلنا جائز ہے، ان میں یہ جدید طرز کی بندوقیں بھی شامل ہیں، جن کے ذریعے بارود اور رانگ (کی بنی ہوئی گولیاں) چلائی جاتی ہیں۔ کیونکہ ان گولیوں کے ذریعے (جانور کا جسم) اس سے زیادہ پھٹتا ہے جتنا تیر یا نیزے یا تلوار کے ذریعے پھٹتا ہے۔ اس معاملے میں گولی کی کارکردگی دیگر تمام آلات کی کارکردگی پر فوقیت رکھتی ہے"۔ اس کی ایک مثال بیان کرنے کے بعد امام شوکانی مزید لکھتے ہیں: "اور غلّے کے ذریعے مارا ہوا شکار کھانے کی جو ممانعت احادیث میں وارد ہوئی ہے، جیسا کہ امام احمدؒ کے نزدیک حضرت عدیؓ بن حاتم کی روایت (تو اس کا مطلب یہ ہے کہ) غلّے کے ذریعے مارا ہوا شکار مت کھاؤ الّا یہ کہ تم اُسے (زندہ حالت میں پکڑ کر) ذبح کرلو"۔

یہاں غُلّۂ بندقہ سے مراد ایسی گولیاں ہیں جو مٹی سے بنائی جاتی ہیں، اور سوکھنے کے بعد انہیں (غلیل یا گوپھیا وغیرہ میں رکھ کر) چلایا جاتا ہے اس کے بعد امام شوکانیؒ نے کنکریوں کے ذریعے شکار کا حکم بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ بھی مٹی کی بنی ہوئی گولیوں کی طرح ہیں [1] (یعنی ان کا حکم بھی وہی ہے جو مٹی کی گولیوں کا)

---

[1]: فتاویٰ الشیخ محمد رشید رضا ۴/۱۴۹۹ - ۱۵۰۰

امام شوکانی رحمہ اللہ تعالیٰ فتح القدیر میں لکھتے ہیں :

"جہاں تک آج کل کی مروجہ بندوقوں کا تعلق ہے، یعنی وہ بندوقیں جن میں بارود اور رانگ بھر کر انہیں چلایا جاتا ہے، ان کے ذریعے مارے ہوئے شکار کے بارے میں اہل علم نے کچھ نہیں کہا، جب کہ وہ مر جائے اور شکاری کے لئے یہ ممکن نہ ہو کہ اسے زندہ پکڑ کر ذبح کرے۔ (اس مسئلے میں) مجھ پر جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے شکار کا کھانا حلال ہے۔ کیونکہ (گولی اس کے جسم کو) پھاڑ دیتی ہے اور ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل جاتی ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اگر تم (شکار پر) معراض چلاؤ اور وہ اس کے جسم کو پھاڑ دے تو اسے کھاؤ"۔ (اس حدیث میں) شکار کے حلال ہونے کے لئے اس امر کو کافی قرار دیا گیا ہے کہ اس کا جسم پھٹ جائے۔[1]

علامہ ابن عابدین نے۔ جن کا شمار مشہور ترین متاخر علمائے احناف میں کیا جاتا ہے۔ رانگ کی گولی کے ذریعے مارے ہوئے شکار کے جواز میں ایک رسالہ تالیف کیا ہے۔ اسی طرح مالکی علماء میں سے جن لوگوں نے ایسے شکار کو مباح قرار دیا ہے، ان میں علامہ شمس الدین الدسوقی، علامہ ابو البرکات احمد الدردیر، ابو عبداللہ القوری، ابن غازی، شیخ منجور، عبدالرحمٰن الفاسی اور شیخ عبدالقادر الفاسی شامل ہیں۔

حق یہ ہے کہ آج کل کی مروجہ بندوقوں کے ذریعے مارا ہوا شکار کھانا حلال ہے، کیونکہ ان کی گولی جانور کے جسم کو پھاڑ دیتی اور اس میں سوراخ کر دیتی ہے۔ اور یہی وہ بات ہے جو مطلوب ہے۔

لیکن جہاں تک چھوٹی بندوقوں کا تعلق ہے، جن میں رانگ کے بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے چھرے بھرے جاتے ہیں جن کے سرے نوکدار نہیں ہوتے اور جن کے ذریعے پرندوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے تو ان کے معاملے میں تجربہ کار لوگوں سے رائے لی جائے گی۔ اگر وہ یہ کہیں کہ یہ چھرے بھی شکار کے جسم کو پھاڑ دیتے ہیں اور اس میں سوراخ کر دیتے ہیں تو ان کے ذریعے مارا ہوا شکار بھی اسی طرح حلال ہوگا جیسے بڑی بندوق کی گولی سے مارا ہوا شکار۔ لیکن اگر ان کے لگنے سے شکار کے جسم میں سوراخ نہ ہو، بلکہ وہ

[1] : فتح القدیر ۹/۲

صرف اڑنے سے لاچار ہو جائے، تو اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ ایسے شکار کا کھانا حرام ہے جب کہ وہ جبڑہ لگنے سے مر جائے، کیونکہ وہ موقوذہ کے حکم میں ہے۔ لیکن اگر ابھی اس میں جان باقی ہو اور اسے پکڑ کر ذبح کر لیا جائے تو اس کے حلال ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

آلۂ شکار کی دوسری قسم

آلۂ شکار کی دوسری قسم شکاری جانور ہیں جنہیں دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی ایک تو شکاری جانور جو اپنی کچلیوں سے شکار کرتے ہیں، اور دوسرے شکاری پرندے جن کا ذریعہ شکار اُن کے پنجے ہیں۔

شکاری جانور

علمائے کرام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ اور احادیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق کالے کتے کے سوا دوسرے کتوں کے ذریعہ کیا ہوا شکار کھانا حلال ہے:

آیت کریمہ:

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ (المائدہ: آیت نمبر ۴)

اور وہ (شکار) بھی حلال ہے جو تمہارے لئے ان شکاری جانوروں نے پکڑا ہو جن کو تم نے سدھا رکھا ہو۔

احادیث مبارکہ:

۱۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا "جب تم اپنا سدھایا ہوا کتا شکار پر چھوڑو اور اس پر تم نے اللہ کا نام لے لیا ہو تو جو (شکار) وہ تمہارے لئے پکڑ لے اُسے کھاؤ لیکن اگر کتے نے (شکار میں سے) کچھ کھا لیا تو تم اسے نہ کھاؤ کیونکہ (اس صورت میں) مجھے خوف ہے کہ کتے نے شکار اپنے لئے پکڑا تھا۔ اور اگر (شکار کے پکڑنے میں) تمہارے کتے کے ساتھ دوسرے کتے بھی شامل ہو جائیں تو تم اسے نہ کھاؤ کیونکہ اللہ کا نام تم نے اپنے کتے پر لیا تھا نہ کہ دوسرے کتوں پر۔"[1]

۲۔ دوسری حدیث کے مطابق حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ثعلبہ الخشنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

---

[1] متفق علیہ، دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/ ۷۸

سے فرمایا: "تم اپنے تیر کمان سے جو شکار کرو اور اس پر اللہ کا نام لے لو تو اسے کھاؤ، اور جو شکار تم اپنے سدھائے ہوئے کتے کے ذریعے کرو، اور اس پر اللہ کا نام لے لو تو اسے کھاؤ، اور جو شکار تم اپنے ایسے کتے کے ذریعے کرو جو سدھایا ہوا نہ ہو تو (ایسا شکار اگر تمہیں زندہ حالت میں مل جائے) اور تم اسے ذبح کر لو تو کھاؤ۔" [۱]

جہاں تک کالے کتے کا تعلق ہے، جمہور فقہاء، جن میں حضرت امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ شامل ہیں، اس میں اور دوسرے کتوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کے نزدیک کالے کتے کے ذریعے بھی شکار کھیلنا جائز ہے۔

لیکن امام احمدؒ بن حنبل کالے کتے کے ذریعے شکار کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ ان کا قول ہے میں کسی ایسے عالم کو نہیں جانتا جس نے اس کی اجازت دی ہو۔ اسی طرح حضرت امام حسن بصری، ابراہیم نخعیؒ اور قتادہؒ نے بھی کالے کتے کے ذریعے شکار کو مکروہ ٹھہرایا ہے۔

جمہور علماء جنہوں نے کالے کتے کے ذریعے شکار کو مطلقاً جائز ٹھہرایا ہے، انہوں نے آیت کریمہ "وما علمتم من الجوارح مکلبین" اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ بالا دونوں حدیثوں کے عموم سے استدلال کیا ہے۔ کیونکہ نہ تو اس آیت کریمہ میں کالے اور دوسرے رنگ کے کتوں کے درمیان فرق کیا گیا ہے، نہ مذکورہ بالا دونوں احادیث میں۔ چنانچہ اگر کالے کتے کو سدھا لیا گیا ہو تو اس کا مارا ہوا شکار کھانا جائز ہے۔

لیکن جن فقہاء نے کالے کتے کے ذریعے شکار کو حرام یا مکروہ ٹھہرایا ہے، انہوں نے اپنی رائے کی بنیاد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیث کو بنایا ہے، جس میں کالے کتے کو مار ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی: "کتوں میں سے ہر کالے کتے کو مار ڈالو۔" گویا اس کا سیاہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اسے مار ڈالا جائے۔ جیسے کہا جاتا ہے: جب تم کسی ہتھیار بند کو دیکھو تو اسے قتل کر دو کیونکہ وہ مرتد

---

[۱] متفق علیہ، دیکھیے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۸۰

ہے۔ گویا (قتل کی) علت ارتداد ہے۔ چنانچہ جن فقہا کی یہ رائے ہے کہ نہی منہی عنہ کے فساد پر دلالت کرتی ہے، ان کی رائے میں قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ کالے کتے کا مارا ہوا شکار حرام ہو۔[1]

ائمہ کرام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ شکاری کتے میں مندرجہ ذیل باتوں کا پایا جانا ضروری ہے:

(الف) شکار پر اس وقت لپکے جب اسے چھوڑا جائے

(ب) جب اسے روکا جائے تو رُک جائے۔

(ج) ائمہ ثلاثہ یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ شکار میں سے خود کچھ نہ کھائے۔ لیکن امام مالک کے نزدیک یہ ضروری نہیں۔

چنانچہ اگر کتے نے شکار میں سے کھایا اور سوائے تھوڑے حصے کے کچھ باقی نہ رہا تو اس باقی ماندہ حصے کا کھانا جائز ہے۔ یہ قول حضرت سعدؓ بن وقاص، عبداللہ بن عمرؓ، سلمانؓ فارسی اور حضرت ابوہریرہؓ کا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے۔[2]

اس باب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو حدیثیں مروی ہیں۔ ایک تو وہی حدیث عدیؓ جس میں آپ نے فرمایا: "اگر (کتا شکار میں سے) کھالے تو تم نہ کھاؤ، کیونکہ (اس کا مطلب یہ ہے) کہ اس نے شکار اپنے لئے پکڑا۔

اور دوسری حدیث حضرت ابوثعلبہ الخشنی والی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کے ذریعے شکار کے بارے میں فرمایا: "اگر تم اپنے کتے کو شکار پر چھوڑو اور اس پر تم نے اللہ کا نام لیا ہو تو اسے کھاؤ خواہ کتے نے اس میں سے کچھ کھا لیا ہو اور کھاؤ جو لوٹائے تمہارا ہاتھ تمہاری طرف[3] (یعنی جو کچھ تمہیں ملے اسے کھاؤ)۔

فقہائے مالکیہ نے ان دونوں حدیثوں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ پہلی کو تنزیہ پر محمول کیا ہے اور دوسری کو جواز پر

---

١ : دیکھئے بدایۃ المجتہد ١/ ٣٢٤ نیز حاشیۃ المقنع ٢/ ٥٥٠۔ اور دیکھئے تفسیر قرطبی ٦/ ٦٩

٢ : دیکھئے روضۃ الطالبین ٣/ ٢٤٦۔ المغنی ٨/ ٥٤٢۔ حاشیۃ الدسوقی ٢/ ١٠٤

٣ : یہ حدیث امام ابوداؤدؒ نے روایت کی ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ٨/ ١٢٩۔

انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت عدیؓ چونکہ کھاتے پیتے آدمی تھے۔ لہذا حضورؐ نے انہیں فتویٰ دیا کہ وہ ازراہِ احتیاط نہ کھائیں اور حضرت ابو ثعلبہؓ کو آپؐ نے اجازت دی کہ وہ کھالیں، کیونکہ وہ غریب آدمی تھے۔

ابو عمرؒ نے کتاب الاستذکار میں لکھا ہے کہ:

"حضرت ابو ثعلبہؓ کی یہ حدیث حضرت عدیؓ والی حدیث سے متعارض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اس کی ناسخ ہے، کیونکہ جب حضرت ابو ثعلبہؓ نے یہ پوچھا کہ یا رسول اللہ (کیا اس صورت میں بھی کھالوں جب کہ کتے نے شکار میں سے کچھ) کھا لیا ہو؟ تو آپؐ نے فرمایا "خواہ کھا لیا ہو"۔

امام قرطبیؒ نے کہا ہے کہ یہ رائے محلِ نظر ہے، کیونکہ (دونوں حدیثوں کی) تاریخ نامعلوم ہے، لہذا جب تک تاریخ معلوم نہ ہو دونوں حدیثوں کو جمع کرنا بہتر ہے واللہ اعلم۔

حضرت امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ اگر کتا شکار میں سے کچھ اس لئے کھائے کہ وہ بھوکا تھا تو ایسے شکار کا کھانا جائز ہوگا، کیونکہ کتے نے ایسا اپنی تربیت میں نقص کی وجہ سے کیا لیکن اگر کتا بھوکا نہ ہو اور اس کے باوجود کھالے تو ایسے شکار کا کھانا جائز نہ ہوگا۔[۱]

اگر کتا شکار کا صرف خون چاٹے (اور گوشت نہ کھائے) تو جمہور فقہاء کے نزدیک اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ خون کا پینا (گوشت کا) کھانا نہیں۔ لیکن امام شعبیؒ اور سفیان ثوریؒ نے کہا ہے کہ اس سے شکار مکروہ ہو جائے گا۔

اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلافِ رائے نہیں کہ شکاری جانور کا شکار کو زخمی (مقرر) کرنا کسی شک و شبہہ کے بغیر ثابت ہونا چاہئے، کیونکہ اگر (یہ بات) ثابت نہ ہو تو اس کا کھانا جائز نہ ہوگا۔[۲]

(د) فقہائے احناف اور شافعیہ نے شکاری کتے کے لئے چوتھی شرط یہ ضروری قرار دی ہے کہ وہ شکار کو اپنے مالک کے لئے پکڑے اور چھوڑے نہیں۔[۳]

چنانچہ اگر سدھایا ہوا شکاری کتا از خود شکار پر لپکا اور اسے مار ڈالے تو اس کا کھانا حرام ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ

---

[۱] ۔ دیکھئے تفسیر قرطبی ۷۰/۶

[۲] ۔ دیکھئے تفسیر قرطبی ۷۰/۶

[۳] ۔ دیکھئے روضۃ الطالبین، ۲۲۹/۳ ۔ المجموع ۸۳/۹ ۔ بدائع الصنائع ۲۰۹۲/۶

امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، اور امام ثوریؒ کا مسلک یہی ہے۔ لیکن امام عطاءؒ نے کہا ہے کہ اگر کتے کے لوٹتے وقت اس پر اللہ کا نام لے لیا جائے تو اس کا مارا ہوا شکار کھانا جائز ہوگا۔ اس مسئلے میں امام عطاءؒ کی دلیل ان کی وہ حدیث ہے جو انہوں نے اپنی سندوں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ جب حضرت ابن عمرؓ سے ایسے کتوں کے بارے میں سوال کیا گیا جو اپنے باڑوں سے لوٹتے ہوئے کسی جانور کا شکار کر لیں، تو انہوں نے فرمایا اگر اس پر اللہ کا نام لے لیا جائے تو کھاؤ۔"

اسحاق نے کہا ہے کہ یہ مسئلہ اس صورت میں ہے جب کہ کتے کو جان بوجھ کر اللہ کا نام لئے بغیر چھوڑا گیا ہو (یعنی اگر کتے کو جان بوجھ کر اللہ کا نام لیے بغیر چھوڑا گیا تو اس کے مارے ہوئے شکار کا کھانا حلال نہ ہوگا خواہ واپسی میں اس پر اللہ کا نام لے لیا جائے)۔

الخلال نے کہا ہے کہ یہ قول ابوعبداللہ کا ہے۔

اس مسئلے میں جمہور فقہاء کی دلیل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے کہ "جب تم اپنا سدھایا ہوا کتا شکار پر چھوڑو اور اس پر اللہ کا نام لے لو، تو کھاؤ۔"[1]

اگر نا تربیت یافتہ کتا شکار کو پکڑ لے اور اس میں ابھی جان باقی ہو اور اسے ذبح کر لیا جائے تو اس کا کھانا جائز ہے۔ لیکن اگر کتے نے شکار کو مار ڈالا تو اب وہ مردار ہوگیا جس کا کھانا حلال نہیں۔ اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنا شکاری کتا شکار پر چھوڑے، لیکن شکار کے قریب پہنچ کر یہ دیکھے کہ اس کے کتے کے ساتھ ایک یا دو کتے اور بھی ہیں (جنہوں نے شکار مارا ہے) تو ایسے شکار کا کھانا جائز نہ ہوگا، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "اگر (شکار کے پکڑنے میں) تمہارے کتے کے ساتھ دوسرے کتے بھی شامل ہو جائیں تو ایسا شکار تم نہ کھاؤ۔"

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی وارد ہیں: "تم نے اللہ کا نام اپنے کتے پر لیا تھا نہ کہ دوسرے کتوں پر۔"

اگر دو اشخاص اپنا اپنا کتا شکار پر چھوڑیں اور وہ دونوں مل کر شکار کریں تو اس کا کھانا جائز ہوگا اور وہ دونوں میں برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔ اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں۔[2]

---

[1] ۔ متفق علیہ دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۷۵ ۔ حاشیہ المقنع ۳/۵۵۴

[2] ۔ متفق علیہ دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۷۵، حاشیہ المقنع ۳/۵۵۴

کیا کتّے کے سوا، دیگر سدھائے ہوئے حیوانات جیسے چیتا، تیندوا اور بلّی وغیرہ کے ذریعے شکار کھیلنا جائز ہے؟۔

جمہور فقہاء کے نزدیک اس مسئلے میں کتے اور مذکورہ بالا دیگر حیوانات کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اگر یہ جانور ان تمام شرائط کو پورا کریں جو کتوں کے لئے گزشتہ صفحات میں بیان ہوئیں تو ان کے ذریعے بھی شکار کھیلنا جائز ہے۔ چاروں ائمہ اس رائے پر متفق ہیں۔

تاہم بعض فقہاء کے نزدیک کتوں کے سوا، دیگر جانوروں کے ذریعے شکار کھیلنا جائز نہیں۔

اس مسئلے میں علماء کرام کے درمیان اختلاف رائے کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ میں "جوارح" (شکاری) کا جو لفظ آیا ہے، آیا اس کا اطلاق ایسے تمام شکاری جانوروں پر ہوتا ہے جنہیں سدھایا جا سکتا ہو اور جن کی تعلیم و تربیت ممکن ہو یا یہ لفظ کتے کے ساتھ خاص ہے؟

چنانچہ جن فقہاء نے آیت میں وارد لفظ "مکلبین" سے سدھائے ہوئے جانور مراد لئے ہیں، انہوں نے چیتے تیندوے اور بلّی وغیرہ کو بھی اس میں شامل سمجھا ہے۔ اور جنہوں نے یہ کہا کہ "مکلبین" کا لفظ کلب سے مشتق ہے انہوں نے شکار کو صرف کتوں میں منحصر قرار دیا ہے۔[1]

شکاری جانور کو سدھایا ہوا کب سمجھا جائے گا کہ اس کے ذریعے شکار کھیلنا جائز ہو؟

اس کے جواب میں جمہور فقہاء نے یہ کہا ہے کہ شکاری جانور کو اتنی مرتبہ تعلیم دینا ضروری ہے کہ اس کے بارے میں یہ ظن غالب پیدا ہو جائے کہ وہ سیکھ گیا ہے۔ رہا تعداد کا تعین تو اس کا فیصلہ تجربہ کار لوگ کریں گے۔ یہ قول جمہور فقہاء کا ہے۔

حنابلہ کے نزدیک تین مرتبہ کی تکرار ضروری ہے۔ بعض فقہاء کا خیال ہے کہ دو مرتبہ کی تکرار کافی ہے۔[2]

تعلیم کے بعد اس امر کی تکرار ضروری نہیں کہ کتا شکار میں سے کچھ نہ کھائے۔ چنانچہ اگر تعلیم کے بعد اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا، تو اس سے پہلے اس نے جو شکار مارا تھا وہ حرام نہ ہوگا۔ اکثر اہل علم کا قول یہی ہے۔

لیکن جس شکار میں سے کتے نے کچھ کھا لیا ہو، اس کے بارے میں شافعیہ اور حنابلہ کے دو قول ہیں جن میں سے مشہور

۱۔ دیکھئے بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۴۔ المغنی ۸/۵۴۵

۲۔ دیکھئے الروضہ ۳/۲۴۴۔ المغنی ۸/۵۴۵

قول یہ ہے کہ اسے نہیں کھایا جائے گا۔ یہ قول حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے اور یہی امام عطاؒ، طاؤسؒ، عبیدؒ بن عمیرؒ، شعبیؒ، سعیدؒ بن مغفل، ابوبردہؒ، سعیدؒ بن جبیر، عکرمہؒ، ضحاکؒ، قتادہ، اسحاقؒ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ نے کہا ہے۔

دوسرے قول کے مطابق ایسے شکار کا کھانا جائز ہے۔ یہ قول حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، سلمانؓ، ابوہریرہؓ اور ابن عمرؓ سے مروی ہے، اور یہی حضرت امام مالکؒ نے کہا ہے۔

اس رائے کے حامل فقہاء نے ارشاد باری تعالیٰ: "فکلوا مما امسکن علیکم" اور حضرت ابو ثعلبہؓ سے مروی مذکورہ بالا حدیث سے استدلال کیا ہے۔

لیکن جن فقہاء نے ایسا شکار کھانے کو ممنوع ٹھہرایا ہے، انہوں نے حدیث عدیؓ بن حاتم سے استدلال کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم اپنا سدھایا ہوا کتا شکار پر چھوڑو اور اس پر اللہ کا نام لے لو تو جو شکار وہ تمہارے لئے پکڑے اسے کھاؤ" (حضرت عدیؓ فرماتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! خواہ (اس نے شکار کو) مار ڈالا ہو؟ (حضورؐ نے) فرمایا: خواہ اس نے مار ڈالا ہو، الا یہ کہ کتے نے اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو، چنانچہ اگر کتے نے کچھ کھایا ہو تو تم نہ کھاؤ، کیونکہ مجھے خوف ہے مبادا اس نے شکار اپنے لئے پکڑا ہو۔[1]

اس رائے کے حامل فقہاء کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جو چیز (کتے کے) پہلے شکار کے لئے شرط تھی، وہ اس کے ہر شکار کے لئے شرط ہوگی۔

اپنی رائے کے مخالف فقہاء کی پیش کردہ آیت کریمہ "فکلوا مما امسکن علیکم" کا جواب دیتے ہوئے یہ فقہاء کہتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق اس شکار سے نہیں جس میں سے کتے نے خود کچھ کھایا ہو کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے "مما امسکن علیکم" (جو اس نے تمہارے لئے پکڑا ہو) اور یہاں تو اس نے بلاشبہ اپنے لئے پکڑا ہے۔[2]

[3] شکار کے جس حصے کو کتے نے اپنے منہ سے پکڑا ہو، شافعیہ اور حنابلہ کے صحیح قول کے مطابق اسے دھو لینا چاہیئے

[1] ۔ متفق علیہ، دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۷۵۔ حاشیہ ۔ الدسوقی ۲/۱۰۴

[2] ۔ دیکھئے حاشیہ المقنع ۳/۵۵۲

[3] دیکھئے المقنع ۳/۵۵۲ ۔ الروضہ ۳/۲۴۸

شکاری پرندے

شکاری پرندوں سے مراد ایسے پرندے ہیں جنہیں تربیت دے کر شکار کے لئے سدھالیا جائے جیسے باز، شکرہ عقاب اور شاہین۔

جمہور فقہاء کی رائے ہے کہ اگر ان پرندوں کو سدھالیا جائے اور یہ شکار کریں تو ان کے مارے ہوئے شکار کا کھانا جائز ہے۔

بعض فقہاء کے نزدیک صرف باز کے ذریعے شکار کھیلنا جائز ہے باقی پرندوں کے ذریعے نہیں۔

کچھ فقہاء نے کہا ہے کہ کسی پرندے کے ذریعے شکار کرنا جائز نہیں، جیسا کہ کتے کے ذریعے شکار کے مسئلے میں پہلے بیان ہوا کہ کتے کے سوا کسی جانور کا مارا ہوا شکار کھانا حلال نہیں۔ یہ قول امام مجاہد کا ہے۔

چنانچہ جن فقہاء نے تمام اقسام کے شکاری جانوروں اور پرندوں کے ذریعے شکار کھیلنے کو جائز ٹھہرایا ہے، انہوں نے ان تمام جانوروں اور پرندوں کو کتے پر قیاس کیا ہے کہ جس طرح سدھائے ہوئے کتے کے ذریعے شکار کرنا جائز ہے، اسی طرح دیگر سدھائے ہوئے جانوروں اور پرندوں کے ذریعے شکار کرنا بھی جائز ہے، اور جن علماء نے کتے کے سوا دیگر جانوروں کے ذریعے شکار کو ممنوع ٹھہرایا ہے۔ انہوں نے آیت کریمہ مذکورہ بالا سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ اس آیت میں "مکلبین" کا جو لفظ آیا ہے وہ کلب سے مشتق ہے، لہذا صرف سدھائے ہوئے کتوں کے ذریعے شکار کھیلنا جائز ہے۔ اور جن فقہاء نے شکاری پرندوں میں صرف باز کے ذریعے شکار کو جائز قرار دیا ہے، انہوں نے حضرت عدی بن حاتم والی حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں حضرت عدی فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے باز کے ذریعے شکار کی نسبت سوال کیا تو آپ نے فرمایا "جسے وہ تمہارے لئے پکڑے اسے کھاؤ"۔[1]

امام صنعانی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

---

[1] . یہ حدیث امام احمدؒ اور امام ابوداؤدؒ نے روایت کی ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۸/۱۴۷، حاشیۃ المقنع ۳/۵۵۲۔ بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۲۔

تفسیر کشاف میں کہا گیا ہے کہ الجوارح الکواسب سے مراد ایسے درندہ جانور اور پرندے ہیں جو شکار کرتے ہوں، جیسے کتا، تیندوا، چیتا، عقاب، باز، شکرہ، شاہین۔ اور کلب سے مراد ایسے تمام شکاری جانور ہیں جو شکار کے طور طریقے اور آداب سیکھ چکے ہوں۔ اور لفظ "مکلبین" کا اشتقاق "کلب" سے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کتے (شکار کے) طور طریقے اور آداب زیادہ آسانی سے سیکھ جاتے ہیں۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ (عربی میں) تمام درندہ جانوروں کو "کلب" کہا جاتا ہے اس لئے یہاں کلب سے مشتق لفظ مکلبین استعمال کیا گیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابولہب کے بیٹے کو بددعا دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا اے اللہ اس پر اپنے کتوں میں سے کوئی کتا مسلط فرما دے چنانچہ اسے ایک شیر نے پھاڑ کھایا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ کلب کا لفظ تمام درندوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یا اس کا اشتقاق "کلب" سے ہے جس کے معنی حریص ہونا کے ہیں، جیسے عربی میں کہا جاتا ہے "هو كلب بكذا" (یعنی وہ اس کا بڑا حریص ہے) جبکہ کوئی کسی چیز کا حریص ہو۔

تفسیر کشاف کی اس عبارت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آیت کے مفہوم میں کتے اور دیگر تمام شکاری جانور شامل ہیں۔ کیونکہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اس وقت اہل عرب کتوں، پرندوں اور دیگر جانوروں کے ذریعے شکار کرتے تھے۔ چنانچہ امام ترمذیؒ نے حضرت عدیؓ بن حاتم کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ: "میں نے حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے باز کے ذریعے شکار کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا: "جو (شکار) وہ تمہارے لئے پکڑے اُسے کھاؤ"

مجاہد نے اس حدیث کو ضعیف بتایا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے کتاب "ضوء النہار" کے حواشی میں واضح کیا ہے خود ان کا عمل اس حدیث پر تھا۔

جن فقہاء نے پرندوں کے ذریعے شکار کو جائز قرار دیا ہے، ان کے شکاری پرندے میں دو شرائط کا پایا جانا ضروری ہے یعنی:

۱۔ ایک یہ کہ وہ شکار پر اس وقت جھپٹے جب اُسے شکار پر چھوڑا جائے (از خود نہ جھپٹ پڑے)

۲۔ دوسرے یہ کہ جب بلایا جائے واپس آجائے۔

جمہور فقہاء کے نزدیک پرندے کے لئے یہ شرط نہیں کہ وہ شکار میں سے خود کچھ نہ کھائے۔ حضرت ابن عباسؓ، نخعیؒ، حمادؒ، ثوریؒ، ابوحنیفہؒ، احمد (رحمہم اللہ تعالیٰ) سے یہی رائے مروی ہے۔ لیکن شافعیہ کے نزدیک جس طرح کتے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ شکار میں سے خود کچھ نہ کھائے، اسی طرح پرندے کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ شکار میں سے خود کچھ نہ کھائے، اس لئے کہ حضرت عدیؓ کی حدیث میں یہ آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر کتے اور باز نے (شکار میں سے خود کچھ) کھالیا تو تم نہ کھاؤ"۔

جو فقہاء پرندے کے لئے اس شرط کو ضروری نہیں سمجھتے کہ وہ خود شکار میں سے کچھ نہ کھائے وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اگر کتا کھالے تو تم نہ کھاؤ، لیکن اگر شکرہ کھالے تو تم کھاؤ، اس لئے کہ تم کتے کو مار پیٹ کر (سدھا) سکتے ہو، لیکن شکرے کو نہیں مار سکتے"۔

علماء نے اس مسئلے میں صحابۂ کرام کا اجماع نقل کیا ہے[۱] اور کہا ہے کہ اس معاملے میں باز مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر کتے سے مختلف ہوتا ہے:

۱۔ تعلیم یہ ہے کہ (جانور) اپنی عادت کو ترک کر دے اور اس کی فطرت بدل جائے۔ چنانچہ باز جس کی فطرت میں توحش اور انسانوں سے دور بھاگنا ہوتا ہے، وہ اگر کسی انسان سے مانوس ہو جائے اور اس کے بلانے پہ آجائے تو یہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ وہ (شکار کی) تربیت حاصل کر چکا ہے جبکہ کتا بالطبع انسانوں سے مانوس ہوتا ہے، لہٰذا اس کی اتنی تربیت کہ مالک کے بلانے سے آجائے کافی نہیں۔

۲۔ باز کو شکار کی تعلیم کھلا کر دی جاتی ہے، لہٰذا اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھالیا تو اس سے اس کی تربیت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی، بخلاف کتے کے کہ اس کا کھانا سوءِ تربیت کا نشان سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ جہاں تک کتے کا تعلق ہے اسے مار پیٹ کر تربیت دی جا سکتی ہے، لیکن باز کو مارا پیٹا نہیں جا سکتا چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: "اگر شکرہ کھالے تو کھاؤ اور اگر کتا کھالے تو نہ کھاؤ"۔[۲]

---

[۱]: دیکھئے حاشیۃ المقنع ۵۵۲/۳ - بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۲
[۲]: دیکھئے بدائع الصنائع ۲/۲۶۹۸

جو فقہاء شکاری پرندوں کے ذریعے شکار کو جائز قرار دیتے ہیں، ان میں سے بعض کے نزدیک شکاری پرندے کا مارا ہوا شکار حلال ہونے کی یہ شرط ہے کہ پرندے نے اسے زخمی کیا ہو جیسا کہ شکاری جانور کا شکار کو زخمی کرنا شرط ہے۔ چنانچہ اگر شکار شکاری پرندے کے دباؤ یا ضرب سے مرا یا اس کا دم گھٹ گیا اور وہ مر گیا تو اس کا کھانا حلال نہ ہوگا۔ اکثر اہل علم یہی رائے رکھتے ہیں۔

لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک ایسے شکار کا کھانا جائز ہے۔ انہوں نے ایسے شکار میں جو زخمی ہو کر مرا ہو اور اس شکار میں جو شکاری پرندے کے دباؤ سے یا دم گھٹ کر ہلاک ہوا ہو کوئی فرق نہیں کیا۔ امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک روایت ایسی ہی مروی ہے۔ امام ابن جوزی اور ابن حامد نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ حنابلہ میں سے امام خرقی کا بظاہر قول یہی ہے، جیسا کہ آیت کریمہ مذکورہ بالا کے عموم سے ثابت ہوتا ہے۔

لیکن جو فقہاء شکار کے زخمی ہونے کو اس کے حلال ہونے کی شرط قرار دیتے ہیں ان کا قول ہے کہ (شکاری پرندے کے دباؤ سے یا دم گھٹ کر مرا ہوا شکار) ایسا ہی ہے جیسے پتھر یا غلّے (مٹی کی گولی) سے مرا ہو شکار، کیونکہ وہ موقوذہ (یعنی چوٹ لگ کر مرے ہوئے جانور) کے حکم میں ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ فقہاء حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ: "جس (شکار) کا خون بہہ نکلے اسے کھاؤ"۔ لیکن ایسے جانور کا خون نہیں بہتا جو شکاری پرندے کے دباؤ سے یا دم گھٹنے سے ہلاک ہوا ہو[1]

---

[1] - دیکھئے حاشیۃ المقنع ۳/۵۵۲

پانچویں فصل

شکار کی ملکیت کب حاصل ہوتی ہے

اگر کوئی شخص شکار کو اپنے ہاتھ سے پکڑلے تو وہ باتفاق اسی کا ہے اسی طرح اگر کسی نے شکار کو ایسا زخم پہنچایا کہ وہ مرنے کے قریب ہوگیا، یا کسی پرندے کا بازو یا حیوان کی ٹانگ توڑدی تو ایسی صورتوں میں شکار اسی کا ہوگا جس نے بازو یا ٹانگ توڑی ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص شکار کے پیچھے بھاگے اور شکار تھک کر کھڑا ہوجائے تو شکار کے پیچھے بھاگنے والا اس کا مالک نہیں بنے گا۔ اگر شکار کسی شکاری کے جال میں آجائے جو اس نے شکار پکڑنے کے لئے لگایا تھا تو وہ اسی کا ہوگیا۔ اگر کسی ہانکنے والے نے شکار کو ہانکا لیکن وہ کسی دوسرے شخص کے جال میں جا پڑا تو اس کا مالک جال والا ہوگا۔ اگر کوئی شخص شکار پر اپنا کتا چھوڑے اور کتا شکار کو جا پکڑلے تو شکار کتے والے کا ہوگا۔

اگر کوئی شخص شکار کو کسی ایسی تنگ جگہ میں پناہ لینے پر مجبور کردے جہاں سے وہ نکلنے پر قادر نہ ہو تو وہ اسی کا ہوجائے گا۔

اگر کوئی شخص کشتی میں بیٹھا ہو اور اس کی گود میں مچھلی آگرے تو وہ اسی کی ہے۔ اگر کوئی شخص مچھلی پکڑنے کے لئے گڑھا کھودے تو جتنی مچھلیاں اس میں آجائیں گی سب اسی کی ہوجائیں گی۔ اگر کسی نے گڑھا کھودا لیکن اس کی نیت مچھلی پکڑنے کی نہ تھی تو گڑھے میں آجانے والی مچھلیاں اس کی نہ ہوں گی۔

اگر کوئی پرندہ کسی کی زمین میں رہنے لگے اور وہاں انڈے بچے دے دے اور ان پر قابو پانا اس کے لئے ممکن ہوجائے، یا اس کی زمین میں کوئی شکار آگرے تو وہ مالک زمین کا نہ ہوجائے گا۔

اگر کسی نے ایسی مچھلی پکڑی جس کے پیٹ میں سوراخ دار موتی تھا تو وہ موتی اس کا نہ ہوگا، کیونکہ وہ کسی کا گمشدہ مال تھا۔ لیکن اگر موتی سوراخ دار نہ ہو تو پانے والا ہی اس کا مالک ہوگا۔

اگر کوئی شخص کسی کے ہاتھ مچھلی بیچے جس کے پیٹ میں سے بغیر سوراخ کا موتی نکلے تو وہ موتی خریدار کی

ملکیت ہو گا۔

اگر دو اشخاص کسی شکار کو یکے بعد دیگرے زخم لگائیں تو شکار اس کا ہو گا جس کا لگایا ہوا زخم زیادہ گہرا یا ہلاکت کے قریب پہنچانے والا ہو۔ لیکن اگر دونوں نے شکار کو ایک ساتھ زخمی کیا ہو تو صورت حال کا جائزہ لیا جائے گا۔ چنانچہ اگر سبب ملک میں دونوں اشخاص برابر ہوں تو شکار دونوں کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا یعنی اگر دونوں زخموں میں سے ہر ایک ہلاکت تک پہنچانے والا ہو یا گہرا ہو، خواہ علیحدہ ہو، یا ان میں سے ایک گہرا اور دوسرا ہلاکت تک پہنچانے والا ہو (تو شکار دونوں کے درمیان برابر برابر تقسیم کیا جائے گا)۔

اگر ایسی صورت ہو کہ دونوں زخم مل جائیں اور ان کے مل جانے سے ازمان (گہرائی) پیدا ہو جائے اس طرح کہ اگر ان میں سے ہر ایک علیحدہ ہوتا تو مزمن (گہرا) نہ ہوتا تو جمہور فقہاء کے زیادہ صحیح قول کے مطابق شکار دوسرے کا ہو گا[۱]

اسی طرح اگر کسی نے شکار کو کسی کھائی میں بند کر دیا اس کے بل کے منہ پہ پتھر یا کوئی اور چیز رکھ کر اسے بند کر دیا تو شکار اس کا ہو گیا۔

اگر کسی نے بل کا منہ بند کیا اور پھر کوئی چیز لینے چلا گیا تاکہ زمین کھود کر شکار کو نکال لے۔ لیکن اسی اثناء میں کوئی دوسرا شخص آیا جس نے شکار کو نکال لیا تو ایسی صورت میں شکار اس کا ہو گا جس نے بل کا منہ بند کیا تھا

اگر کوئی شخص شکار کو پکڑے، لیکن دوسرا آ کر اس سے جھگڑے اور دعویٰ کرے کہ میں نے شکار پہ ہاتھ تجھ سے پہلے رکھا تھا تو جو شخص پہلے ہاتھ رکھنے کا مدعی ہے اس سے کہا جائے گا کہ اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرے۔ اگر وہ اپنا دعویٰ ثابت نہ کر سکے تو ظاہر ہے شکار ان دونوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا[۲]

اگر کچھ لوگ اپنے اپنے کتے شکار پہ چھوڑیں اور ان پہ اللہ کا نام لیں لیکن جب شکار کے پاس پہنچیں تو دیکھیں کہ وہ مر چکا ہے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اسے کس (کتے) نے مارا ہے، تو ایسے شکار کا کھانا جائز ہو گا۔

---

[۱] ۔ حاشیۃ الدسوقی ۱۰۹/۲

[۲] ۔ حاشیۃ الدسوقی ۱۰۹/۲

اگر ان کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف رائے پیدا ہو جائے کہ اس (شکار) کا مارنے والا کون ہے اور کتے نے دبوچے ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں وہ ان سب کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔[1]

اگر دو اشخاص ایک ساتھ کسی شکار پر تیر چلائیں تو وہ دونوں اس کے مالک ہوں گے اور شکار ان دونوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی شکار کو تیر مارے اور وہ بھاگ کر کسی کے گھر میں داخل ہو جائے اور گھر والا اسے پکڑ لے تو وہی اس کا مالک ہو گا اس لئے کہ تیر چلانے والا اس پر قابو نہ پانے کے باعث ابھی اس کا مالک نہ بنا تھا۔

اگر کوئی تیر انداز کسی ایسے پرندے پر تیر چلائے جو کسی کے گھر میں کھڑے درخت پر بیٹھا ہو اور پرندہ (زخمی ہو کر) اس کے گھر میں گر پڑے، تو اس کا مالک تیر چلانے والا ہو گا۔[2]

اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے باغ یا گھر میں داخل ہو کر کوئی پرندہ یا جانور شکار کرے تو اس کا مالک وہی (یعنی شکار کرنے والا) ہو گا۔ اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں۔

اگر کوئی سدھایا ہوا شکاری کتا (مالک کے) چھوڑے بغیر کوئی شکار پکڑے، پھر اس شکار کو اس کے منہ سے کوئی اجنبی شخص چھین لے تو وہی (یعنی چھیننے والا) اس کا مالک بن جائے گا۔ یہ مذہب حضرت امام شافعیؒ کا ہے اور جمہور فقہاء کی رائے بھی یہی ہے۔

اگر کوئی شخص شکار پکڑے لیکن وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نکل جائے تو اس سے اس کی ملکیت زائل نہ ہو گی اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں اگر کوئی اور شخص اس (بھاگے ہوئے شکار) کو پکڑ لے تو اس کے لئے لازم ہو گا کہ وہ اسے (پہلے پکڑنے والے کو) لوٹا دے۔ خواہ وہ شکار شہر میں یا اس کے ارد گرد گھوم رہا ہو یا جنگلی جانوروں سے جا ملا ہو۔

اگر کوئی شخص شکار پکڑے لیکن اس پر کوئی ایسا نشان ہو جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ وہ کسی کی ملک ہے۔ مثلاً اس پر کچھ نقوش بنے ہوئے ہوں یا اس پر کچھ لکھا ہوا ہو یا وہ رنگا ہوا ہو یا اس کے پر تینچ کے ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں شکار کرنے والا اس کا مالک نہیں بنے گا۔[3]

---

[1] المغنی ۸/۵۵۱ [2] المغنی ۸/۵۶۲ [3] المجموع ۹/ ۱۱۸ - ۱۱۹

تیسرا باب

حرام جانور

یہ باب چار فصلوں پر مشتمل ہے :

پہلی فصل : نصِ قرآنی کی رُو سے حرام جانور اور ان کے حرام ہونے کی حکمت ۔

دوسری فصل : نصِ سنت کی رُو سے حرام جانور اور ان کے حرام ہونے کی حکمت. اس فصل میں اُن جانوروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کی حرمت پر فقہاء کا اتفاق ہے اور اُن کا بھی جن کے بارے میں فقہاء اختلافِ رائے رکھتے ہیں ۔

تیسری فصل : کیا حرام جانوروں کے اجزاء سے فائدہ اٹھانا جائز ہے ۔

چوتھی فصل : مجبوری کی حالت میں حرام اشیاء کا کھانا۔

پہلی فصل

نصِّ قرآنی کی رُو سے حرام جانور اور ان کے حرام ہونے کی حکمت

اُمتِ مسلمہ پر یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت اور خصوصی لطف واحسان ہے کہ اس کے لئے ایسے جانوروں کا گوشت حرام قرار دے دیا گیا ہے جو انسان کی صحت یا اس کے اخلاق اور نفاستِ طبع کے نقطۂ نظر سے نقصان دہ ہیں اس تحریم کا ایک اور مقصد انسان کی عظمت و تکریم میں اضافہ کرنا اور اس کے مقام و مرتبہ کو بلند کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ :

ولقد کرّمنا بنی آدم وحملنٰھم فی البرّ والبحر ورزقنٰھم مّن الطیبات

(الاسراء: آیت نمبر ۷۰)

(اور ہم نے عزت دی ہے آدمؑ کی اولاد کو اور سواری دی ان کو جنگل اور دریا میں اور روزی دی ہم نے ان کو ستھری چیزوں سے)

ایک اور مقام پر اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں :

یسئلونک ماذآ احل لھم قل احل لکم الطیبات (المآئدۃ: آیت نمبر ۴)

(تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز ان کے لئے حلال ہے کہہ دے تم کو حلال ہیں ستھری چیزیں)۔

یہ بھی ہم پر اللہ تعالیٰ کا انتہائی فضل و کرم ہے کہ اس نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی رحیم و کریم شخصیت کو ہمارے لئے اپنا رسول بنا کر بھیجا تاکہ آپ پوری وضاحت سے ہمیں بتا دیں کہ کون سی چیزیں پاک اور کون سی ناپاک ہیں، کون سی چیزیں انسانی صحت کے لئے مفید اور کون سی مضر ہیں، کون سی اشیاء انسانی عظمت و شرف

میں اضافہ کرنے والی اور کون سی انہیں نقصان پہنچانے والی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث (الاعراف: آیت نمبر ۱۵۷)

(حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر سب ناپاک چیزیں)

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی جسم کی ساخت اور نشوونما کا انحصار اس غذا پر ہوتا ہے جو انسان اپنے استعمال میں لاتا ہے: خصوصاً پروٹین جزو بدن جسم کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور جو جسم کی اس کمی کو پورا کرتی ہیں جو مختلف سرگرمیوں اور فرائض و واجبات کی ادائیگی کے دوران میں جسم انسانی میں واقع ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر انسان ردی اور ناپاک غذا زیر استعمال لائے گا تو اس سے اس کا جو گوشت بنے گا وہ ردی ناپاک اور ناکارہ ہوگا جس کا اثر انسان کی روح اور عقل پر پڑے گا اور وہ فساد و تباہی کا شکار ہو کر رہ جائیں گی۔ پرانی کہاوت ہے: عقل سلیم کے لئے صحت مند جسم ضروری ہے۔

جسم انسانی کی تعمیر کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی مکان کی تعمیر، اگر کسی مکان کی تعمیر میں ناقص سامان اور ناکارہ مسالا استعمال کیا جائے گا تو وہ مکان کمزور ہوگا: اس کی عمر کم ہو گی اور ہر وقت اس امر کا خطرہ رہے گا کہ نہ جانے کس وقت وہ زمین پر آ رہے۔ اور اس کے رہنے والے موت کی آغوش میں جا سوئیں۔

چنانچہ شارع حکیم نے بڑی وضاحت کے ساتھ ایسے جانوروں کا ذکر کر دیا ہے جن کا گوشت انسانی جسم کے لئے ضرر رساں ہے۔ اس سلسلے میں کوئی ضروری بات ایسی نہیں جسے بیان نہ کیا گیا ہو۔ اور کوئی ناپاک اور ناقص غذا ایسی نہیں جس کی نشان دہی نہ کی گئی ہو اور جس کے استعمال سے روکا نہ گیا ہو۔

جن اقسام کے جانوروں کا حرام ہونا قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے ان کے متعلق ارشاد باری تعالے عز اسمہٗ ہے:۔

حرمت علیکم المیتۃ والدّم ولحم الخنزیر وما اُھلّ لغیر اللہ بہ والمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردّیۃ والنطیحۃ وما اکل السبع الّا ما ذکّیتم وما ذبح علی النصب (المائدۃ: آیت نمبر ۳)

(حرام ہوا تم پر مردہ جانور اور لہو اور گوشت سور کا اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا اور جو مر گیا ہو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر یا سینگ مارنے سے اور جس کو کھایا ہو درندے نے مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا، اور حرام ہے جو ذبح ہوا کسی تھان پر)

آیت بالا درحقیقت ارشاد باری تعالیٰ:

احلت لکم بھیمۃ الانعام الا ما یتلی علیکم (المائدہ: آیت نمبر ا)

(حلال ہوئے تمہارے لئے چوپائے مویشی سوائے ان کے جو تم کو آگے سنائے جاویں گے)۔

کی تفصیل ہے۔ اسی طرح سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جو چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں وہ بھی اسی آیت کی تفصیل ہیں۔

آیت بالا کی تفسیر میں امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"یعنی پڑھی جائے گی تم پر تحریم قرآن اور سنت میں جیسے اللہ تعالیٰ کا قول حرمت علیکم المیتۃ (یعنی آیت مذکورہ بالا) اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی: "درندہ جانوروں میں سے تمام کچلیوں والے جانور حرام ہیں"[1]۔

اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید میں نہیں جو حکم دیا گیا ہے وہ سنت نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اللہ ہی کا حکم ہے اس کی دلیل مندرجہ ذیل دو امور ہیں:

اولاً: حدیث عسیف (جس میں آپؐ نے فرمایا کہ "میں تمہارے درمیان فیصلہ اللہ کے حکم کے مطابق کروں گا"۔ (اور زانیہ عورت کو رجم کرنے کا حکم دیا) حالانکہ کتاب اللہ میں رجم کا ذکر نہیں۔ ثانیاً: حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث کہ: "میں اس شخص پر کیوں لعنت نہ بھیجوں جس پر حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی اور وہ کتاب اللہ میں ہے"۔

ہو سکتا ہے کہ آیت مذکورہ بالا "احلت لکم بھیمۃ الانعام ..." کا مطلب یہ ہو کہ: (حلال ہوئے تمہارے لئے چوپائے مویشی) سوائے ان کے جن کا ذکر اب کیا جائے گا یا آئندہ زمانے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] صحیح مسلم اور نسائی۔ دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۸۲/۱۳

زبان مبارک سے کیا جائے گا۔ اس صورت میں اس سے یہ دلیل نکلے گی کہ کسی مسئلے کے بیان کرنے میں اس وقت تک تاخیر جائز ہے جب تک اس کے بیان کرنے میں جلدی کی حاجت نہ ہو۔[۱]

سورۂ مائدہ کی مذکورہ بالا آیت نمبر ۳ میں جن جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے اب ہم ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ آیت کی رُو سے پہلی حرام چیز۔ مُردار

اولاً: لغوی حیثیت سے لفظ مَیتَۃ (مُردار) پر غور کیا جائے تو اس کا لفظ مَیْتَۃ اور مَیِّتَۃ یعنی تخفیف اور تشدید کے ساتھ دونوں طرح کیا جا سکتا ہے اور جیسا کہ بعض اہل لغت نے کہا ہے یہ درحقیقت دو الفاظ ہیں۔ ابو جعفر بن القعقاع نے اسے تشدید کے ساتھ "المیّتۃ" پڑھا ہے اور ابو حاتم نے کہا کہ: جو مر چکا ہو اسے تخفیف کے ساتھ "مَیْت" اور تشدید کے ساتھ "مَیِّت" کہتے ہیں لیکن جو ابھی تک نہ مرا ہو اسے تخفیف کے ساتھ "مَیْت" نہیں کہتے بلکہ تشدید کے ساتھ "مَیِّت" بولتے ہیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ

(بے شک تو بھی مرتا ہے اور وہ بھی مرتے ہیں) الزمر: آیت نمبر ۳۰

شاعر کہتا ہے:

لیس من مات فاستراح بمیّت

انما المیت میّت الاحیاء[۲]

(میت) (مردہ) وہ نہیں جو مر گیا اور آرام پا گیا۔ بیشک مردہ وہ ہے جو زندہ ہے اور مردہ ہے)

ثانیاً: اصطلاحی طور پر میتۃ (مُردار) سے مراد وہ جانور ہے جو انسان کے ذبح کئے بغیر اپنی موت مر جائے۔

ثالثاً: یہ آیت عام ہے جس کی تخصیص اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

---

[۱] دیکھئے القرطبی ۲۱۶/۶

(احل لکم صید البحر (المائدہ: آیت نمبر ۹۶)
(حلال ہوا تمہارے لئے دریا کا شکار)

اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "حلال ہوئے ہمارے لئے دو مردہ جانور یعنی مچھلی اور ٹڈی اور دو خون یعنی جگر اور تلی" نیز حضرت جابرؓ سے مروی اس حدیث سے ہوتی ہے، جو عنبر کے بارہ میں ہے۔

اس مسئلے میں اتفاق کے باوجود کہ ضعیف حدیث سے قرآن مجید کی تخصیص نہیں ہو سکتی علماء کا اس بارے میں اختلاف رائے ہے کہ آیا صحیح حدیث سے قرآن مجید کی تخصیص ہو سکتی ہے یا نہیں؟

رابعاً: ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "ما قطع من البھیمة وھی حیة فھو میت" کے مطابق زندہ جانور کے جسم سے کاٹا ہوا گوشت مردار ہے[۱]

جاہلیت کے زمانے میں عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ زندہ اونٹ کی کوہان یا زندہ دنبے کی چکی سے چربی کاٹ کر کھایا کرتے تھے، لیکن جب اسلام آیا تو اس نے انہیں ایسے ظالمانہ فعل سے روک دیا۔

دین اسلام کا یہ حکم اس کے محاسن کے کمال، بے زبان جانوروں کے ساتھ اس کے رحم دلانہ برتاؤ اور لطف و شفقت کی دلیل ہے۔ ظاہر ہے کہ جانور نہ ایسی چیزوں کو بیان کر سکتے ہیں جو انہیں دکھ اور ایذا پہنچانے والی ہیں اور نہ ایسی چیزوں سے اپنی جان کو بچانے اور محفوظ رکھنے پر قادر ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی جانور اپنی ٹانگ کٹ جانے یا کوئی اور عضو جسم سے الگ ہو جانے کے باعث ہلاک ہو جائے تو وہ بھی حرام ہے۔

خامساً: مردار کے حرام ہونے کی حکمت:

۱۔ سلیم الطبع انسان مردہ جانور کے گوشت کو گندہ سمجھتا ہے اور اس سے کراہت محسوس کرتا ہے

۲۔ ڈاکٹروں نے اپنے مختلف تجربات کے ذریعے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جانوروں کے خون میں بہت سے جراثیم اور مائکروب گردش کرتے رہتے ہیں، اور جانور کی موت سے اس کا یہ خون گوشت میں جم جاتا ہے جسے اب اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

---

[۱] - اس حدیث کو امام ابو داؤدؒ اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام احمدؒ نے حسن بتایا ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۱۴۲/۸

۳۔ یہ درحقیقت بھی تجربات سے ثابت ہو چکی ہے کہ ایسا گوشت جس میں خون کی آمیزش ہو گئی ہو، مشکل سے ہضم ہوتا ہے۔

۴۔ مُردار کا کھانا حرام ٹھہرانے سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنی انسانی عظمت اور شرافت و بندگی کی حفاظت کریں اور وحشیوں کی طرح گندے گوشت کو اپنی غذا کا جزو نہ بنائیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی دیگر تمام مخلوقات پر فضیلت و برتری بخشی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولقد كرّمنا بني آدم وحملناهم في البر والبحر ورزقناهم من الطيبٰت وفضّلناهم على كثير ممّن خلقنا تفضيلا ۔ (الاسراء : آیت نمبر ۷۰)

(اور ہم نے عزت دی ہے آدمؑ کی اولاد کو اور سواری دی ان کو جنگل اور دریا میں اور روزی دی ہم نے ان کو ستھری چیزوں سے اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا ہم نے بڑائی دے کر)۔

۵۔ جو جانور اپنی موت مرتا ہے، یقیناً اس کی موت کا سبب کوئی نہ کوئی بیماری ہوتی ہے جو اسے لاحق ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایسے مردہ جانور کا گوشت کھانا انسانی صحت کے لئے سخت نقصان دہ ہے[1] مسلمانوں کی طرح اکثر مہذب و متمدن اقوام میں مردار کا گوشت حرام سمجھا جاتا ہے، اسلام سے پہلے عرب کے دورِ جاہلیت میں البتہ بعض لوگ ایسے تھے جو مُردار کھاتے تھے۔

---

[1] ۔ دورِ حاضر میں طبی تجربات سے یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ جو غذا کریہ المنظر ہو اس کے کھانے سے انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ نقصان ہوتا ہے اور وہ بیمار ہو جاتا ہے (اور جتنی چیزیں شریعت نے حرام کی ہیں جیسے) مُردار، خون، گلا گھٹ کر، چوٹ لگ کر اونچائی سے گر کر اور سینگ لگ کر مرے ہوئے جانور، اور اسی طرح وہ جانور جس کا کچھ حصہ کسی درندے نے کھا لیا ہو، یہ تمام جانور کریہ المنظر ہوتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر سلیم طبیعتیں کراہت محسوس کرتی ہیں اور ان سے دُور بھاگتی ہیں۔

۲- دوسری حرام چیز - خون :

اس آیت میں جس خون کو حرام ٹھہرایا گیا ہے وہ دم مسفوح (یعنی بہتا خون) ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت :

قل لا أجد فيما أوحى الى محرماً على طاعم يطعمه الا ان يكون ميتة أو دماً مسفوحاً (الانعام : آیت نمبر ۱۴۵)

(تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں کہ مجھ کو پہنچی ہے کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اس کو کھاوے مگر یہ کہ وہ چیز مُردار ہو یا بہتا ہوا خون)۔

میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہاں علماء نے بالاجماع مطلق کو مقید پر محمول کیا ہے[1]

سورۂ البقرہ اور المائدہ میں خون کا تذکرہ مطلق طور پر ہوا اور سورۂ الانعام میں اُسے مقید کر دیا گیا (یعنی جو خون حرام ہے وہ دم مسفوح ہے)

امام جصاص رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں :

"سورہ المائدہ میں لفظ "الدم" (خون) میں جو الف اور لام آیا ہے وہ عہد کے لئے ہے یعنی وہ عہد جو ارشادِ باری تعالیٰ (أو دماً مسفوحاً) میں مذکور ہوا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ: "حلال ہوئے ہمارے لئے دو مردہ جانور اور دو خون" ارشادِ باری تعالیٰ "أو دماً مسفوحاً" کے مقتضیٰ کی تاکید ہے کیونکہ جگر اور تلی بہنے والے (خون) نہیں ہیں"[2]

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ بہنے والا خون حرام ہے، نہ اُسے کھانا جائز ہے نہ استعمال میں لانا۔ لیکن جو خون گوشت کے ساتھ لگا ہوا ہو اور عموم بلویٰ (ابتلائے عام) کے حکم میں ہو کہ اس سے بچنا ممکن نہ ہو وہ

---

[1] ۔ القرطبی ۲/۲۲۲

[2] ۔ احکام القرآن تالیف امام جصاص ۳/۲۹۶

معاف ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم گوشت کی ہانڈی پکاتے تھے جس میں خون کا زرد مادہ اوپر آجاتا تھا جسے ہم کھاتے تھے اور ناپسند نہ کرتے تھے۔"

اسی طرح علماء کا اس مسئلے میں بھی اجماع ہے کہ خون اگر کثیر مقدار میں ہو تو ناپاک ہے جس سے نماز پڑھنا جائز نہیں۔ لیکن اس کی تھوڑی مقدار معاف ہے۔

مچھلی کا خون :

مچھلی کا خون پاک ہے یا ناپاک ؟ اس مسئلے میں شافعیہ کی دو رائیں ہیں، جن میں سے صحیح رائے کے مطابق وہ ناپاک ہے۔ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام داؤدؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ پاک ہے[۱] امام قرطبیؒ نے کہا ہے کہ مچھلی کے بہنے والے خون کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کا اختلاف ہے۔

قابسی سے مروی ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ وہ پاک ہے، اور اس کے پاک ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ حرام نہیں۔ ابن عربی نے یہی رائے اختیار کی ہے اور کہا ہے کہ اگر مچھلی کا خون ناپاک ہوتا تو شرعاً اس کا ذبح کرنا ضروری ہوتا۔

میں (یعنی مصنف) کہتا ہوں کہ مچھلی کے خون سے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہی ہے۔ میں نے بعض حنفی علماء کو یہ کہتے سنا ہے کہ مچھلی کا خون پاک ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جب وہ خشک ہوتا ہے تو اس کا رنگ سفید ہو جاتا ہے، بخلاف دیگر تمام جانوروں کے خون کے کہ وہ سوکھ کر کالا ہو جاتا ہے۔ شافعیہ کے خلاف استدلال میں یہ نکتہ احناف کے حق میں جاتا ہے[۲]

احناف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ :

"ہمارے لئے دو مردہ جانور اور دو خون یعنی مچھلی اور ٹڈی حلال ہیں۔"

اس حدیث کی رو سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مچھلی کا خون بہائے بغیر اسے کھانا مباح

---

[۱]۔ دیکھئے المجموع ۲/۵۷۱ اور بدائع الصنائع ۱/۲۱۶

[۲]۔ القرطبی ۲/۲۲۲ - بدایۃ المجتہد ۱/۷۸

قرار دیا۔ لہٰذا اس حدیث سے آیت کریمہ کی تخصیص واجب ہوئی۔ اگر (مچھلی کا خون) حرام ہوتا تو اسے بہائے بغیر مچھلی کا کھانا حلال نہ ہوتا۔ جیسے مثال کے طور پر بکری (کو ذبح کئے) اور خون بہائے بغیر اس کا کھانا حلال نہیں۔ یہ حدیث مقبول ہے[۱]

اس مسئلے میں حق حنفیہ کی طرف ہے، اس لئے کہ مچھلی کا خون دم مسفوح نہیں ہوتا اور آیت کریمہ کی رو سے حرمت کو دم مسفوح کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔

خون کے حرام ہونے کی حکمت :

خون کو حرام قرار دینے کی حکمت بھی وہی ہے جو میتۃ (مُردار) کو حرام قرار دینے کی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، خون میں بے شمار جراثیم اور مائکروب گردش کرتے رہتے ہیں جنہیں، خون کو کھولا کر یا کسی اور صورت میں ہلاک کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ خون تھوڑی سی آنچ پر بہت جلدی جم جاتا ہے۔ بخلاف دودھ کے کہ وہ کھولانے سے نہیں جمتا۔ دودھ کے متعلق بھی اطباء کا مشورہ ہے کہ اُسے کھولا کر پینا چاہیئے تاکہ جراثیم اور مائکروب ہلاک ہو جائیں۔

آج تک یہ بات ثابت نہیں ہو سکی کہ خون کا کھانا یا پینا انسانی جسم کے لئے کسی طرح بھی مفید ہے۔ بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ وہ ثقیل ہوتا ہے اور اسے ہضم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں انسان کی طبیعت خون سے کراہت محسوس کرتی ہے کیونکہ اسے گندہ سمجھا جاتا ہے اور اس کا شمار فضلات میں ہوتا ہے جن سے انسانی صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔

۳۔ تیسری حرام چیز خنزیر کا گوشت :

اکثر اہل لغت کے نزدیک "خنزیر" کا لفظ چار حرفوں والا ہے۔ لیکن ابن سیدہ نے بعض ماہرین لغت کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ لفظ خزر العین (کنکھیوں سے دیکھنے والا) سے مشتق ہے کیونکہ خنزیر اسی طرح دیکھتا ہے۔ اس رائے کے مطابق یہ لفظ تین حرفوں والا ہے۔

الصحاح میں لکھا ہے: جب آدمی کی پلکیں تنگ ہو جائیں تو کہا جاتا ہے "تخازر الرجل" (یعنی اُس

---

[۱] احکام القرآن تالیف امام جصاص ۱/ ۱۵۱

سے اپنی پلکیں سیکڑیں تاکہ نظر کو باریک کرلے) خنزیر کی آنکھیں تنگ اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ خنزیر کی جمع خنازیر آتی ہے[1]

سُور کا گوشت اسلامی شریعت میں بھی حرام ہے اور یہودی شریعت میں بھی اسی طرح سیحیوں کے ہاں بھی حرام تھا لیکن بعد میں انہوں نے اسے حلال ٹھہرالیا۔

امت اسلامیہ کا اس امر پر اجماع ہے کہ سُور کا گوشت، اس کی چربی اور غضاریف (یعنی نرم ہڈیاں جیسے کان اور ناک وغیرہ کی) بغیر کسی اختلاف کے حرام ہیں۔

چربی گوشت میں داخل ہے۔ گوشت عام (اسم) ہے اور چربی خاص۔

امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر کوئی شخص یہ حلف اٹھائے کہ "میں چربی نہیں کھاؤں گا" اور گوشت کھالے تو گوشت کے کھانے سے اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ لیکن اگر کوئی یہ قسم کھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا اور چربی کھالے تو اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔ اس لئے کہ لفظ گوشت کا اطلاق گوشت کے ساتھ چربی پر بھی ہوتا ہے۔ پس ہر گوشت چربی ہے لیکن ہر چربی گوشت نہیں۔ ان کے استدلال کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

حرّمنا عليهم شحومهما (الانعام: ۱۴۰)

(ہم نے حرام کی تھی اُن پر دگائے اور بکری میں سے ان کی چربی)

اللہ تعالیٰ کا مندرجہ بالا قول اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہودیوں پر چربی حرام کی گئی تھی نہ کہ گوشت۔ چنانچہ چربی گوشت کے لفظ میں داخل ہے لیکن گوشت چربی کے لفظ میں داخل نہیں۔

حضرت امام شافعیؒ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابوثورؒ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ قسم کھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا اور پھر چربی کھالے تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ امام احمدؒ کی رائے بھی یہی ہے[2]

المختصر زیر بحث مسئلے میں اہم بات یہ ہے کہ سُور کے گوشت کی طرح اس کی چربی کے حرام ہونے پر بھی امت

---

[1] - دیکھئے القرطبی ۲/ ۲۲۳

[2] - دیکھیے القرطبی ۲/ ۲۲۲ - ۲۲۳

کا اجماع ہے ۔

سُوٴر کا گوشت حرام قرار دینے کی حکمت

گزشتہ زمانے میں ہم سُوٴر کا گوشت اور اس کی چربی کھانے کے نقصانات سے آگاہ نہ تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ اس کے سبب سے بے شمار ظاہری اور باطنی امراض پیدا ہوتے ہیں ، اس لئے کہ اس وقت تک علم طب اور سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی وہ آج کر چکی ہے اب علمی ترقی اور سُوٴر کے گوشت پر کی گئی تحقیقات اور تجزیہ وتحلیل کی روشنی میں ہم پر اس حکمت کا راز کھل چکا ہے جس کے پیش نظر اسلامی شریعت میں سُوٴر کو حرام قرار دیا گیا ہے ۔ تحقیقات اور تجزیہ وتحلیل کا یہ فریضہ مسلمانوں نے نہیں بلکہ خود مغرب کے ڈاکٹروں اور سائنس دانوں نے انجام دیا ہے ۔ علامہ محمد رشید رضا نے اپنے فتاویٰ میں استاذ سیف الدین کی درج ذیل عبارت نقل کی ہے :

"میں نے رہنمائے طب جیسی ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ سُوٴر کے گوشت میں خصوصیت کے ساتھ بیشتر صورتوں میں ایک خبیث جرثومہ پایا جاتا ہے جسے "ترکینہ" کہتے ہیں یہ جرثومہ انسان کی آنتوں اور اس کے نظامِ ہضم کو سخت نقصان پہنچاتا ہے اور اتنا سخت جان ہوتا ہے کہ جب تک پچہتر درجہ فارن ہیٹ پر کھولایا نہ جائے ہلاک نہیں ہوتا ۔ اگر یہ کسی ایسے انسان کے جسم میں داخل ہو جائے جو اسے برداشت کرنے کی قوت نہ رکھتا ہو تو کم ہی اسے زندہ چھوڑتا ہے بلکہ چوبیس گھنٹے سے کم عرصے میں اسے موت کی نیند سلا دیتا ہے ۔

عملی طور پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سُوٴر کی چربی اور جگر اس نقصان دہ جرثومے سے بالکل خالی رہتے ہیں ۔

جراثیم سے متعلق دیگر کتابیں جو میں نے پڑھی ہیں ان میں بھی مذکورہ بالا رائے سے اتفاق ظاہر کیا گیا ہے لیکن علم طب کی جو کتابیں میں نے پڑھی ہیں ان میں سے بعض میں لکھا ہے کہ جو شخص سُوٴر کی چربی اور روغن کثرت سے کھاتا ہے بعض صورتوں میں اسے یا اس کی اولاد کو خارش ، کوڑھ پن اور کھجلی جیسے موذی امراض آگھیرتے ہیں ۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام "اڈرس نفسک" (اپنے آپ کا مطالعہ کیجئے) ہے جو ایک بڑے فاضل استاذ کی لکھی ہوئی ہے ۔ اس سے آپ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سُوٴر کی چربی مذکورہ بالا مضر جرثومہ سے

پاک ہوتی ہے (اگرچہ اکثر صورتوں میں براہ راست اس کا کھانے والا، یا اس کے بعد اس کی اولاد، بہت سے موذی امراض کی شکار ہو جاتی ہے) لہٰذا یہ ان چیزوں میں شامل نہیں جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ دراصل اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ چنانچہ اس کے کھانے کی حرمت، اگرچہ ظنی ہوگی، لیکن احتیاط اور سدِ ذریعہ کے نقطۂ نظر سے جائز ہوگی اس لئے کہ نصِ صریح سے اس کی قطعی تحریم ثابت نہیں"۔

شیخ محمد رشید رضا کا حاشیہ :

استاذ سیف الدین کی مندرجہ بالا عبارت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے علامہ رشید رضا حاشیے میں لکھتے ہیں کہ :

اولاً : چونکہ سُوّر کا گوشت کھانا بغیر کسی استثنار اور شرط کے مطلقاً حرام قرار دیا گیا ہے اس لئے اس میں چربی اور وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو کھائی جاتی ہیں۔ جیسے جگر، پھیپھڑے، دل، تلی، گردے، آنتیں اور غدود وغیرہ۔ یہ چیزیں گوشت میں حقیقی لغوی نص کی رُو سے شامل ہیں۔ جیسا کہ قاضی ابو بکر ابن العربی المالکی نے ثابت کیا ہے۔ اپنی کتاب احکام القرآن میں سورۂ بقرہ والی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "پوری امت اس بات پر متفق ہے کہ سُوّر کا گوشت اپنے تمام اجزار کے ساتھ حرام ہے"۔ اور (باقی چیزوں کو چھوڑ کر صرف) گوشت کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ (سُوّر) ایسا جانور ہے جسے گوشت ہی حاصل کرنے کے لئے ذبح کیا جاتا ہے۔ اب بدعتی یہ کہہ کر (سُوّر کھانے کی) وکالت کر رہے ہیں کہ: اس کی چربی کیوں نہ کھائی جائے، وہ کس حکم کی رُو سے حرام ہے؟ یہ عجمی لوگ ہیں، نہیں جانتے کہ اگر کسی شخص نے لحم (گوشت) کہا تو گویا اس نے شحم (چربی) کہا اور جس نے شحم کہا اس نے لحم نہیں کہا اس لئے کہ لفظ کے اختصاص کی رُو سے ہر گوشت چربی ہے لیکن ہر چربی گوشت نہیں۔ چربی گوشت کی حقیقت کے اعتبار سے گوشت ہے جیسے ہر حمد شکر ہے۔ لیکن نعمتوں کے ذکر کے اعتبار سے ہر شکر حمد نہیں البتہ فضائل منعم کے ذکر کے اعتبار سے حمد ہے۔

اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے کہ آیا سُوّر پاک ہے یا ناپاک؟ اکثر فقہاء کے نزدیک وہ نجس ہے، لیکن حضرت امام مالکؒ اسے پاک سمجھتے ہیں۔

ثانیاً: فقہاء کا اس امر پر اجماع ہے کہ سُؤر کی ہر چیز جو کھائی جاتی ہے حرام ہے۔ جمہور فقہاء نے اس مسئلے میں اجماع نقل کیا ہے لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ چند ظاہریہ اس سے مستثنیٰ ہیں جن کی رائے ہے کہ لفظ لحم (گوشت) کا جو مدلول عوام میں معروف ہے وہ حیوانی جسم کا وہ حصہ ہے جو اس کی ہڈیوں کے ساتھ ملے ہوئے اعضاء سے متصل ہے نہ کہ وہ جو اس کے جوف (پیٹ) میں ہے۔

ثالثاً: اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید کی متعلقہ آیات میں لحم (گوشت) کا لفظ مطلق استعمال کر کے بطورِ مجاز مرسل جز کہہ کر کُل، یا شے کے بڑے حصے کا ذکر کر کے پوری شے مراد لی گئی ہے، تو ایسی صورت میں احناف کے سوا دیگر تینوں مذاہب کے نزدیک آیت سے سُؤر کی تمام مذکورہ چیزوں کی حُرمت پر، اور احناف کے نزدیک ان کی کراہیتِ تحریمی پر استدلال کرنا صحیح ہوگا۔ اس لئے کہ احناف کے نزدیک کسی شے کو حرام قرار دینے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کی حرمت نص کی قطعی دلالت سے ثابت ہو، اور یہاں یہ صورت موجود نہیں۔

رابعاً: یہ کہ سُؤر کا گوشت حرام قرار دینے کی جو علت ہے۔ یعنی جسمانی اور اخلاقی نقصان جو اس کے کھانے سے انسان کو پہنچتا ہے، جیسا کہ ڈاکٹروں نے ثابت کیا ہے۔ وہ سُؤر کی ہر اس چیز میں پائی جاتی ہے۔ جو کھائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا گوشت کھانا تو نصِ صریح کی رُو سے حرام ہوا اور باقی چیزوں کا کھانا مساوی قیاس کی رو سے۔

خامساً: جمہور فقہاء کے نزدیک سُؤر نجس العین ہے، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پاک غالباً استاذ سیف الدین نے امام مالکؒ کے نزدیک سُؤر کی طہارت اور ان اشیاء کی طہارت سے متعلق فتویٰ دیکھا جو سُؤر کی چربی سے حاصل کی جاتی ہیں یا جن میں اس کی چربی ڈالی جاتی ہے جیسے صابون وغیرہ اور پھر اُسے بھول گئے۔ انہوں نے غالباً یہ گمان کیا کہ وہ فتویٰ سُؤر کی چربی کا کھانا حلال ہونے سے متعلق تھا۔

مختصر یہ کہ سُؤر کی ہر وہ چیز جو کھائی جاتی ہے، حرام ہے جہاں تک اس کے گوشت کا تعلق ہے۔

اور ہمارے نزدیک مختار (صحیح رائے) یہ ہے کہ گوشت میں چربی اور ہر وہ چیز شامل ہے جو کھائی جاتی ہے۔ وہ نص قرآنی اور جمہور کے قول کے مطابق اجماع (اس کے خلاف رائے رکھنے والے ظاہریہ کو نظر انداز کرتے ہوئے) کی رُو سے حرام ہے۔ اور اس کی چربی، اس قول کے باوجود کہ اس پر لفظ لحم کا اطلاق نہیں ہوتا، دلالت مجاز کی رُو سے اس لئے کہ لحم خنزیر سے مراد پورا خنزیر ہے، اور قیاس بھی اسی امر کا تقاضا کرتا ہے (کہ سُؤر چونکہ نجس العین ہے لہٰذا اس کی ہر چیز حرام ہو) [۱]

سُؤر کی نجاست

جمہور فقہاء کے نزدیک جن میں ائمہ ثلاثہ یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ شامل ہیں، سُؤر اپنے تمام اجزاء کے ساتھ نجس ہے۔

حضرت امام مالکؒ کی رائے میں وہ پاک ہے لیکن اس کا گوشت کھانا اس لئے حرام قرار دیا گیا ہے کہ دراصل حرمت گوشت ہی کے بارے میں ہے۔ اور ظاہر اس لئے کہ آپ کے نزدیک طہارت کی علت زندگی ہے اور نجاست کی علت موت [۲]۔

---

[۱] - کہا جاتا ہے کہ سُؤر کا گوشت کھانے سے انسان کے جسم میں دودۃ الشریطیہ کے علاوہ دودۃ الشعرۃ الحلزونیہ (خاص قسم کے کیڑے) بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ اس کے گوشت میں چربی کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے اس لئے وہ دوسرے ہر جانور کے گوشت کی نسبت بہت مشکل سے ہضم ہوتا ہے بعلاوہ ازیں سُؤر کے گوشت میں طفیلی کیڑے بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں جو آنتوں کو پھاڑ دیتے ہیں۔ اور عضلات میں پہنچ کر بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں جس سے ایک نہایت خطرناک مرض پیدا ہوتا ہے جو معدہ سے شروع ہو کر جلد تک پھیل جاتا ہے اور انسان کو جلد کے پھٹنے، سر درد اور دبلا پے وغیرہ کی شکایات لاحق ہو جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ۱۲ فی صد لوگ اس مرض کے شکار ہیں جن میں سے تیس فیصد افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ سُؤر کی پسندیدہ ترین غذا گندگی اور غلاظت ہے۔

[۲] - دیکھئے احکام القرآن تالیف ابن العربی ۱/ ۵۴

سُؤر کے بالوں کا حکم :

فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف رائے ہے کہ آیا سُؤر کے بالوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے یا نہیں۔ امام شافعیؒ نے اس سے روکا ہے اور کہا ہے کہ سُؤر کے بالوں کو استعمال کرنا جائز نہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے کہ سینے پرونے میں سُؤر کے بالوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے امام محمدؒ نے اس مسئلے میں امام اعظمؒ کی موافقت کی ہے، اور امام اوزاعیؒ نے کہا ہے کہ اس میں کوئی بُرائی نہیں کہ سُؤر کے بالوں سے سلائی کا کام لیا جائے۔

روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا خنزیر کے بالوں سے جوتے گانٹھے جا سکتے ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا: "اس میں کوئی حرج نہیں"۔ امام قرطبی لکھتے ہیں کہ ابن خویز منداد نے کہا ہے کہ: "اس لئے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپؐ کے بعد موچی کا پیشہ موجود تھا اور ہمیں کوئی ایسی چیز معلوم نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے (یعنی سُؤر کے بالوں سے جوتے گانٹھنے کو) ناپسند فرمایا تھا، نہ آپؐ کے بعد ائمہ ہی میں سے کسی نے ایسا کیا اور جس چیز کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا وہ تو ایسی ہے کہ گویا اسے قانون کا درجہ حاصل ہو گیا۔

اب رہا یہ سوال کہ سُؤر کی کھال کا کیا حکم ہے؟ تو اس کے متعلق ہم انشاء اللہ کھالوں کی دباغت کے باب میں بحث کریں گے

۴۔ وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو

آیت کی رُو سے چوتھی حرام چیز وہ جانور ہے جسے ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے، جیسے کسی انسان یا حیوان یا پتھر کا نام پکارا جائے۔ یا اسے حضرت مسیحؑ یا کسی بت یا کسی اور چیز کے نام پر ذبح کیا جائے ایسے تمام جانوروں کا حکم یہ ہے کہ ان کا کھانا حلال نہیں۔[۱]

اہلال کے معنی اصل میں "آواز بلند کرنا" کے ہیں۔ کہا جاتا ہے:

---

[۱]: دیکھئے تفسیر القرطبی ۲/۲۲۳۔ احکام القرآن تالیف امام جصاص ۱/۱۵۳

"اَھل بکذا" یعنی اس نے اپنی آواز بلند کی۔ ابن احمر کسی صحرا کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یھل بالفرقد رکبانھا

کما یھل الراکب المعتمر

(شہسوار میدان میں نکل کر آوازیں بلند کرتے ہیں، جیسے عمرے کے لئے جانے والا سوار تسبیح و تہلیل کرتا ہے)

اسی سے اہلال الصبی و استھلالہ نکلا ہے یعنی بچہ کا اپنی ولادت کے وقت رونا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے کہ (آیت میں مذکور ما اھل بہ لغیر اللہ سے)

مراد وہ جانور ہے جو استھانوں اور بتوں کے لئے ذبح کیا جائے نہ کہ وہ جس پر حضرت مسیح علیہ السلام کا نام لیا گیا ہو [1]

اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں کہ اگر کسی مسلمان نے اپنے ذبیحے پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا تو اس کا ذبیحہ حرام ہے جسے کھایا نہیں جائے گا۔ لیکن اگر کوئی کتابی اپنے ذبیحے پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے تو آیا اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔

بعض اہل علم کی رائے ہے کہ ارشاد باری عز اسمہٗ

وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم

(کھانا ان کا جو دیئے گئے کتاب حلال ہے تمہارے لئے)

کے عموم کے پیش نظر ایسا ذبیحہ حلال ہے اور اس کا کھانا جائز ہے۔ لیکن اکثر فقہاء کہتے ہیں کہ آیت کریمہ

وما اھل بہ لغیر اللہ

(جس پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا)

کے عموم کے پیش نظر اس کا کھانا حرام ہے۔ یہی رائے صائب ہے۔ لیکن جہاں تک اہل کتاب کے ایسے ذبیحے کا تعلق ہے جس کے متعلق ہم نہیں جانتے کہ اس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں تو اس کا کھانا مباح ہے۔

حکمت تحریم:

غیر اللہ کے نام پہ ذبح کئے جانے والے جانور کو حرام قرار دینے کی حکمت یہ ہے کہ جو شخص اپنے ذبیحے پہ اللہ تعالیٰ

[1] دیکھئے تفسیر القرطبی ۲/۲۲۴

خالق کائنات کے سوا کسی اور کا نام لیتا ہے وہ اپنے اختیار کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس نعمت (یعنی جانور) کا خالق اور موجد اللہ سبحانہ تعالیٰ ہے۔ اسی نے یہ نعمت انسان کو عطا فرمائی اور اس کے تبضے اور تصرف میں دی، تاکہ اس کی عزت و تکریم اور انسانی مقام و مرتبہ میں اضافہ ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هو الّذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً

(وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب)

انسان کے لئے واجب تھا کہ وہ جانور کو ذبح کرتے وقت اس پر اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات میں سے کسی کا نام نہ لیتا کہ بیشک اللہ ہی اس نعمت کا خالق ہے اور اسی نے یہ انسان کو عطا فرمائی ہے لیکن جب اس نے یہ زیادتی کی کہ جانور کو اس کے خالق کے نام پر ذبح کرنے کے بجائے مخلوق کے نام پر ذبح کیا (بے شک انسان بڑا ہی ظالم اور ناشکرا ہے) تو اس ظلم کی سزا اُسے یہ ملی کہ اس نعمت کا کھانا اس کے لئے حرام قرار دے دیا گیا۔ یہ ایک منطقی اور معقول فیصلہ ہے جس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

مثال کے طور پر اگر کوئی حکومت خاص طور پر صدر مملکت سے متعلق کوئی قانون بنائے اور بعد میں اس پر یہ حق رکھے کہ جو شخص اس قانون کی خلاف ورزی کرے گا اسے ترقی نہیں ملے گی یا اسے ملازمت سے نکال دیا جائے گا یا جلاوطن کر دیا جائے گا یا وہ فلاں فلاں سہولتوں سے محروم ہو جائے گا، پھر بھی اگر کوئی شخص اس قانون کی خلاف ورزی کرے تو اس کی کیا سزا ہونی چاہیئے؟ کیا یہ بات معقول نہیں کہ اسے اپنے جرم کی پاداش میں ان تمام سزاؤں کا مستحق قرار دیا جائے؟

اگر انسان کو، جو خود مخلوق ہے اور کوئی حقیر سے حقیر چیز پیدا کرنے یا کوئی نعمت حاصل کرنے پر قادر نہیں، یہ حق ہے کہ وہ اپنے قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو سزا دے تو اللہ تعالیٰ جو ہر چیز کے خالق و مالک اور منعم حقیقی ہیں، انہیں یہ حق کیوں نہ ہو کہ اپنی نعمت کی ناشکری کرنے والے کو اس نعمت سے محروم کر دیں!

کہا جاتا ہے کہ جس شخص نے اپنے ذبیح پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لیا اس پر تو وہ ذبیحہ اس کے غلط تصرف کے باعث حرام ہو گیا لیکن دوسروں کا کیا قصور ہے کہ ان کے لئے بھی اس نعمت کو حرام قرار دے

دیا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص یہ جانتا اور یقین رکھتا ہے کہ ذبح کرنے والے نے جانور اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا ہے وہ گویا اس ذبیحہ میں ذبح کرنے والے کی موافقت اور مدد کرتا ہے، لہٰذا وہ بھی اس نعمت سے محروم رہے گا۔

۵۔ منخنقہ:

اس سے مراد وہ جانور ہے جس کا دم رسی کے پھندے یا کسی اور چیز سے گھٹ جائے اور اس سبب سے اس کی موت واقع ہو جائے۔ ایسا جانور مُردار کی طرح حرام ہے جس کا کھانا جائز نہیں، لیکن عرب جاہلیت کے لوگ اسے مباح سمجھتے تھے۔

۶۔ موقوذہ

موقوذہ اس جانور کو کہتے ہیں جو لاٹھی یا کسی اور چیز کے ذریعے شدید چوٹ لگنے کے باعث ہلاک ہو جائے۔ ایسا جانور بھی مُردار کے حکم میں ہے، یعنی اس کا کھانا حلال نہیں۔ جاہلی دور میں عرب کے لوگ موقوذہ جانور بھی کھا جاتے تھے۔

لیکن معراض یعنی چپٹے تیر کے ذریعے شکار کئے ہوئے جانور کے بارے میں فقہا کی آراء مختلف ہیں، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔

۷۔ متردیہ

جو جانور بلندی سے نیچے گرے اور مر جائے اسے متردیہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جو جانور کسی کنویں یا گڑھے میں گر کر مر جائے، یا تیر کھا کر بلندی سے نیچے گرے اور مر جائے وہ بھی متردیہ کہلاتا ہے جس کا کھانا حرام ہے یہی حکم اس جانور کا ہے جسے تیر لگے اور وہ پانی میں گر کر ہلاک ہو جائے۔ عرب کے لوگ متردیہ جانور کو بھی مباح سمجھتے تھے۔

۸۔ نطیحہ

نطیحہ ایسے جانور کو کہتے ہیں جسے کوئی دوسرا جانور ٹکر مارے اور وہ مر جائے۔ گویا نطیحہ منطوحہ (ٹکر لگ کر مرا ہوا جانور) کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ابو میسرہ نے اسے (نطیحہ کے بجائے) منطوحہ پڑھا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ٹکر مارنے والا جانور (یعنی ناطحہ) ہلاک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا بھی وہی حکم ہے جو منطوحہ کا یعنی دونوں کا کھانا حرام ہے۔

یہاں اس حقیقت کی جانب اشارہ کر دینا مناسب ہوگا کہ اسلامی شریعت کی رو سے جانوروں کی لڑائی جیسے بعض لوگ بیلوں، مینڈھوں اور مرغوں وغیرہ کو چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے لڑیں، قطعاً حرام ہے۔ مسلمانوں کو ایسے ظالمانہ افعال سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

۹۔ درندے کا کھایا ہوا جانور

اس سے مراد وہ جانور ہے جسے کوئی درندہ جانور شکار کرے اور اس سبب سے اس کی موت واقع ہو جائے۔ ایسے جانور کا کھانا حرام ہے۔ اور ہر وہ جانور جس کے کچلیاں یا پنجے (مخالب) ہوں درندہ کہلاتا ہے جیسے شیر، بھیڑیا، چیتا، گیدڑ اور باز وغیرہ۔

اس مسئلے میں تو فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں کہ درندہ جانور کا کھایا ہوا جانور حرام ہے البتہ ارشادِ باری عزاسمہ، الا ما ذکیتم (الا یہ کہ جسے تم نے ذبح کر لیا) کے بارے میں اُن کی آراء مختلف ہیں کہ آیا یہ استثناء متصل ہے یا منقطع؟

اکثر فقہاء جن میں ائمہ ثلاثہ یعنی حضرت امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) شامل ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ استثناء متصل ہے، یعنی جن اقسام کے جانوروں کا پہلے ذکر کیا گیا، جیسے منخنقہ، موقوذہ، متردیہ، نطیحہ اور جسے کسی درندے نے کھا لیا ہو، یہ استثناء ان کی طرف راجع ہے۔ چنانچہ ان جانوروں میں سے جسے زندہ پا لیا گیا اور ذبح کر لیا گیا اس کا کھانا حلال ہے۔

دوسرا قول حضرت امام مالکؒ کا ہے اور یہ اُن کا مشہور مذہب ہے۔ اس قول کی رُو سے یہ استثنا منقطع ہے، یعنی حرام کر دیئے گئے تم پر یہ سب جانور جن کا اوپر ذکر ہوا، الّا یہ کہ وہ جانور جنہیں تم ذبح کرو، پس ان کا کھانا تمہارے لئے مباح ہے سوائے ان مذکورہ جانوروں کے (کہ ان کا کھانا حلال نہیں)[1]

شرح الکبیر پر حاشیہ الدسوقی میں لکھا ہے کہ: اس بنا پر ارشاد باری تعالیٰ الّا ما ذکیتم میں استثنا متصل ہے یعنی الّا یہ کہ ان میں سے جن کو تم ذبح کر لو (وہ حلال ہیں)"

ہمارے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ استثنا متصل ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ منقطع ہو۔ متصل ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ: الّا یہ کہ ان جانوروں میں سے وہ جانور جس میں تمہاری ذکاۃ عمل کرے (یعنی جسے تم ذبح کرو اور وہ حلال ہو جائے) اور وہ جانور جس میں تمہاری ذکاۃ عمل کرے گی وہ ہوگا جو منفوذ المقاتل نہ[2] ہو۔ استثنا منقطع ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ: لیکن ان (مذکورہ بالا جانوروں) کے سوا جس جانور کو تم ذبح کرو وہ تمہارے لئے حرام نہ ہوگا جب کہ منفوذ المقاتل نہ ہو

مالکیہ کے نزدیک مقاتل:

مالکی فقہاء کے نزدیک جانور کے حصہ جسم کے پانچ مقامات مہلک ہیں اور ان کے زخمی ہونے سے ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے یعنی

۱۔ قطع النخاع، یعنی حرام مغز جو گردن کے پیچھے اور کمر میں ہوتا ہے، اس کا کٹ جانا۔

۲۔ نثر الدماغ، یعنی کھوپڑی کے اندر دماغ کا پھٹ جانا۔ چنانچہ اگر صرف سر پھٹا اور دماغ نہیں بکھرا

---

[1]: دیکھیئے تفسیر القرطبی ۶/۵۰، اور احکام القرآن تالیف ابن العربی ۵۴۰ اور احکام القرآن تالیف امام جصاص ۳/۲۹۹

[2]: منفوذ المقاتل سے مراد ایسا جانور ہے جسے زخم جسم کے کسی ایسے نازک حصے پر لگا ہو کہ اس کے سبب سے اس کی موت واقع ہونا یقینی ہو۔

تو اس میں کوئی ضرر نہیں ۔

۳ ۔ نثر الحشو یعنی پیٹ کے اندرونی اعضاء جیسے آنتیں ، جگر ، اور تلی وغیرہ کا بکھر جانا ، چنانچہ اگر پیٹ پھٹا لیکن آنتیں وغیرہ باہر نہ نکلیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ۔

۴ ۔ فری الودج یعنی شہ رگ کا اس طرح کٹ جانا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے سے جدا ہو جائے ۔ اگر شہ رگ پھٹ جائے لیکن اس کا ایک حصہ دوسرے سے جدا نہ ہو تو اس سلسلے میں مالکیہ کے دو قول ہیں ، اور اظہر قول کے مطابق ودجین یعنی دونوں شہ رگوں کا ایک ساتھ کٹ جانا مقتل ہے ، صرف ایک کا کٹنا مقتل نہیں ۔

۵ ۔ ثقب مصیر ، یعنی آنت میں سوراخ ہو جانا ، لیکن اس کا صرف شق ہو جانا مقتل نہیں ۔ یہی حکم اس جانور کا ہے جس کی اوجھ میں سوراخ ہو گیا ہو۔[1]

ابوطلحہ الاسدی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس بھیڑ کے بارے میں پوچھا جس کا پیٹ کسی بھیڑیے نے حملہ کرکے پھاڑ دیا ہو اور اس کی آنتیں بکھر گئی ہوں[2] لیکن اُسے ذبح کر لیا گیا ہو ، تو آپؓ نے فرمایا کھاؤ لیکن اس کی جو آنتیں بکھر چکی ہوں ، انہیں نہ کھاؤ ۔

اسحاق بن راہویہ نے کہا ہے کہ بھیڑ کے بارے میں سنت وہی ہے جو حضرت ابن عباسؓ نے بیان کی اس کا کھانا جائز ہوگا اگر وہ ابھی تک زندہ ہو اور اس کی ذبح کرنے کی جگہ صحیح سالم ہو ، خواہ اس کی آنتیں باہر نکل آئی ہوں ذبح کرتے وقت یہ دیکھا جائے گا کہ آیا وہ زندہ ہے یا مردہ ، یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اس جیسی زخمی بھیڑ ایسا زخم کھانے کے بعد زندہ رہتی ہے یا نہیں ۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس نے اس رائے کے خلاف کہا اس نے اکثر صحابہؓ اور عام علماء کی سنت کے خلاف کہا ۔

امام قرطبی فرماتے ہیں :

(آیت میں استثناء) مذکورہ جانوروں میں سے ہر اس جانور کی طرف راجع ہے جسے ذبح کر لیا گیا ہو (وہ آخال کر) اس میں جان باقی ہو اور ذکاۃ عمل کرے ۔ اس لئے کہ استثناء کا حق یہ ہے کہ اسے سابقہ کلام کی طرف لوٹایا جاتا اور کسی ایسی دلیل کے بغیر جسے تسلیم کرنا واجب ہو ، منقطع نہ کیا جائے ۔[3]

---

[1] ۔ دیکھیے الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی ۲/ ۱۱۳

[2] ۔ القرطبی ۶/ ۴۸ - ۵۰

امام قرطبی آگے چل کر لکھتے ہیں :

"ہمارے علماء نے مریض جانور کے بارے میں لکھا ہے کہ ہمارے مذہب کی رُو سے اسے ذبح کر لینا مطلقاً جائز ہے جب کہ اس میں جان باقی ہو، خواہ وہ ہلاکت کے قریب پہنچ گیا ہو۔ اے کاش میں سمجھ سکتا کہ مرض کے سبب قریب المرگ جانور میں پائی جانے والی باقی ماندہ زندگی اور درندہ جانور کے پھاڑے ہوئے جانور میں پائی جانے والی باقی ماندہ زندگی میں کیا فرق ہے کہ اس کا ذبح کر لینا مطلقاً جائز ہے اور اس کا ممنوع!)

جمہور فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ استثناء صرف منخنقہ، موقوذہ، متردیہ، نطیحہ اور درندے کے کھائے ہوئے جانور کی طرف راجع ہے نہ کہ ان سے پہلے مذکور اشیاء کی طرف۔

بعض فقہاء کا قول ہے کہ استثناء صرف اس جانور کی طرف راجع ہے جسے کسی درندے نے کھایا ہو، نہ کہ کسی اور کی طرف۔ لیکن اس قول پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔[1]

حق یہ ہے کہ اس مسئلے میں جمہور فقہاء کا قول کہ استثناء متصل ہے، صحیح ہے، اور منخنقہ اور اس کے بعد ذکر کیے گئے جانوروں کی طرف راجع ہے۔

حکمتِ تحریم :

مذکورہ بالا جانوروں یعنی منخنقہ، موقوذہ، متردیہ اور نطیحہ وغیرہ جانوروں کو حرام قرار دینے کی حکمت وہی ہے جو مُردار کو حرام ٹھہرانے کی ہے یعنی انہیں دیکھ کر دل میں کراہیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور صحیح طریقے سے ذبح نہ ہونے کے باعث ان کا خون گوشت میں جم جاتا ہے اور یہ تمام چیزیں انسانی صحت کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

جہاں تک اس جانور کا تعلق ہے جسے کسی درندے نے کھایا ہو، اسے حرام قرار دینے کی ایک حکمت تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی، اس کے علاوہ اس میں ایک اور حکمت یہ بھی ہے کہ اسلام مسلمانوں کے بارے میں یہ چاہتا ہے کہ وہ صاحبِ عظمت و شرف اور عزت دار ہوں، لہٰذا اُسے یہ بات پسند نہیں کہ مسلمان کوئی ایسا

---

[1] : دیکھیے امام جصاصؒ کی احکام القرآن ۳/۲۹۹

جانور کھائیں جسے کسی درندے نے شکار کیا ہو اور جو اس کا پس خوردہ اور فضلہ ہو

ا۔نُصُب پر ذبح کیا ہوا جانور :

اس آیت کریمہ کی رُو سے دسواں حرام جانور وہ ہے جسے نُصُب یعنی تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو۔نُصُب نصاب کی جمع ہے، یہ تین سو ساٹھ پتھر تھے جو کعبے کے آس پاس نصب تھے۔ اہل جاہلیت ان پر جانور ذبح کیا کرتے تھے، جب اسلام آیا تو اُس نے اسے حرام قرار دے دیا۔

قطرب کہتے ہیں کہ ابن زید کی رائے ہے: **ما ذبح على النصب** (جو ذبح کیا گیا تھانوں پر) اور **ما اهل به لغير الله** (جس پر نام پکارا گیا اللہ کے سوا کسی اور کا) سے ایک ہی چیز مُراد ہے" (یعنی وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے لئے ذبح کیا جائے)

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ: **ماذبح على النصب** جزء ہے **ما اهل به لغير الله** کا لیکن اس کی جنس کا ذکر کرنے کے بعد خصوصیت سے اس کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہ چیز عرب میں بہت مشہور تھی لوگ ان پتھروں کو بہت مقدس سمجھتے تھے اور ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔[1]

نُصُب یعنی استھانوں پر ذبح کئے جانے والے جانوروں کو حرام قرار دینے کی حکمت بھی وہی ہے جو اُن جانوروں کی جنہیں اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا جائے۔ واللہ اعلم۔

---

[1] ۔ القرطبی ۶/۵۷

دوسری فصل

نصِّ سنت کی رُو سے حرام جانور

یہ فصل پانچ مباحث پر مشتمل ہے:

پہلی بحث : حرام وحشی جانور
دوسری بحث : حرام پرندے
تیسری بحث : حرام گھریلو جانور
چوتھی بحث : حرام آبی اور جل تھلیا جانور
پانچویں بحث : حرام حشرات

پہلی بحث
حرام وحشی جانور

حضرت ابو ثعلبہ الخشنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی حدیث شریف میں آیا ہے کہ: "حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام کچلیوں والے درندوں (سباع) اور پنجوں سے شکار کرنے والے تمام پرندوں کے کھانے سے منع فرمایا۔"[1]

---

[1]: یہ حدیث امام بخاری اور امام ابو داؤدؒ کے سوا بہت سے محدثین نے روایت کی ہے۔ دیکھئے امام نوویؒ کی شرح مسلم ۱۳/۸۲۔

اس مضمون کی اور بھی بہت سی روایات ہیں جو کتب احادیث میں نقل کی گئی ہیں۔

کچلی کو عربی میں ناب کہتے ہیں جس کی جمع انیاب آتی ہے۔ یہ دانت رباعیہ دانتوں کے پیچھے ہوتے ہیں۔ ابن سینا رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ کوئی حیوان ایسا نہیں جس کے کچلیاں بھی ہوں اور سینگ بھی

القاموس میں ہے: "السبع" (ب کے پیش اور زبر کے ساتھ) کے معنی ہیں شکار کرنے والا جانور۔

اس مسئلے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ شکار کرنے والے جانور کون کون سے ہیں حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ جو جانور گوشت کھائے وہ سبع (درندہ، شکاری) ہے۔ جیسے ہاتھی، بجو، یربوع، بلی، شیر، چیتا، بھیڑیا، گیدڑ اور لومڑی

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ درندوں میں صرف وہ جانور حرام ہیں جو انسان پر حملہ کریں جیسے شیر، چیتا اور بھیڑیا وغیرہ لیکن بجو اور لومڑی حلال ہیں کیونکہ وہ انسان پر حملہ نہیں کرتے۔ [لہ]

امام احمدؒ نے بجو کے حلال ہونے سے متعلق امام شافعیؒ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن لومڑی کے بارے میں اُن کی دو روایتیں ہیں۔ (ایک کی رُو سے حرام اور دوسری کی رُو سے حلال)

کچلیوں والے جن جانوروں کے متعلق جمہور فقہاء، جن میں ائمہ ثلاثہ یعنی حضرت امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور احمدؒ شامل ہیں، کا اتفاق ہے کہ اُن کا کھانا حرام ہے وہ شیر، چیتا، تیندوا، بھیڑیا، ریچھ، بندر، گیدڑ، بلی اور لنگور ہیں۔

امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ کچلی والے جانوروں کا کھانا حرام نہیں، البتہ مکروہ ہے۔

جمہور فقہاء نے کچلی والے جانوروں کا کھانا حرام ٹھہرانے میں حضرت ابو ثعلبہ الخشنیؓ کی اُس حدیث سے استناد کیا ہے جو اوپر نقل کی گئی، اور امام مالک آیت کریمہ:

قل لا اجد فیما اوحی الیّ محرمًا (الانعام: آیت نمبر ۱۴۵)

(تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں کہ مجھ کو پہنچی ہے کسی چیز کو حرام ....)

لہ۔ دیکھئے نیل الاوطار ۱۳۱/۶ - بدایۃ المجتہد ۴۵۴/۱ کفایۃ الاخیار ۲۵۹/۲

کے عموم سے احتجاج کرتے ہیں

سیہی[1]، یربوع[2]، ضب[3] (گوہ)، ضبع[4] اور نیولے کے حلال ہونے سے متعلق فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ تمام جانور حلال ہیں۔ اسی طرح اُن کے نزدیک لومڑی اور وبر[5] بھی حلال ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضب (گوہ)، یربوع اور وبر کا کھانا مکروہ ہے، جبکہ وہ سیہی، بجو، لومڑی اور نیولے کو حرام سمجھتے ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے بجو، گوہ اور یربوع کو حلال قرار دیا ہے لیکن لومڑی، سیہی اور نیولے کو وہ حرام سمجھتے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ تمام جانور ارشاد باری تعالیٰ:

قل لا اجد فیما اوحی الی محرماً

کے عموم کے پیش نظر حلال ہیں۔

جو فقہاء، بجو (ضبع) کو حلال سمجھتے ہیں ان کی دلیل عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ابی عمار سے مروی یہ حدیث ہے کہ:

---

[1] : عرب میں اس کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں: ایک مصر میں جو بڑے چوہے کے برابر ہوتی ہے اور دوسری شام میں جو کتے کے برابر ہوتی ہے۔ یہ جانور سانپ کو بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ (حیوٰۃ الحیوان، تالیف الدمیری ۲/۲۳۲

[2] ۔ یہ چوہے سے ملتا جلتا ایک جانور ہوتا ہے جس کی پچھلی ٹانگیں، زرافہ کے برعکس، اگلی ٹانگوں سے لمبی ہوتی ہیں (حیوٰۃ الحیوان، تالیف الدمیری ۲/۴۳۶)

[3] ۔ یہ جانور تقریباً سات سو سال تک زندہ رہتا ہے اور کبھی پانی نہیں پیتا۔ چالیس دن میں ایک بار پیشاب کرتا ہے۔ نر اور مادہ دونوں کی دو دو فرج ہوتی ہیں۔ اس کی شکل بڑی چھپکلی سے ملتی جلتی ہے (حیوٰۃ الحیوان ۱/۶۲۶ -

[4] ۔ ضبع (بجو) کی مادہ کو عربی میں ضبعان کہتے ہیں نر کو ضبعہ۔ اس کے متعلق عجیب بات یہ ہے کہ یہ ایک سال
(باقی حواشی اگلے صفحہ پر)

"میں نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کیا میں بجو کا شکار کروں؟ انہوں نے کہا ، ہاں ، میں نے کہا کیا میں اسے کھاؤں ؟ انہوں نے کہا ہاں . میں نے کہا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے ؟ انہوں نے کہا ہاں"[1]

لیکن جو فقہا یعنی جمہور اسے حرام سمجھتے ہیں ، وہ مندرجہ ذیل دلائل سے استناد کرتے ہیں :

اولاً یہ کہ وہ کچلی والا جانور ہے اور کچلی والے جانوروں کی عام حرمت سباع کے ضمن میں بیان ہو چکی ہے بہر حال وہ اُن جانوروں میں سے ہے جنہیں سباع کہا جاتا ہے اور جس کے کچلیاں ہوتی ہیں ۔

ثانیاً وہ حدیث جو خزیمہ بن جزءؓ نے روایت کی ہے اور جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بجو کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے کہا کیا کوئی انسان ایسا بھی ہے جو بجو کو کھاتا ہو؟[2]

(گذشتہ صفحہ کے باقی حواشی)

نر رہتا ہے اور ایک سال تک مادہ - نر ہونے کی حالت میں گابھن ہوتا ہے اور مادہ ہونے کی حالت میں بچے دیتا ہے انسانی گوشت کھانے کا بہت شوقین ہے اور اسی وجہ سے قبریں کھود دیتا ہے . اسے حیض آتا ہے ۔ اس کی کند ذہنی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ سویا پڑا رہتا ہے یہاں تک کہ شکار ہو جاتا ہے ۔ یہ جانور مُردار کھاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بچوں کو چرا لیتا ہے - رات کے وقت باہر نکلتا ہے - اس کی اگلی ٹانگیں پچھلی ٹانگوں کی نسبت لمبی ہوتی ہیں ۔ بجو کی وہ قسم جس کے جسم پر دھاریاں ہوتی ہیں ، ایران ، پاکستان و ہند اور شمالی افریقہ میں رہتی ہے اور نقطہ دار قسم افریقہ میں ۔ (الموسوعۃ الحدیثۃ اور حیوٰۃ الحیوان تالیف الدمیری ۱/۴۰۶ ۔

ھ . لومڑی ایک گوشت خور شکاری جانور ہے جس کی پوستین لمبی اور گھنی ہوتی ہے اور دُم موٹی اور لمبی ۔ چالاکی ، مکر و فریب اور دھوکا دینے میں ضرب المثل ہے ۔

۶ ۔ مٹیالے یا سفید رنگ کا یہ صحرائی جانور بلی کے برابر ہوتا ہے ۔ اس کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں . بڑا شرمیلا جانور ہے ۔ کھائیوں میں پایا جاتا ہے ۔

[1] ۔ یہ حدیث بخاری کے علاوہ صحاح کی پانچ کتابوں میں نقل کی گئی اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے ۔ دیکھئے ابن ماجہ ۲/۱۰۷۸

[2] ۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے ۔ اس میں ایک راوی عبد الکریم بن ابی امیہ ہے جو ضعیف ہے ۔ اسی طرح اس سے روایت کرنے والا اسماعیل بن مسلم ہے جو ضعیف ہے ۔ دیکھئے الروض النضیر ۳/۲۰۰

ثالثاً: بجو کو حرام سمجھنے والے فقہاء عبدالرحمن بن ابی عمارہ کی روایت کردہ حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ حدیث تنہا اسی نے روایت کی ہے اور وہ علم کے نقل کرنے میں مشہور نہیں۔ اور نہ اس کا شمار ایسے لوگوں میں کیا جاتا ہے جن کی رائے سے استناد اس صورت میں بھی کیا جاتا ہے جب کہ مخالف کی لئے اس کی رائے سے زیادہ قوی ہو۔ ابو عمر نے کہا ہے کہ کچلی والے تمام درندہ جانوروں کے کھانے کی ممانعت متواتر طرق سے روایت کی گئی ہے اور اسے ثقہ اماموں کی ایک پوری جماعت نے روایت کیا ہے لہٰذا محال ہے کہ حدیث ابی عمارہ جیسی حدیث کے پیش نظر اس کی مخالفت کی جائے[1]

ابن عربی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند ثابت نہیں ہے۔

بجو کو حرام سمجھنے والے فقہاء کہتے ہیں کہ اگر حدیث عبدالرحمن بن ابی عمارہ کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے (تب بھی بجو کا کھانا حلال نہ ہو گا) کیونکہ اس صورت میں اباحت اور ممانعت ایک جگہ جمع ہو جائیں گی اور احتیاط کے طور پر ممانعت کو ترجیح دینا واجب ہو گا۔

حق یہ ہے کہ بجو کی حرمت کے بارے میں جمہور فقہاء کا قول قوی ہے۔ اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں

اولاً یہ کہ اللہ رب العزت اپنی کتاب کریم میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

ویحرّم علیہم الخبائث

(اور حرام کرتا ہے اُن کے لئے خبیث چیزیں)

اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ بجو خبیث چیزیں، جیسے مُردار، مُردہ انسانوں کا گوشت اور اسی طرح کی دیگر گندی چیزیں کھاتا ہے۔ چونکہ اُس کی پرورش گندی غذا سے ہوتی ہے اس لئے وہ خبیث ہے۔

ثانیاً وہ کچلی والا جانور ہے اور کچلی والے تمام جانوروں کی عام حُرمت حدیث شریف میں وارد ہے یہ بات معلوم ہے کہ درندوں (السباع) کو اس لئے حرام ٹھہرایا گیا کہ وہ ناپاک اور گندہ گوشت کھاتے ہیں

ثالثاً حضرت خزیمہؓ کی مذکورہ بالا حدیث (جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بجو ایسی چیز نہیں جسے انسان کھائے)

---

[1] - القرطبی ۱۲۱/۷

رابعاً جیسا کہ مشہور ہے وہ مُردہ انسانوں کا گوشت کھانے کے لئے قبریں کھودنے کا شوقین ہے اور بچوں کو چرالے جاتا ہے۔ یہ چیز اسے حرام قرار دینے کے لئے کافی وجہ جواز ہے۔

درندوں کو حرام قرار دینے کی علت بیان کرتے ہوئے امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ صرف وہ درندے حرام ہیں جو انسانوں پر حملہ آور ہوتے ہیں درآنحالیکہ وہ (یعنی انسان) زندہ ہوتے ہیں۔ لہذا اس جانور کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو انسانوں پر اس وقت حملہ آور ہو جب وہ مُردہ ہوں؟ اس کا حرام ہونا تو اولیٰ تر ہے۔

رہی حدیث عبدالرحمٰن بن عبداللہ تو وہ ان تمام دلائل کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ واللہ اعلم

جہاں تک گود کے حرام یا حلال ہونے کا تعلق ہے، اس ضمن میں اباحت کے قائل فقہاء حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت خالدؓ بن ولید سے روایت کی ہے کہ حضرت خالدؓ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت میمونہؓ کے گھر گئے (حضرت میمونہ اُن کی اور حضرت ابن عباسؓ کی خالہ تھیں) تو ان کے پاس بھنی ہوئی گوہ تھی جو انہیں اُن کی بہن حفیدہ بنت حارث نے نجد سے بھیجی تھی۔ انہوں نے وہ گوہ حضورؐ کے سامنے پیش کی اور آپؐ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ایک عورتؓ نے جو وہاں موجود تھی کہا حضورؐ کو بتاؤ بھی تو جو چیز تم نے پیش کی ہے کیا ہے؟ اس پر حضرت میمونہؓ نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ گوہ ہے یہ سن کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ اُٹھالیا تو حضرت خالدؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ کیا گوہ حرام ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، لیکن چونکہ میری قوم کی سرزمین میں نہیں ہوتی میں اس سے کراہیت محسوس کرتا ہوں۔ حضرت خالدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اسے اپنے سامنے گھسیٹ لیا اور کھایا۔ حضورؐ مجھے کھاتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن منع نہیں فرمایا۔[1]

لیکن جو فقہاء اسے مکروہ سمجھتے ہیں وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گوہ پیش کی گئی تو آپؐ نے اسے

---

[1] اس حدیث کو امام ترمذی کے سوا بہت سے محدثین نے روایت کیا ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۸/۱۳۳ - ابن ماجہ ۲/۱۰۸۰

نہیں کھایا۔ پھر ایک سائل آیا تو حضرت عائشہؓ نے چاہا، اسے دے دیں۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے فرمایا: "جو چیز خود نہیں کھاتیں دوسرے کو کیوں دے رہی ہو؟"[۱]

امام شوکانیؒ علامہ ابن حجرؒ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شخص گوہ کو گندہ سمجھتا ہے اس کے حق میں گوہ کا کھانا مکروہ تنزیہی ہے۔ اور اس کی اباحت سے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں انہیں اس شخص کے حق میں سمجھا جائے گا جو اسے گندہ نہیں سمجھتا۔[۲]

گوہ کے کھانے نہ کھانے کے سلسلے میں وارد مختلف احادیث کے درمیان تطبیق کی یہ صورت نہایت عمدہ ہے۔

یہاں یہ بات بتادینا ضروری ہے کہ گوہ سبز گھاس کھاتی ہے۔

جہاں تک یربوع کا تعلق ہے اس کے بارے میں ایک ضعیف حدیث وارد ہے لیکن نیولے اور وبر کے متعلق کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی۔ چنانچہ جن فقہاء نے انہیں مباح کہا ہے اس اصول کی بناء پر کہا ہے کہ دراصل ہر چیز مباح ہے (الا یہ کہ اس کی حرمت پر کوئی دلیل قائم ہو جائے)۔

ہاتھی کو اکثر اہلِ علم نے حرام کہا ہے جن میں امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ شامل ہیں۔ امام شافعیؒ نے اُسے مکروہ قرار دیا ہے۔

جن فقہاء نے اسے حرام کہا ہے وہ اسے درندہ (سبع) سمجھتے ہیں اور جنہوں نے حرام نہیں کہا وہ اسے درندہ نہیں سمجھتے۔

دوسری بحث: حرام پرندے

جمہور فقہاء کا اس مسئلے میں اتفاق ہے کہ پنجوں سے شکار کرنے والے پرندے جو دیگر پرندوں کا شکار کرتے ہیں، حرام ہیں، جیسے شکرا، باز، عقاب، باشق اور شاہین وغیرہ۔ اسی طرح اکثر فقہاء

---

[۱] اسے امام طحاویؒ نے روایت کیا ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۸/۱۳۶ - ابن ماجہ ۲/۱۰۸۰

[۲] دیکھئے نیل الاوطار ۸/۱۳۶۔

کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ مُردار کھانے والے پرندے جیسے گدھ، رخمہ، بغاثہ[1]، سیاہ اور سفید دھبوں والا کوّا اور بڑا کالا کوّا جو پہاڑوں میں رہتا ہے حرام ہے۔ لیکن کھیتوں کا چھوٹا کوّا جو دانے کھاتا ہے، جس کی چونچ اور ٹانگیں لال ہوتی ہیں اور جیسے زاغ کہا جاتا ہے اس کے حلال ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

ہُدہُد اور صرد[3] (سبز ہدہد) کے حرام ہونے پر علماء کا اتفاق ہے لیکن امام احمدؒ سے ان کے بارے میں دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک کی رُو سے یہ دونوں پرندے حلال ہیں اور دوسری کی رُو سے حرام لیکن ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ انہیں گندہ سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ کہ روایات میں انہیں مارنے کی ممانعت وارد ہے۔

امام مالکؒ ارشاد باری تعالیٰ: قل لا اجد فیما اوحی الیّ محرماً کے عموم کے مطابق ان سب کو حلال سمجھتے ہیں۔

تیسری بحث: حرام پالتو جانور

جمہور فقہاء کا اس مسئلے میں اتفاق ہے کہ پالتو بلّی کا کھانا حرام ہے۔ ایک تو اس لئے کہ وہ کچلی دار جانور ہے، اور دوسرے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلّی کا گوشت اور اس کی قیمت کھانے سے منع فرمایا[4]۔

---

[1] - یہ ایک گدھ سے ملتا جلتا سیاہ و سفید دھبّوں والا پرندہ ہوتا ہے جس کی اڑان سست اور چونچ زرد ہوتی ہے۔

[2] خاکستری رنگ کا اُلّو کی نوع کا ایک پرندہ ہوتا ہے جس کی اڑان سست ہوتی ہے۔ اس کی تمام انواع جیسے ہامہ، صدی اور ضوع وغیرہ سب حرام ہیں۔ (دیکھئے تلیوبی وعمیرہ ۲۵۹/۴)

[3] - صرد (ریشں اور دم کے ساتھ) ایک شکاری پرندہ۔

[4] - یہ حدیث ابوداؤد، ابن ماجہ اور ترمذی میں روایت کی گئی ہے اس کی سند میں ایک راوی عمر بن زید الصنعانی ہے جس کے متعلق المنذری اور ابن حبان نے کہا ہے کہ اس سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ (دیکھئے نیل الاوطار ۱۳۲/۸

اسی طرح جمہور فقہاء کی یہ متفقہ رائے ہے کہ پالتو گدھے کا گوشت حرام ہے، اس لئے کہ اس کی حرمت سے متعلق بہت سی احادیث وارد ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو ثعلبہ الخشنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پالتو گدھے کا گوشت حرام ٹھہرایا۔[1]

اس سلسلے میں حضرت براء بن عازب، ابن عمر، ابن ابی اوفیٰ، زاہر الاسلمی، عمرو بن دینار اور ابوہریرہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے جو احادیث مروی ہیں اُن سب میں پالتو گدھے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

خچر کی حرمت پر بھی جمہور فقہاء کا اتفاق ہے، کیونکہ حضرت جابرؓ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ "ہم نے خیبر کی جنگ میں گھوڑے، گدھے اور خچر ذبح کئے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں گدھے اور خچر کا گوشت کھانے سے منع فرمایا اور گھوڑے کے گوشت سے نہیں روکا۔"

اکثر اہل علم کے نزدیک پالتو گدھی کا دودھ حرام ہے، لیکن امام عطاءؒ طاؤسؒ اور زہریؒ نے اس کی اجازت دی ہے۔[2]

امام مالکؒ نے پالتو گدھے اور خچر کو حرام نہیں ٹھہرایا لیکن مروی ہے کہ اُن کے نزدیک یہ جانور مکروہ ہیں اور ان کی کراہیت کچلی والے جانوروں کی کراہیت سے زیادہ ہے۔[3]

گھوڑے کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ جمہور فقہاء جن میں امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام ابو یوسف اور امام محمدؒ (امام ابوحنیفہؒ کے دو شاگرد) شامل ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ "حدیث جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خیبر کی جنگ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا اور گھوڑے کا گوشت کھانے کی اجازت دی" کے مطابق گھوڑے کا گوشت کھانا جائز ہے۔[4]

---

[1]۔ متفق علیہ دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۱۲/۹۴

[2]۔ دیکھئے المغنی ۸/۵۸۸

[3]۔ دیکھئے الافصاح، ۴۰۴/۲

[4]۔ متفق علیہ دیکھئے مسلم شریف مع شرح نووی ۱۳/۹۵

اسی طرح حضرت اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ایک روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے کہا:
"ہم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں گھوڑا نحر (ذبح) کیا اور اسے کھایا، جب کہ ہم مدینے میں تھے۔" [1]

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض مالکیہ نے گھوڑے کو مکروہ قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسے حرام سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے مندرجہ ذیل دلائل پر مبنی ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ (النحل: آیت نمبر)

(اور گھوڑے پیدا کئے اور خچریں اور گدھے کہ ان پر سوار ہو اور زینت کے لئے۔)

اس آیت کے لفظ "لترکبوھا" میں لام تعلیل کے لئے آیا ہے یعنی وہ (گھوڑا) نہیں پیدا کیا گیا مگر سواری کے لئے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر یہ احسان جتایا ہے کہ اس نے ان کے لئے گھوڑے، گدھے اور خچر پیدا کئے تاکہ وہ اُن پر سوار ہوں۔ اگر یہ جانور کھانے کے لئے ہوتے تو قرآن کریم بطریق اولیٰ اس کی صراحت کرتا (اور کہتا کہ ان کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے)۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں آیت میں لام تعلیل کے لئے ہے لیکن یہ نہیں مانتے کہ وہ حصر کے لئے ہے (یعنی آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ یہ جانور صرف سواری کے لئے ہیں)، کیونکہ بالاتفاق ان سے سواری کے سوا اور کام بھی لئے جاتے ہیں۔ [2]

۲۔ یہ فقہاء حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید سے مروی اس حدیث سے بھی استناد کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے، خچر اور گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔ [3]

امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے یہ حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے:

"(حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے) فرمایا: میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ خیبر میں شریک

---

[1]: متفق علیہ دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۹۶

[2]: دیکھئے نیل الاوطار ۸/۱۲۷

[3]: یہ حدیث امام ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے دیکھئے ابن ماجہ ۲/۱۰۶۶

تھا۔ اس جنگ میں یہودی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شکایت کی کہ لوگ ہمارے (جانوروں کی) باڑوں پر چڑھ دوڑے ہیں (اور جانوروں کو پکڑ کر لے گئے ہیں) اس پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آگاہ رہو تمہارے لئے معاہدین کا اموال حلال نہیں مگر حق کے ساتھ۔ اور حرام ہیں تم پر پالتو گدھے، گھوڑے اور خچر اور تمام کچلیوں والے درندے اور پنجوں سے شکار کرنے والے پرندے۔

اسی طرح یہ حدیث واقدی نے امام داؤدؒ کے الفاظ میں المغازی میں روایت کی ہے اور کہا ہے کہ "ہمارے نزدیک یہ ثابت ہوگئی ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید غزوۂ خیبر میں شریک نہ تھے۔ وہ اور حضرت عمروؓ بن العاص فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے اور حضرت عثمان بن ابی طلحہ صفر ۸ھ کی پہلی تاریخ کو مسلمان ہوئے۔

امام بیہقیؒ نے المعرفہ میں لکھا ہے کہ اس حدیث کی اسناد میں اضطراب ہے اور یہ ثقہ محدثین کی حدیث کے خلاف ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ صالح بن یحییٰ بن المقدام محل نظر شخصیت ہے۔ ابن حبان نے اُن کا ذکر ثقہ لوگوں میں کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ غلطی کر جاتے ہیں۔

امام ابو داؤدؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ اور امام نسائیؒ نے فرمایا ہے کہ مجھے معلوم نہیں اس حدیث کو شعبہ کے سوا کسی اور نے روایت کیا ہو۔ خیال ہے کہ اگر یہ حدیث صحیح بھی ہے تو منسوخ ہو چکی ہے، اس لئے کہ حدیث جابرؓ کے الفاظ "اذن فی لحوم الخیل" (اجازت دی گئی گھوڑوں کے گوشت کی) اس پر دلالت کرتے ہیں۔

حازمی اپنی تالیف "کتاب الاعتبار" کے صفحہ ۱۴۳ پر لکھتے ہیں کہ "اذن" اور "رخصت" کے الفاظ اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ پہلے ممانعت تھی اگر یہ الفاظ وارد نہ ہوتے تو تاریخ معلوم نہ ہونے کے باعث قطعیت کے ساتھ نسخ کا حکم نہ لگایا جا سکتا کہ یہ حدیث منسوخ ہو چکی ہے لہٰذا اس حدیث کو منسوخ سمجھنا واجب ہے۔

پھر حازمی کچھ علماء کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ہے: "یہ حدیث منسوخ نہیں لیکن گھوڑے کا گوشت مباح ہونے سے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں اُن کی کثرت اور صحت پر اعتماد کرتے ہوئے بعض فقہاء رکھتے ہیں کہ: حدیث خالدؓ ایک معین قضیے کے بارے میں وارد ہوئی ہے اور وہ یہ کہ گھوڑے کا گوشت

حرام ہونے کا سبب خچر اور گدھے کا گوشت حرام ہونے کے سبب سے مختلف ہے۔ جہاں تک خچر اور گدھے کا تعلق ہے، ان دونوں جانوروں کا گوشت بالذات حرام قرار دیا گیا ہے لیکن گھوڑے کے گوشت سے منع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں نے جنگ خیبر کے دن مال غنیمت کے پانچ حصے کئے جانے سے قبل (یہودیوں کے گھوڑے پکڑنے اور انہیں ذبح کر کے) پکا لینے میں جلد بازی سے کام لیا تھا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر سختی کرنے کی غرض سے انہیں (گھوڑوں کا گوشت کھانے سے) روک دیا۔ لیکن جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ حضور گھوڑے، گدھے اور خچر کا گوشت کھانے سے منع فرما رہے ہیں تو انہوں نے سمجھا کہ ان تینوں جانوروں کی حرمت کا سبب ایک ہے۔ حتیٰ کہ جب حضور کے منادی نے یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرماتے ہیں کیونکہ وہ رجس (یعنی گندا) ہوتا ہے۔ تو اس وقت لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ گھوڑوں کا گوشت کھانے کی ممانعت اس وقت تک کے لئے تھی جب تک انہیں مال غنیمت کے طور پر پانچ حصوں میں تقسیم نہ کر لیا گیا۔ گویا الفاظ "اذن اور رخص" اسی شبہے کو رفع کرنے کے لئے لائے گئے ہیں۔ نہ یہ کہ یہ حدیث پہلے حکم کو منسوخ کرنے والی ہے۔ پھر انہوں نے امام داؤدؒ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہودیوں نے حضور سے شکایت کی کہ "لوگ اُن کے باڑوں پر چڑھ دوڑے ہیں"۔ (الحدیث)

۳۔ گھوڑے کے گوشت کو حرام سمجھنے والے فقہاء کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس کا گوشت خبیث (گندا) ہوتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضور لوگوں کے لئے گندی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں (ویحرم علیهم الخبائث)۔ گھوڑے کا گوشت کھانا اس لئے بھی حرام ہے کہ سلیم طبائع اسے اچھا نہیں سمجھتیں۔

۴۔ گھوڑے کو حرام سمجھنے کی چوتھی دلیل اجماع سے لائی جاتی ہے کہ خچر جو گھوڑی سے پیدا ہوتا ہے تمام علماء کے نزدیک بالاجماع حرام ہے۔ اگر اس کی ماں یعنی گھوڑی حلال ہوتی تو یقیناً وہ بھی حلال ہوتا کیونکہ بچے کا حکم وہی ہوتا ہے جو ماں کا۔ اس لئے کہ بچہ ماں کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ کیا آپ نہیں

لہ۔ دیکھئے نصب الرایہ ۴/۱۹۶ - ۱۹۹

مانتے کہ اگر وحشی گدھا پالتو گدھی سے ملے اور وہ بچہ دے تو اُس بچے کو نہیں کھایا جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی پالتو گدھا جنگلی گدھی سے ملے اور وہ گدھی بچہ دے تو اس بچے کا گوشت کھانا جائز ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حرام وحلال کے معاملے میں بچے کا حکم وہ ہوگا جو ماں کا نہ کہ باپ کا۔ (یعنی اگر ماں کا کھانا حلال ہو تو اس کے بچے کا کھانا بھی حلال ہوگا۔ خواہ باپ کا کھانا حلال ہو یا نہ ہو۔

گھوڑے کو حرام ٹھہراتے والے فقہاء حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اس حدیث کا کہ جنگوں کے دوران میں صحابۂ کرامؓ گھوڑوں کا گوشت کھاتے تھے، یہ جواب دیتے ہیں کہ صحابہؓ ضرورت کے وقت ایسا کرتے تھے۔ (جب کہ انہیں کھانے کے لئے کوئی اور چیز نہ ملتی تھی) علاوہ ازیں احتیاط کے نقطۂ نظر سے یہ بات بہتر ہے کہ ممانعت کو اباحت پر ترجیح دی جائے۔[۱]

ہم سمجھتے ہیں کہ اس معاملے میں جمہور فقہاء کی رائے کہ گھوڑا حلال ہے، ارجح ہے۔ اگر اس کی ممانعت سے متعلق واردشدہ احادیث صحیح بھی ہوں تو اُن کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ مبادا زیادہ تعداد میں ذبح ہونے کے باعث، گھوڑے کی نسل ہی منقطع ہو جائے۔

جلّالہ:

جلالہ اُس جانور کو کہا جاتا ہے جو گندگی کھائے۔ یہ لفظ جلہ سے لیا گیا ہے اور جلّہ اونٹ، بھیڑ بکری کی سوکھی مینگنیوں، گائے کے خشک گوبر اور مرغی کی خشک بیٹ وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔

احادیث میں ایسے جانور کا گوشت کھانے یا دودھ پینے سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جلّالہ کا دودھ پینے سے منع فرمایا۔[۲]

اسی طرح حضرت ابن عمرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جلّالہ

---

[۱]۔ دیکھئے بدائع الصنائع ۲۷۶/۷۔

[۲]۔ یہ حدیث ابن ماجہ کے سوا صحاح کی پانچوں کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔ اور امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔ دیکھئے نسائی ۲۱۲/۷

کا گوشت کھانے اور دودھ پینے سے منع فرمایا [1]

چنانچہ جمہور فقہاء جن میں ائمہ ثلاثہ حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ شامل ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ ایسے جانور کو محبوس رکھے بغیر اس کا کھانا مکروہ ہے اور اسے حبس میں رکھنا مستحب ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے مروی ایک روایت میں آیا ہے کہ گندگی کھانے والے پرندے اور اسی طرح اونٹ گائے اور بھیڑ بکری وغیرہ کو تین دن تک محبوس رکھنا چاہئے۔ ایک قول یہ ہے کہ اُسے چالیس دن محبوس رکھنا چاہئے۔

حضرت امام مالکؒ نے جلالہ کو محبوس رکھے بغیر اس کا کھانا جائز قرار دیا ہے [2]

اس امر پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی پالتو جانور جو حرام ہو، بھاگ کر جنگل میں چلا جائے اور وحشی ہو جائے تو اس صورت میں بھی وہ اپنی جنس کی طرح حرام ہی رہتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی جنگلی جانور انسان سے مانوس ہو جائے تو اس کا حکم بھی وہی رہتا ہے جو مانوس ہونے سے پہلے تھا [3]

چوتھی بحث : آبی جانور

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا فقہاء کا اس امر پر اجماع ہے کہ ہر قسم کی مچھلی جو سمندر سے پکڑی جائے۔ اس کا کھانا حلال ہے۔

لیکن جو مچھلی شکار ہوئے بغیر از خود سمندر میں مر گئی ہے، اس کے متعلق علماء کی آراء مختلف ہیں جمہور فقہاء - جن میں ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ شامل ہیں۔ کا قول ہے کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "سمندر کا پانی پاک کرنے والا اور اس کا مردہ حلال ہے" [4] کے عموم کے پیش نظر وہ

---

[1] - یہ حدیث نسائی کے علاوہ صحاح کی پانچوں کتابوں میں نقل کی گئی ہے دیکھئے ابن ماجہ ۲/۱۰۶۴

[2] - دیکھئے کفایۃ الاخیار ۲/۲۳۲، المغنی ۸/۱۹۳، بدائع الصنائع ۶/۲۷۶۳

[3] - احکام القرآن از امام جصاص ۴/۱۸۵۔

[4] - اس حدیث کو امام مالکؒ اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ دیکھئے نسائی ۷/۱۸۳

حلال ہے اور طافی (یعنی مُردہ حالت میں تیرنے والی) اور غیر طافی دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔

سمندر کی مُردہ مچھلی کا کھانا اس حدیث کی رُو سے بھی جائز ہے جو حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زیر قیادت عیص کے لشکر کے ساتھ جہاد کیا۔ ہمیں شدید بھوک لگی ہوئی تھی کہ سمندر نے ایک مُردہ مچھلی کنارے پر پھینک دی (یہ مچھلی اتنی بڑی تھی کہ) ہم نے ایسی مچھلی کبھی نہیں دیکھی۔ لوگ اُسے عنبر کہتے تھے۔ ہم پندرہ دن تک اس کا گوشت کھاتے رہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے اس کی ایک ہڈی اپنے ساتھ لے لی جو اتنی بڑی تھی کہ سوار آدمی اس کے نیچے سے گزر جاتا تھا۔ جب ہم مدینے پہنچے تو ہم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا: جو رزق اللہ عز وجل نے تمہارے لئے نکالا ہے اُسے کھاؤ۔ اگر (اس مچھلی کا کچھ) گوشت تمہارے پاس ہو تو ہمیں بھی کھلاؤ۔ چنانچہ بعض لوگ جن کے پاس اس مچھلی کا کچھ گوشت تھا۔ لے آئے جسے حضورؐ نے تناول فرمایا۔[1]

احناف اور زیدیہ کی رائے ہے کہ تیرتی ہوئی مُردہ مچھلی یعنی طافی کا کھانا مباح نہیں۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب الدر المختار میں وضاحت کی گئی ہے کہ طافی وہ مچھلی ہے جو اپنی موت مری ہو اور پانی کے اوپر اس طرح تیر رہی ہو کہ اس کا پیٹ اوپر کی طرف ہو۔ (یعنی اُلٹی تیر رہی ہو)۔ لیکن اگر اس کی پشت اُوپر کی طرف ہو اور پیٹ نیچے کی طرف ہو تو وہ طافی نہیں ہے۔ ایسی مچھلی کا کھانا حلال ہے۔ اس سلسلے میں احناف کی رائے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی اس حدیث پر قائم ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کو سمندر نے باہر پھینک دیا ہو، یا جسے سمندر کا پانی باہر چھوڑ کر نیچے اُتر گیا ہو اُسے کھاؤ، اور جو پانی میں مرگئی ہو اور اس کے اوپر تیرنے لگی ہو اُسے مت کھاؤ۔"[2]

احناف کہتے ہیں کہ جمہور فقہاء نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے وہ اتنی قوی نہیں کہ ان کی رُو سے قرآن مجید کی محکم آیت کی تخصیص کی جا سکے۔ طافی (مُردہ مچھلی) کی حرمت پر جو چیز دلالت کرتی ہے

---

[1] متفق علیہ۔ دیکھیے امام نووی کی شرح مسلم ۸۶/۱۳

[2] دیکھیے حاشیہ ابن عابدین ۳۰۷/۶

وہ ارشاد باری تعالیٰ

حرمت علیکم المیتۃ

(حرام کیا گیا تم پر مُردار) کا ظاہر ہے۔

غیر طافی کی تخصیص پر مسلمانوں کا اتفاق ہے لیکن طافی کے بارے میں وہ مختلف الرائے ہیں لہذا واجب ہے کہ اس کے متعلق عموم کے حکم پر عمل کیا جائے۔[1]

لیکن جس مچھلی کو سمندر کا پانی خشکی پر چھوڑ کر اُتر گیا ہو اور وہ مرگئی ہو۔ یا جسے سمندر نے خشکی پر پھینک دیا ہو۔ اس کا کھانا بلا اختلاف جائز ہے۔

سمندری حیوانات

اسی طرح سمندر کے اُن جانوروں سے متعلق بھی فقہاء کی آراء مختلف ہیں جن کی شکلیں خشکی کے حرام جانوروں سے ملتی جلتی ہوتی ہیں، جیسے سمندری کتا (کلب البحر) اور سمندری خنزیر۔ شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک ان کا کھانا حلال ہے۔ اس رائے کے حامل فقہاء ارشاد باری تعالیٰ:

احل لکم صید البحر

(حلال کیا گیا تمہارے لئے شکار سمندر کا)

کے عموم اور حدیثِ ذیل سے استدلال کرتے ہیں:

"اُس (یعنی سمندر) کا پانی پاک کرنے والا اور مُردہ حلال ہے"۔[2]

احناف کے نزدیک ایسے تمام جانور حرام ہیں، اور ایک قول شافعیہ کا بھی یہی ہے۔[3]

---

[1] - دیکھئے احکام القرآن از امام جصاص ۱/ ۱۳۴- ۱۳۵

[2] - یہ حدیث امام مالکؒ اور اصحاب سنن نے روایت کی ہے۔ دیکھئے نسائی ۷/ ۱۸۳

[3] دیکھئے نیل الاوطار ۸/ ۱۴۸، بدائع الصنائع ۶/ ۳۵۲۰، المجموع ۹/ ۲۶۔

خشکی اور پانی میں رہنے والے جانور

اسی طرح فقہاء اُن حیوانات کے متعلق بھی مختلف الرائے ہیں جو پانی اور خشکی دونوں جگہ رہتے ہیں جیسے کچھوا، مینڈک، مگرمچھ اور کیکڑا۔

امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ جو جانور خشکی اور تری دونوں جگہ رہتے ہیں، ان کا کھانا حرام ہے۔

مذہب امام احمدؒ کی رُو سے مگرمچھ حرام ہے کیونکہ وہ کچلی والا جانور ہے اسی طرح مینڈک کا کھانا بھی حرام ہے، اس لئے کہ احادیث میں اُسے مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن کچھوے کو اس کی ذکاۃ کے بعد اور کیکڑے کو بغیر ذکاۃ کھانے کی اجازت دی گئی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ تمام جانور حرام ہیں، کیونکہ انہیں خبائث میں شمار کیا جاتا ہے۔

امام مالکؒ مذکورہ بالا تمام جانوروں کو حلال سمجھتے ہیں، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ:

قل لا اجد فیما اُوحی الیّ محرماً

کے عموم سے یہی مستنبط ہوتا ہے۔[1]

پانچویں بحث: حرام کیڑے

جمہور فقہاء کا جن میں ائمہ ثلاثہ یعنی امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ شامل ہیں، اس امر پر اتفاق ہے کہ حشرات الارض، جیسے بچھو، سانپ، گبریلے، ٹڈے، چیونٹیاں، دیمک، ریشم کے کیڑے اور دیگر تمام اقسام کے کیڑے حرام ہیں، جن کا کھانا جائز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ویحرّم علیھم الخبآئث

(اور حرام کرتا ہے ان پر خبائث (گندی اور ناپاک چیزیں)

---

[1] دیکھئے بدائع الصنائع ۲۰۵۳/۲ - المغنی ۳۰۶/۸

اور یہ تمام کیڑے اور حشرات الارض خبیث ہیں

امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں :

" امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ طیبات (یعنی خوش ذائقہ چیزیں) ہی حلال ہیں ، گویا کہ انہوں نے لفظ طیب کے ساتھ حلال چیزوں کی تعریف کی کیونکہ اس میں مدح اور احترام کے معنی پائے جاتے ہیں ۔ اسی کے مطابق ہم یہ کہتے ہیں کہ خبیث چیزیں ہی حرام ہیں ۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ : سُور کا گوشت اور سُود وغیرہ ہی خبائث ہیں ۔

اسی اصول کے پیش نظر امام مالکؒ نے گندی چیزوں جیسے سانپ ، بچھو گبریلے اور اسی طرح کی دیگر چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے ۔

امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ طیب وہ چیز ہے جو ذائقے کے اعتبار سے اچھی ہو ۔ مگر ان کے نزدیک یہاں یہ لفظ اپنے عام معنوں میں استعمال نہیں ہوا کیونکہ اگر اس کے یہ عام معنی مراد لئے جائیں کہ طیب وہ ہے جو ذائقے میں اچھا ہے تو ایسی صورت میں تو اس کا مقتضیٰ یہ ہوگا کہ شراب اور خنزیر کو بھی حلال قرار دیا جائے چنانچہ اُن کے نزدیک یہ لفظ ان چیزوں کے لئے مخصوص ہے جنہیں شرع نے حلال قرار دیا ہو ۔ امام شافعیؒ کے نزدیک خبائث عام لفظ ہے اُن چیزوں کے لئے جنہیں شرع نے حرام قرار دیا ہو اور جو گندی اور ناپاک ہوں ۔ چنانچہ وہ بچھو ، گبریلے ، وزغ (بڑی چھپکلی) اور اسی طرح کی دیگر چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں بالعموم انہی دو آراء پر عمل بھی ہے [۱]

امام مالکؒ نے حشرات کی اباحت پر قولِ باری تعالیٰ : " قل لا اجد فیما اوحی الی محرماً " کے عموم سے استدلال کیا ہے ۔

اسی طرح انہوں نے چوہوں اور عظایہ (ایک قسم کی بڑی چھپکلی) کا کھانا بھی ان کی ذکاۃ (ذبح کرنے) کے بعد جائز قرار دیا ہے [۲] ۔ یہ قول ابن ابی لیلیٰ اور امام اوزاعی کا ہے لیکن وزغ (بڑی چھپکلی) کے بارے میں وہ

---

[۱] ۔ القرطبی ۷/ ۳۰۰

[۲] ۔ القرطبی ۷/ ۱۲۰

جمہور سے متفق ہیں کہ اُس کا کھانا حرام ہے [1]

کتاب "قوانین الاحکام الشرعیہ" میں لکھا ہے کہ :

"جواہر (کتاب) میں کہا گیا ہے کہ ہمارے مخالفین نے گندے سمجھے جانے والے حیوانات جیسے حشرات اور ہوام الارض کے بارے میں بیان کیا ہے کہ ہمارے مذہب کی رُو سے ان کا کھانا جائز ہے (لیکن ابن بشیر نے کہا ہے (کہ ہمارا مذہب اس کے خلاف ہے۔ امام شافعیؒ نے ان چیزوں کو حرام کہا ہے کیونکہ یہ خبیث ہیں۔ لیکن گھونگھے کو اگر اُبال لیا جائے یا بھون لیا جائے تو اس کا کھانا جائز ہے۔ لیکن جو خود مر گیا ہو اُسے کھانا جائز نہیں [2]

حق بات یہ ہے کہ حشرات خبیث ہیں، ان کا کھانا جائز نہیں۔ اس مسئلے میں اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (ویحرم علیهم الخبائث)

جہاں تک کھانے پینے کی چیزوں میں پیدا ہو جانے والے کیڑوں کا تعلق ہے جیسے سرکے، کھجور اور پھل وغیرہ کے کیڑے یا گھن تو اس مسئلے میں علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کھانے والے نے انہیں دیکھا نہ ہو تو یہ معاف ہیں اس لئے کہ انہیں دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی حکم شہد کی مکھی کے چھوٹے بچوں کا ہے جو موم کے اندر ہوں یہ قول امام شافعی کا ہے۔ [3]

اختلاف علماء

ارشاد باری تعالیٰ :

قل لا اجد فیما اوحی الیّ محرماً .....

(تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں کہ مجھ کو پہنچی ہے کسی چیز کو حرام ....)

(۶ : ۱۴۵)

کے متعلق اہل علم میں پائے جانے والے اختلاف کا تجزیہ :

---

[1] - المغنی ۸/۵۸۶

[2] - قوانین الاحکام الشرعیہ: ۱۸۱

[3] - قلیوبی وعمیرہ ۴/ ۲۴۱

پہلا قول

اکثر اہل علم کی رائے ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور اس آیت کے نزول کے وقت تک اسلامی شریعت میں، اُن چیزوں کے جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے، کوئی چیز حرام نہیں تھی۔ پھر مدینہ منورہ میں سورۂ مائدہ نازل ہوئی جس کی رُو سے محرمات میں منخنقہ، موقوذہ، متردیہ، نطیحہ، بالشوگدھے اور خچر وغیرہ کا اضافہ ہوا۔

اسی طرح مدینہ منورہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچلی والے تمام حیوانوں اور پنجوں (سے شکار کرنے) والے تمام پرندوں کو حرام قرار دیا۔ جہاں تک اس آیت (یعنی قل لا اجد فیما اوحی الیّ) کا تعلق ہے، اس کا مقصد بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کے بارے میں عرب جاہلیت کے غلط خیالات کو رد کرنا ہے کیونکہ ابو عمر نے کہا ہے کہ اس امر پر علماء کا اجماع ہے کہ سورۂ انعام مکی ہے۔

ابو عمر کہتے ہیں:

"جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں مذکور چیزوں کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں، تو ان کے اس قول سے تو لازم آتا ہے کہ وہ جانور بھی حرام نہ ہو جسے ذبح کرتے وقت بالارادہ اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اور خمر (یعنی شراب) کو جو تمام مسلمانوں کے نزدیک حرام ہے، حلال ٹھہرایا جائے۔ انگور کی شراب کے حرام ہونے پر جو مسلمانوں کا اجماع ہے اس سے یہ دلیل واضح طور پر نکلتی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی اُتری اُس میں، اُن چیزوں کے سوا، جن کی حرمت سورۂ انعام کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے اور چیزیں بھی حرام تھیں۔ جیسے وہ چیزیں جن کی حُرمت بعد میں نازل ہونے والی آیات میں بیان کی گئی۔" [1]

جیسا کہ امام قرطبیؒ نے کہا آیت کے معنی یہ ہیں کہ۔ اے محمدؐ! فرما دیجیے کہ نہیں پاتا میں حرام کسی چیز کو اُس وحی میں جو اُتری مجھ پر سوائے ان چیزوں کے (جو مذکور ہوئیں) نہ اُن چیزوں کو جنہیں تم اپنی خواہش سے حرام ٹھہراتے ہو۔

---

[1] ۔ تفسیر قرطبی ۷/۱۱۶

دوسرا قول:

یہ آیت اُس حدیث سے منسوخ ہے جس میں کچلی والے جانوروں اور پنجوں (سے شکار کرنے) والے پرندوں کا کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔

تیسرا قول:

یہ آیت محکم ہے۔ اور اُن چیزوں کے سوا، جن کی تفصیل اس میں بیان کی گئی ہے، کوئی چیز حرام نہیں، اسی لئے امام مالکؒ نے ان چیزوں کے سوا جن کی حرمت آیت سورہ مائدہ میں بیان ہوئی ہر چیز کو مباح قرار دیا ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں:

"اسی آیت کی بنیاد پر امام شافعیؒ نے ہر اس چیز کو حلال قرار دیا ہے جس کے بارے میں (شریعت نے) سکوت اختیار کیا ہو۔"

چوتھا قول:

یہ آیت مدنی ہے اور اس دن نازل ہوئی جس دن اللہ تعالیٰ کا قول: الیوم اکملت لکم دینکم اُترا۔ اس کے بعد کوئی ایسی آیت نازل نہیں ہوئی جو اس کی ناسخ ہو۔ چنانچہ ان چیزوں کے سوا جو اس میں بیان ہوئیں، کوئی چیز حرام نہیں۔ یہ قول ابن عربی کا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ میں اسی طرف مائل ہوں۔

امام قرطبی فرماتے ہیں:

یہ آیت علماء کے درمیان اختلاف کا سبب بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے اُن احادیث کے ظاہر سے انحراف کیا ہے جو کچلی والے جانوروں کی حرمت سے متعلق وارد ہوئی ہیں کیونکہ یہ آیت ان سے بعد کی ہے۔ اور اس میں جو حصر ہے وہ ظاہر ہے۔ لہذا اسی کو اختیار کرنا اولیٰ ہے کیونکہ یہ اپنے پہلے احکام کی ناسخ ہے اور ان احادیث پر ترجیح رکھتی ہے۔

لیکن جو لوگ (کچلی والے جانوروں کی) حرمت کے قائل ہیں اُن پر یہ چیز واضح اور ثابت ہو گئی ہے کہ سورۂ انعام مکی سورت ہے جو ہجرت سے قبل نازل ہوئی اور یہ کہ اس آیت کا مقصد دورِ جاہلیت کے اس غلط اعتقاد کی تردید کرنا تھا جو بحیرہ سائبہ، وصیلہ اور حام (جانوروں) کی حرمت سے متعلق عربوں میں موجود تھا اس آیت کے بعد بہت سی چیزیں حرام قرار دی گئیں جیسے پالتو گدھے اور خچر کا گوشت وغیرہ، نیز کچلی والے تمام جانور اور پنجوں (سے شکار کرنے) والے تمام پرندے۔"

عمرو بن دینار نے ابو الشعثاء سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: اہل جاہلیت کچھ چیزوں کو کھاتے تھے اور کچھ چیزوں کو چھوڑ دیتے تھے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو بھیجا اور اپنی کتاب نازل فرمائی اور اپنے حلال کو حلال کیا اور اپنے حرام کو حرام ٹھہرایا۔ پس جس کو حلال کیا وہ حلال ہے اور جس کو حرام ٹھہرایا وہ حرام ہے اور جن چیزوں کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی وہ معاف ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے یہی آیت قل لا اجد فیما اوحی الیّ محرماً تلاوت فرمائی۔ یعنی جب تک کسی چیز کی حرمت بیان نہ کر دی جائے آیت کے ظاہر کے مطابق وہ مباح ہے۔[1]

مذکورہ چیزیں حرام قرار دینے کی حکمت:

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اسلام ایک کامل اور مکمل دین ہے جو افراد اور جماعتوں کے لئے سراپا خیر و برکت ہے اس کے لئے ممکن نہیں تھا کہ کسی ایسی چیز کو مباح قرار دیتا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ انسان کے لئے کسی غذائی قدر و قیمت کی حامل نہیں، نہ اس سے انسان کا جسم نشوونما پاتا ہے اور نہ قوت وطاقت حاصل کرتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حشرات الارض، کیڑے مکوڑوں، مردار کھانے والے پرندوں اور شکار کرنے والے جانوروں کو، جنہیں خبائث میں شمار کیا جاتا ہے، حرام قرار دیا، کیونکہ ایسے حیوانات اور

[1]: دیکھئے تفسیر قرطبی ۷/۱۱۵ - ۱۸۱ ابن عربی: احکام القرآن ۲/۷۶۴، ۷۶۵

پرندے گندی اور ناپاک چیزیں کھاتے ہیں جس کے نتیجے میں اُن کا گوشت گندہ ہو جاتا ہے۔ ایسا گوشت اگر استعمال میں لایا جاتا تو وہ انسان کے جسم، اس کی صحت، اس کے اخلاق و کردار اور اعلیٰ قدروں کو نقصان پہنچاتا۔

تیسری فصل

کیا حرام جانوروں کے اجزاء سے فائدہ اٹھانا جائز ہے؟

یہ فصل تین مباحث پر مشتمل ہے

پہلی بحث : ہڈیوں، بالوں، سینگوں، پروں اور کھروں کا حکم

دوسری بحث : حرام جانوروں کی کھالوں کا حکم

تیسری بحث : مُردار جانور کے دودھ، انفحہ[1] اور انڈوں کا حکم۔

تمام مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ مُردار جانور کا گوشت مع اپنے تمام اجزاء کے حرام ہے جس کا کھانا جائز نہیں۔ جیسے جگر، تلی اور اسی طرح گوشت کے دیگر اجزاء۔ اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں۔

اسی طرح اس مسئلے میں بھی فقہاء کا اجماع ہے کہ مردار کی چربی بھی مُردار ہوتی ہے۔ اس کا استعمال کسی چیز میں جائز نہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ :

قل لا اجد فیما اوحی الیّ محرّماً علی طاعم یطعمہ الا ان یکون میتۃ

(تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں کہ مجھ کو پہنچی ہے کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اس کو کھائے مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو)

---

[1] - بکری کے بچے کے معدہ کا پنیر

اور آیت کریمہ

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَالدَّمَ (۲ : ۱۷۳)

(اس نے تم پر حرام کیا ہے مردہ جانور اور لہو)

کے عموم سے مستنبط ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں آیتوں کے ظاہر سے مردار جانور کے تمام اجزاء کی حرمت کا وجوب ثابت ہوتا ہے محمد بن اسحاق نے عطا اور انہوں نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ "جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکے تشریف لائے تو چربی جمع کرنے والے اہل صلیب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یارسول اللہ ہم یہ چربی جمع کرتے ہیں جو مُردار وغیرہ سے حاصل کی جاتی ہے اور کھالوں اور کشتیوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ سُن کر حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہودیوں کو ہلاک کرے! ان پر چربی حرام کی گئی تھی لیکن وہ اسے بیچتے اور اس کی قیمت کھاتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔"

یہ حدیث اس امر کی جانب دلالت کرتی ہے کہ مُردار مطلقاً حرام ہے، اس کا بیچنا، کھانا یا اس سے فائدہ اٹھانا یکساں ممنوع ہے[1]۔

اس امر کا ذکر کرنے کے بعد جس پر فقہاء متفق ہیں اب ہم ان مسائل کا بیان کریں گے جن کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف رائے ہے۔

پہلی بحث: سینگوں، کھروں، ہڈیوں، بالوں اور پروں کا حکم۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہڈی اور بال مُردار ہیں۔ یعنی ان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں[2]۔

---

[1]: دیکھیے احکام القرآن تالیف امام جصاصؒ ۱/۱۴۵

[2]: دیکھیے المجموع ۱/۲۰۵

لیکن حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے میں مُردار کی ہڈی، بال، پشم، پر اور سینگوں وغیرہ سے فائدہ اٹھانا جائز ہے کیونکہ یہ چیزیں مردار نہیں۔ امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زُفر کا بھی یہی قول ہے [۱]

امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے بالوں اور ہڈیوں کے درمیان فرق کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ: ہڈی، سینگ اور کھُر مردار ہیں، لیکن بال، پر اور اون مردار نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب بھی یہی ہے [۲]

اس مسئلے میں اختلاف کا سبب یہ کہ فقہاء کے درمیان اس بارے میں اتفاق رائے نہیں کہ آیا اعضاء کے افعال پر لفظ زندگی کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ جو فقہاء یہ سمجھتے ہیں کہ غذا حاصل کرنا اور نشوونما پانا بالوں، پشم، ہڈیوں اور پروں کے افعال ہیں، اُن کی رائے میں یہ چیزیں مُردار ہیں، ان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ یہ فقہاء ارشاد باری تعالیٰ حرمت علیکم المیتۃ کے عموم سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لفظ میتۃ کا اطلاق مُردار جانور کے تمام اجزاء پر ہوتا ہے جن میں اون، پشم اور پر شامل ہیں۔

لیکن جو فقہاء ہڈیوں، بالوں اور پروں کو میتۃ (مُردار) نہیں سمجھتے، اُن کے نزدیک ان سے استفادہ کرنا جائز ہے۔ ان فقہاء کے استدلال کی بنیاد حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ایک حدیث ہے جس میں وہ فرماتی ہیں کہ: "میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میتۃ کی کھال (کے استعمال) میں کوئی حرج نہیں جب کہ اس کی دباغت کرلی گئی ہو۔ نہ اُس کے بالوں، اون اور سینگوں (کے استعمال) میں کوئی حرج ہے درآنحالیکہ انہیں پانی سے دھو لیا گیا ہو۔"

یہ فقہاء ایک اور حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت سلمان فرماتے ہیں کہ:

"حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فر، پنیر اور گھی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: حلال

---

[۱]: دیکھئے احکام القرآن تالیف امام جصاص ۱/۱۳۹

[۲]: دیکھئے المغنی ۱/۹،

ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حلال قرار دیا، اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حرام ٹھہرایا، اور جس چیز کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی وہ اُن کی جانب سے معاف ہے"۔

اس حدیث سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ چونکہ مردار جانور کے بالوں اور اون وغیرہ کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے لہٰذا انہیں استعمال میں لانا جائز ہے۔

اسی طرح یہ فقہاء ارشادات باری تعالیٰ عزاسمہٗ :

والانعام خلقھا لکم فیھا دفء ومنافع .... (۱۶ : ۵)

(اور چوپائے بنا دیے تمہارے واسطے اُن میں جڑاول اور کتنے فائدے)

ومن اصوافھا واوبارھا واشعارھا اثاثاً ومتاعاً الی حین (۱۶ : ۸۰)

(اور بھیڑوں کی اون سے اور اونٹوں کی ببریوں سے اور بکریوں کے بالوں سے کتنے اسباب اور استعمال کی چیزیں وقت مقررہ تک)

سے بھی استدلال کرتے ہیں کیونکہ ان دونوں آیاتِ کریمہ کے ظاہر سے تمام مذکورہ چیزوں کی اباحت ثابت ہوتی ہے خواہ وہ زندہ جانور کی ہوں یا مُردہ کی۔

یہ فقہاء مزید کہتے ہیں کہ ان اشیاء کی حرمت سے مقصود ان کا کھانا حرام ہوتا ہے جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ :

قل لا اجد فیما اوحی الیّ محرّماً علیٰ طاعم یطعمہ (۶ : ۱۴۵)

(تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں جو مجھ کو پہنچی ہے کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اسے کھائے)

اس سے ظاہر ہوا کہ حرمت صرف کھانے تک محدود ہے اس کی تائید حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ: "مردار کا صرف گوشت حرام کیا گیا ہے" اور ایک دوسری حدیث میں ہے: "بیشک اس کا کھانا حرام ہے"۔[۵]

پس ظاہر ہوا کہ حرمت سے مقصود کھانا ہے نہ کچھ اور۔ اس امر کی دلیل کہ بالوں میں جان نہیں ہوتی، یہ ہے کہ ان کے کاٹنے سے جانور کو تکلیف نہیں پہنچتی۔ اسی طرح سینگ اور پر بھی زندگی سے عاری چیزیں ہیں۔ اگرچہ ان چیزوں میں نشوونما کی قوت ہوتی ہے، جیسا کہ درختوں

اور نباتات میں، لیکن ان میں زندگی نہیں ہوتی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے، "زندہ حیوان (کے جسم) سے کاٹا ہوا (حصہ) مُردار ہے" لیکن اس کی زندگی میں اس کے جسم سے جو بال اور اون علیحدہ کی جاتی ہے اس پر یہ حکم نہیں لگایا جاتا کہ وہ مردار ہے، اور نہ ہی اس سے جانور کو تکلیف پہنچتی ہے۔[۱]

جو فقہا، ہڈیوں اور بالوں کے درمیان فرق کرتے ہیں اُن کی رائے ہے کہ بالوں میں احساس کی قوت نہیں ہوتی، لیکن ہڈیوں میں ہوتی ہے۔ لہٰذا بالوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے لیکن ہڈیوں سے نہیں۔[۲]

حق یہ ہے کہ مضبوط عقلی اور نقلی دلیلوں کے پیش نظر اس مسئلے میں احناف کا قول قوی ہے۔ حُرمت سے مقصود ان کا کھانا حرام ہونا ہے، نہ کہ کسی اور صورت میں زیر استعمال لانا۔ اس لئے کہ جیسے پہلے عرض کیا گیا، مُردار کا کھانا انسان کے لئے نقصان رساں ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رح نے اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور ہڈیوں، سینگوں اور ناخنوں کا پاک ہونا ثابت کیا ہے۔ علامہ مرحوم لکھتے ہیں کہ یہ مذہب حضرت امام ابو حنیفہ رض کا ہے نیز امام مالک رض اور امام احمد رض کا قول بھی یہی ہے۔

دوسری بحث: میتہ کی کھال کا حکم۔

میتہ اور دیگر حرام جانوروں کی کھال کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے لیکن بعض فقہاء کے نزدیک میتہ کی کھال سے فائدہ اٹھانا مطلقاً جائز ہے، خواہ اس کی دباغت کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔

حضرت امام شافعی رح اور امام ابو حنیفہ رح نے فرمایا ہے کہ دباغت کے بعد اس سے استفادہ کرنا جائز ہے۔ ایک روایت امام مالک رح سے بھی اسی مضمون کی مروی ہے۔ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رح نے

---

[۱] - دیکھئے احکام القرآن تالیف امام جصاص ۱/۱۴۹ - ۱۵۰

[۲] - دیکھئے بدایۃ المجتہد ۱/۵۶

بھی یہی کہا ہے۔

بعض فقہاء کی رائے ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانا مطلقاً جائز نہیں، خواہ اس کی دباغت کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔ امام احمدؒ کا مشہور مذہب یہی ہے۔

جو فقہاء یہ رائے رکھتے ہیں کہ دباغت سے کھالیں پاک ہو جاتی ہیں۔ اس مسئلے میں اُن کا اختلاف ہے کہ آیا دباغت سے تمام کھالیں پاک ہو جاتی ہیں یا صرف اُن جانوروں کی جنہیں ذبح کیا گیا ہو۔

امام شافعیؒ کی رائے میں دباغت سے ۔کتے اور خنزیر کی کھال کے سوا، تمام کھالیں پاک ہو جاتی ہیں[1]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب یہ ہے کہ خنزیر کے سوا، دباغت سے ہر قسم کے جانور کی کھال پاک ہو جاتی ہے۔ خواہ اس کا کھانا حلال ہو یا نہ ہو۔

امام داؤدؒ فرماتے ہیں، "دباغت سے تمام کھالیں پاک ہو جاتی ہیں، جن میں کتے اور خنزیر کی کھال بھی شامل ہے۔"

فقہاء کے مابین اس مسئلے میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ اس ضمن میں وارد ہونے والی مختلف احادیث کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں جو حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے، کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم نے اس کی کھال سے کیوں فائدہ نہیں اٹھایا؟"[2]

اس سلسلے کی دوسری حدیث ابن حکیم کی ہے[3] جس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (قبیلہ جہینہ کو) لکھا کہ میتہ (مُردار) سے فائدہ نہ اٹھاؤ، نہ اس کی کھال سے نہ پٹھوں سے[4]۔ آپؐ نے یہ

۱۔ دیکھیے المجموع ۱/ ۲۵۵-۲۵۶

۲۔ اس حدیث کو ابن ماجہ کے سوا متعدد محدثین نے روایت کیا ہے۔ دیکھیے نیل الاوطار ۱/ ۷۵

۳۔ ان کا تعلق قبیلہ جہینہ سے تھا۔ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مکتوب مبارک سنا جو آپؐ نے قبیلہ جہینہ کو بھیجا تھا۔ ابن حکیمؓ کا انتقال حجاج کے دورِ حکومت میں ہوا۔ دیکھیے سبل السلام ۱/ ۳۱

۴۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں، اور امام احمدؒ، امام شافعیؒ، امام داؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔ دیکھیے نیل الاوطار ۱/ ۸۰

بات اپنی وفات سے ایک سال پہلے ارشاد فرمائی۔

لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کھال کی دباغت ہو جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔[1]

چنانچہ جو فقہاء مُردار کی کھال کو مطلقاً ممنوع قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ابن حکیم رضی اللہ عنہ کی حدیث بعد کی ہے جس سے کھالوں کی دباغت کا حکم منسوخ ہو گیا۔ اور جو فقہاء ذبح شدہ اور غیر ذبح شدہ (یعنی مردار جانوروں کی کھال) کے درمیان فرق نہیں کرتے وہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے عموم سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دباغت کے بعد ہر قسم کی کھال سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

جن فقہاء نے ذبح شدہ جانوروں کی کھال سے فائدہ اٹھانا مطلقاً جائز ٹھہرایا ہے، خواہ وہ دباغت شدہ ہو یا نہ ہو، انہوں نے حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا ہے جو مطلق ہے (یعنی اس میں استفادہ کے لئے دباغت کی قید نہیں لگائی گئی) اور کہا کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نسبت اس کے حکم میں وسعت پائی پائی جاتی ہے۔[2]

امام صنعانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں فقہاء کے سات اقوال ہیں:

پہلا قول:

یہ کہ دباغت سے مُردار کی کھال ظاہری اور باطنی طور پر پاک ہو جاتی ہے۔ اس میں کسی چیز کی تخصیص نہیں جیسا کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ اور اس سلسلے میں مروی دیگر احادیث کے ظاہر سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔

دوسرا قول:

یہ کہ دباغت سے کوئی چیز پاک نہیں ہوتی۔ یہ ہادویہ کی اکثریت کا مذہب ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ ان فقہاء کے استدلال کی بنیاد حضرت عبداللہ بن حکیم رضی اللہ عنہ کی

---

[1] اس روایت کی تخریج امام احمدؒ، مسلمؒ، ابن ماجہؒ اور ترمذی نے کی ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۱/ ۶۸،

[2] دیکھئے بدایۃ المجتہد ۱/ ۷۶، ۷۷۔

حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ : حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہمارے پاس آپ کا ایک مکتوب پہنچا جس میں لکھا تھا کہ "میتہ (مردار) سے فائدہ نہ اٹھاؤ، نہ کھال سے، نہ پٹھوں سے"۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام داؤد کی روایت میں ہے کہ وہ خط آپ کی وفات سے ایک مہینہ پہلے آیا اور ایک روایت میں ہے کہ ایک مہینہ یا دو مہینے پہلے آیا۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن بتایا ہے۔ ماوردیؒ لکھا ہے کہ امام احمدؒ اسی سے استدلال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ دونوں حدیثوں میں سے یہ بعد کی ہے۔ پھر آپ نے اسے ترک کر دیا۔ ماوردی یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ والی حدیث کی ناسخ ہے اس لئے کہ اس میں میتہ یا اس کی کھال یا پٹھوں سے فائدہ اٹھانے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لیکن مخالف فقہاء نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں مثلاً

پہلا :

یہ کہ اس حدیث (ابن حکیمؓ) میں اضطراب ہے۔ کبھی تو یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کے حوالے سے روایت کی جاتی ہے اور کبھی جہینہ کے اُن مشائخ کے حوالے سے جنہوں نے حضورؐ کا مکتوب مبارک پڑھا تھا علاوہ ازیں اس کے متن میں بھی اضطراب پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر روایتوں میں تو یہ بغیر کسی قید کے نقل کی گئی ہے، اور بعض روایتوں میں ایک مہینہ یا دو مہینے یا چالیس دن یا تین دن کی قید کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ معلل بھی ہے، کیونکہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے اسے براہِ راست ابن حکیمؓ سے نہیں سنا اسی لئے امام احمدؒ بن حنبل نے آخر میں اپنا قول، جو اس پر مبنی تھا / ترک کر دیا تھا جب کہ ابتداء میں وہ اسی سے استدلال کرتے تھے۔ جیسا کہ امام ترمذیؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

دوسرا :

یہ حدیث اتنی قوی نہیں کہ اس کی بنیاد پر دوسری حدیث کو منسوخ قرار دیا جا سکے۔ اس لئے کہ حدیث دباغ زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس پر شیخین (امام بخاریؒ اور مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کا اتفاق ہے۔ امام مسلمؒ نے اسے سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور اسی مضمون کی اور متعدد احادیث متعدد طریقوں سے صحابہ کرام

(رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کی ایک جماعت سے نقل کی ہیں۔ جیسے حضرت ابن عباسؓ سے دو حدیثیں حضرت ام سلمہ سے تین حدیثیں اور حضرت انسؓ سے دو حدیثیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے حضرت سلمہؓ بن المحبق، حضرت عائشہؓ، حضرت مغیرہؓ، حضرت ابی امامہؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے بھی اس سلسلے کی احادیث روایت کی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی تحقیق سے ثابت کرنا ضروری ہے کہ منسوخ کرنے والی حدیث بعد کی ہے اور حدیث ابن عکیم کے متاخر ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ اس کی تاریخ کے بارے میں ایک مہینہ یا دو مہینے کی روایت معلول ہے، چنانچہ اس سے نسخ پر حجت قائم نہیں ہوتی۔ مزید براں اگر اس کی تاریخ کی روایت صحیح بھی ہو تب بھی اس سے کوئی ایسی دلیل نہیں نکلتی جس سے یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ حدیث بعد کی ہے۔ پس جبکہ نسخ ثابت نہ ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں حدیثوں میں تعارض پایا جاتا ہے یعنی حدیث عبداللہ بن عکیم اور حدیث عبداللہ بن عباسؓ اور اس کے ساتھ کی دیگر احادیث کے درمیان اور تعارض کی صورت میں یہ امر ضروری ہوتا ہے کہ کسی ایک کو ترجیح دی جائے یا خاموشی اختیار کی جائے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ تعارض تو اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ دونوں حدیثیں ایک درجے کی ہوں جو یہاں مفقود ہے۔ یعنی صحت اور کثرتِ رواۃ کے اعتبار سے جو درجہ حدیث ابن عباسؓ کا ہے وہ حدیث عبداللہ بن عکیمؓ کا نہیں۔

تیسرا:

یہ کہ۔ جیسا کہ قاموس اور نہایہ سے معلوم ہوتا ہے۔ دو اقوال میں سے ایک قول کے مطابق کھال پر لفظ "اہاب" (جو حدیث ابن عکیمؓ میں استعمال ہوا ہے) کا اطلاق اس وقت تک ہوتا ہے جب تک اُس کی دباغت نہ کرلی جائے۔ چنانچہ نضر بن شمیل نے کہا ہے: (کھال کو) اہاب اس وقت تک کہا جاتا ہے جب تک اس کی دباغت نہ ہو جائے۔ دباغت کے بعد اُسے شن اور قربہ کہتے ہیں۔ یہی رائے قطعیت کے ساتھ جوہری نے ظاہر کی ہے۔ کہا گیا ہے کہ چونکہ اس مسئلے میں دو باتوں کا احتمال ہے اور یہاں دو حدیثیں ایک دوسرے سے متعارض صورت میں وارد ہوئی ہیں، لہٰذا ہم ان کے مابین تطبیق

دیں گے۔ اور وہ اس طرح کہ ہماری رائے میں اہاب (یعنی کھال) سے فائدہ اٹھانے کی ممانعت اس وقت تک ہے جب تک اس کی دباغت نہ ہو گئی ہو، جب اس کی دباغت ہو گئی اس پر لفظ اہاب کا اطلاق جائز نہ رہا اور وہ استعمال کی ممانعت سے نکل گئی۔ ان دو حدیثوں میں تطبیق کی یہ صورت بہت عمدہ ہے۔

تیسرا قول:

دباغت سے صرف اس مردار جانور کی کھال پاک ہوتی ہے جسے ذبح کر کے کھانا جائز ہو، اس کے سوا کسی دوسرے جانور کی کھال پاک نہیں ہوتی۔ لیکن حدیث کے الفاظ (کوئی کھال) عام ہیں اور اس عموم سے اس قول کی تردید ہو جاتی ہے۔

چوتھا قول:

دباغت سے تمام کھالیں پاک ہو جاتی ہیں۔ سوائے خنزیر کی کھال کے، کیونکہ اس کی کھال ہی نہیں ہوتی یہ مذہب حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ہے۔

پانچواں قول:

سُور کی کھال کے سوا دباغت سے تمام کھالیں پاک ہو جاتی ہیں، سُور کی کھال پاک نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کی کھال ہی نہیں ہوتی، بلکہ یہ ہے کہ وہ نجس ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

فانّہ رجس

(بے شک وہ ناپاک ہے)

آیت بالا میں لفظ "انہ" کی ضمیر خنزیر کی طرف پھرتی ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے کُلی طور پر ناپاک ہونے کا حکم لگایا ہے۔ کتے کو بھی اس کی کلی نجاست کے ساتھ سُور پر قیاس کیا گیا ہے۔ یہ قول حضرت امام شافعیؒ کا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں :

"یہ اس لئے کہ (پاکی کے عمل میں) زندگی دباغت سے زیادہ قوی ہے، اس دلیل سے کہ وہ کھال کی پاکی کا سبب ہے۔ دباغت سے کھال یقیناً پاک ہوجاتی ہے لیکن کتے اور خنزیر کو اگر زندگی پاک نہیں کرتی تو دباغت سے اُن (کی کھال) کا پاک نہ ہونا زیادہ اولیٰ ہے (یعنی کتا اور خنزیر ایسے گندے جانور ہیں کہ زندگی میں بھی ناپاک ہی ہوتے ہیں، پھر دباغت سے ان کی کھال کیسے پاک ہوجائے گی) اس لئے کہ جو نجاست وقتی اور عارضی ہو وہ دھونے سے یا کسی اور عمل کے ذریعے زائل ہوجاتی ہے، جیسے کپڑا جسے نجاست لگ گئی ہو، دھونے سے پاک ہوجاتا ہے۔ لیکن جو نجاست کسی چیز کا لازمہ ہو وہ دھونے یا کسی اور طریقے سے دُور نہیں ہوتی جیسے آدمی کا فضلہ یا جانور کی لید کہ انہیں دھو کر پاک نہیں کیا جاسکتا کتے اور خنزیر کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ (یہ جانور بالذات ناپاک ہیں، لہٰذا انہیں یا ان کے کسی جزو کو کسی طریقے سے پاک نہیں کیا جاسکتا)"[1]

چھٹا قول

دباغت سے ہر قسم کی کھال ظاہری طور پر تو پاک ہوجاتی ہے لیکن باطنی طور پر نہیں ہوتی۔ چنانچہ اسے خشک حالت میں زیرِ استعمال لایا جاسکتا ہے۔ گیلی حالت میں نہیں اُسے بچھا کر اس پر نماز پڑھی جاسکتی ہے لیکن اسے اوڑھ کر یا پہن کر نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا۔ یہ قول حضرت امام مالکؒ سے مروی ہے جنہوں نے اس سلسلے میں وارد ہونے والی مختلف احادیث کے درمیان تطبیق دی ہے۔

ساتواں قول

میتہ (مردار) کی کھال سے ظاہری اور باطنی طور پر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، خواہ اس کی دباغت کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔ یہ قول اس حدیث پر مبنی ہے جو امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے

[1] - المجموع ۱/۲۲۰

سے نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک مردہ بکری کے پاس سے ہوا تو آپؐ نے اسے دیکھ کر فرمایا: تم نے اس کی کھال سے کیوں فائدہ نہیں اٹھایا؟ "صحابہؓ نے عرض کیا" یا رسول اللہ! یہ مُردار ہے! آپ نے فرمایا" اس (یعنی مردار) کا صرف کھانا حرام کیا گیا ہے۔" یہ رائے امام زہری کی ہے۔

اس حدیث کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ مطلق ہے جسے دباغت والی احادیث نے جو پہلے نقل کی جا چکی ہیں، مقید کر دیا ہے[1]

احادیث میں درندہ جانوروں کی کھال زیر استعمال لانے سے منع کیا گیا ہے، جیسا کہ قتادہؓ نے ابوالملیح سے، انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے درندوں کی کھال زیر استعمال لانے سے منع فرمایا[2]

قتادہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحابؓ سے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ حضورؐ نے چیتے کی کھال سے بنی ہوئی زین پر سوار کرنے سے منع فرمایا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں[3]

درندہ جانوروں کی کھال سے متعلق مندرجہ بالا دونوں حدیثوں کے بارے میں فقہا مختلف الرائے ہیں چنانچہ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ اس ممانعت کا مقصد اہلِ عجم کی مشابہت سے بچنا ہے یہ نہیں کہ درندوں کی کھالیں ناپاک ہوتی ہیں۔ بعض فقہاء کے نزدیک درندہ جانوروں کی کھال کا استعمال مکروہ ہے اور بعض کے نزدیک حرام۔

امام عطاءؒ نے حضرت ابن عباسؓ، ابو الزبیر نے حضرت جابرؓ اور معطوف نے حضرت عمارؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ درندوں کی کھال سے فائدہ اٹھانا مباح ہے۔

علی بن حسین، الحسن، ابراہیم، ضحاک اور ابن سیرینؒ سے مروی ہے کہ درندوں کی کھال کے استعمال

---

[1] سبل السلام ۱/۳۱۔ احکام القرآن از جصاص ۱/۱۴۳-۱۴۴۔ المجموع ۱/۲۵۰-۲۶۰

[2] اس حدیث کو امام ابوداؤد، احمدؒ، ترمذی اور نسائیؒ نے صحیح اسانید کے ساتھ روایت کیا اور امام حاکم نے المستدرک میں نقل کی۔ دیکھئے نیل الاوطار ۱/۷۳

[3] یہ حدیث امام ابوداؤد، احمدؒ اور نسائیؒ نے حسن اسناد سے روایت کی ہے دیکھئے نیل الاوطار ۱/۷۴

میں کوئی حرج نہیں ۔[۱]

حق یہ ہے کہ اس مسئلے میں اُن لوگوں کا قول زیادہ قوی ہے جو کتے اور خنزیر کے سوا، تمام جانوروں کی کھال کا زیرِ استعمال لانا جائز سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ ایسا کوئی امر مانع موجود نہیں جس کے پیشِ نظر کھالوں سے فائدہ اٹھانا ممنوع ہو، علاوہ ازیں اس قول کے حق میں متعدد قوی ظاہری دلیلیں موجود ہیں ۔ اس رائے کو تقویت اس حدیث سے بھی پہنچتی ہے جو امام زہریؒ نے عبیداللہ بن عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے آیت کریمہ قل لا اجد فیما اوحی الی محرما پڑھ کر کہا کہ میتہ (مردار) کا کھانا حرام قرار دیا گیا ہے ۔[۲] (نہ کہ اس کی کھال سے استفادہ کرنا)

مختصر یہ کہ مُردار کا کھانا حرام ہے، رہا دباغت کے بعد اس کی کھال سے فائدہ اٹھانا، یا اس کی ہڈیوں اون، بال اور ریشم وغیرہ سے استفادہ کرنا تو یہ چیز مباح ہے ۔ واللہ اعلم

دباغت کا طریقہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک مردہ بکری کے پاس سے ہوا تو آپؐ نے فرمایا: "تم نے اس کی کھال سے کیوں فائدہ نہیں اٹھایا؟"

عرض کیا: "یا رسول اللہ! یہ تو مُردار ہے!"

آپ نے فرمایا: "جو چیز حرام کی گئی ہے وہ اس کا کھانا ہے، کیا اسے پانی اور قرظ کے ذریعے پاک نہیں کیا جا سکتا؟"[۳]

قرظ ایک قسم کے درخت کا مستطیل پھل ہوتا ہے جو سبز لوبیا کے پھل سے بڑی مشابہت رکھتا ہے ۔

---

[۱] ۔ احکام القرآن، تالیف امام جصاص ۱/۱۵۱، نیل الاوطار ۱/۷۴ - ۷۵ ۔

[۲] ۔ دیکھئے تفسیر قرطبی ۷/۱۳۰

[۳] ۔ اس حدیث کو امام دار قطنیؒ اور بیہقیؒ نے روایت کیا ہے اور اسی مضمون کی ایک حدیث امام ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے نقل کی ہے ۔ دیکھئے نیل الاوطار ۱/۷۵ ۔

یہ ضروری نہیں کہ دباغت کے لئے قرظ ہی استعمال کیا جائے، بلکہ ۔ جیساکہ امام نووی اور شیرازی نے کہا ہے ۔ اس مقصد کے لئے ہر وہ چیز کام میں لائی جاسکتی ہے جس سے کھال پاک و صاف ہوجائے، جیسے پھٹکری، انار کے چھلکے اور مازو وغیرہ۔

تیسری بحث: میتہ کے دودھ، انفحۃ اور انڈوں کا حکم۔

حضرت امام شافعیؒ کی رائے ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ حرمت علیکم المیتۃ کے عموم کے پیش نظر میتہ کا دودھ اور انفحۃ[1] ناپاک ہے۔

امام احمدؒ کی رائے بھی یہی ہے[2]

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ دونوں چیزیں پاک ہیں، یہی قول امام داؤدؒ کا ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک بھی یہ دونوں چیزیں (اصلاً) پاک ہیں لیکن جب (مردار کے جسم میں) نجاست کے قریب رہیں تو ناپاک ہوگئیں[3]

چنانچہ جن فقہاء نے مُردار کے دودھ کو پاک قرار دیا ہے انہوں نے آیت کریمہ:

نسقیکم مما فی بطونه من بین فرث و دم لبناً خالصاً سآئغاً للشاربین

(۱۶ : ۶۶)

(اور تمہارے لئے چوپاؤں میں سوچنے کی جگہ ہے پلاتے ہیں تم کو اس کے پیٹ کی چیزوں میں سے گوبر اور لہو کے بیچ میں سے دودھ ستھرا خوشگوار پینے والوں کے لئے)

---

[1] ۔ گھوڑی، اونٹنی اور بکری وغیرہ کا بچہ جب تک چارہ نہ کھائے اس کی اوجھ کو عربی میں انفحۃ کہتے ہیں (ہمزہ کے زیر اور فا کے زبر کے ساتھ) لیکن جب کھانے لگے تو اسے کرش کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو صرف اوجھ والے جانوروں میں پائی جاتی ہے اور بالکل کم عمر جانور کے پیٹ سے نکال جاتی ہے انفحۃ کو اگر دودھ میں نچوڑا جائے تو پنیر کی طرح سخت ہوجاتا ہے

[2] دیکھئے المجموع ۱/۲۴۳۔ المغنی ۱/۴۷

[3] ۔ دیکھئے القرطبی ۲/۲۱۹ - ۲۲۰

عموم سے استدلال کیا ہے۔

آیت مذکورہ بالا کا مقتضا دو چیزیں ہیں

اوّل :

یہ کہ دودھ نہیں مرتا، چنانچہ حیوان کی موت سے حرام نہیں ہوتا، نہ اس دودھ کی طرح ہوتا ہے جیسے مردہ برتن میں رکھا گیا ہو۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ مُردہ جانور کے تھن میں موجود اس دودھ میں اور اس دودھ میں کیا فرق ہے جسے پلید برتن میں رکھا گیا ہو تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ جائے پیدائش کی وجہ سے وہ چیز ناپاک نہیں ہوتی جو اس کے قریب ہو۔ جیسا کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک باتفاق گوشت کو بغیر دھوئے کھانا جائز ہے حالانکہ اس میں وہ رگیں ہوتی ہیں جن میں سے خون گزرتا ہے جو ایک ناپاک چیز ہے۔

دوم :

آیت بالا میں دوسری چیز جو بتائی گئی ہے یہ ہے کہ دودھ اگرچہ گوبر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے جو ناپاک چیزیں ہیں لیکن وہ پاک ہوتا ہے۔ اگر پیدائش میں کسی چیز کی قربت (پاکی ناپاکی میں) مؤثر ہوتی تو یہاں ضرور مؤثر ہوتی (کہ دودھ جو گوبر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے ان کی وجہ سے ناپاک ہو جاتا)۔

اس مذکورہ رائے کے حامل علماء آیت بالا سے استنباط کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ :

۱۔ آیت کریمہ میں دودھ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ خالص ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دودھ میں نجاست کی آمیزش قطعاً نہیں ہوتی۔

۲۔ دودھ کی دوسری صفت، جو آیت کریمہ میں بیان کی گئی ہے، یہ ہے کہ وہ پینے والوں کے لئے خوشگوار ہوتا ہے، اور حرام چیز مسلمانوں کے لئے خوشگوار نہیں ہوتی۔

۳۔ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دودھ کا ذکر کرکے بندوں پر اپنا احسان جتایا ہے اور احسان حلال چیز سے ہوتا ہے نہ کہ حرام شے سے[۱]

وہ مزید کہتے ہیں کہ :

۱۔ بدائع الصنائع ۶/ ۲۰۱

ہماری اس رائے کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ غزوۂ طائف میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پنیر پیش کیا گیا تو لوگوں نے اُسے سونٹے سے کوٹنا شروع کر دیا۔ آپؐ نے پوچھا یہ کہاں بنتا ہے؟ عرض کیا سرزمین فارس میں۔ فرمایا "اس پر اللہ کا نام لو اور کھاؤ"۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مجوس کا ذبیحہ مُردار ہوتا ہے اور اس وقت اہل فارس مجوسی تھے۔ پنیر انفحۃ کے بغیر نہیں بنتا، پس ثابت ہوا کہ مردار کا انفحۃ پاک ہوتا ہے۔

اسی طرح اُمّ المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ "میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پنیر کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: اس پر چھری رکھو اللہ کا نام لو اور کھاؤ"۔

اس حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے، بغیر کسی تفصیل کے ہر قسم کا پنیر کھانا مباح ٹھہرایا ہے، خواہ وہ مُردار جانور کے انفحۃ سے بنایا گیا ہو یا کسی اور جانور کے انفحۃ سے [1]

حق یہ ہے کہ اس مسئلے میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا قول زیادہ قوی ہے، اس لئے کہ مردار جانور کا تھن، جس میں دودھ ہوتا ہے، ناپاک ہوتا ہے جس سے دودھ بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔ مُردار کے تھن اور ناپاک برتن میں ہرگز کوئی فرق نہیں [2]

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ دودھ گوبر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔ گوبر اور خون کے درمیان سے صاف وشفاف دودھ کا اس طرح نکلنا کہ نہ اس کے طبعی رنگ میں فرق آتا ہے، نہ اس کا ذائقہ بدلتا ہے، اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑی قدرت والا اور

[1] دیکھئے احکام القرآن تالیف امام جصاص ۱/۱۴۸

[2] طب جدید سے بھی اسی رائے کی تائید ہوتی ہے کیونکہ میتہ کی موت کا سبب کوئی نہ کوئی بیماری ہوتی ہے جو اسے لاحق ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی ایسی رکاوٹ موجود نہیں ہوتی جو مائکروب اور جراثیم کو تھنوں اور دودھ میں منتقل ہونے سے روک دے۔

گہری حکمت والے ہیں ۔

جہاں تک اس دلیل کا تعلق ہے کہ گوشت میں خون موجود ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا کھانا جائز ہے تو یہ جواز اس نص کے پیش نظر ہے جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہے ۔ اور دوسرے یہ چیز ان امور میں سے ہے جن کے بارے میں مشقت اور حرج کے پیش نظر درگذر سے کام لیا گیا ہے ۔ پھر یہ حکم اس ذبح شدہ جانور کے گوشت کا ہے جس کا کھانا حلال ہو لیکن مردار کا گوشت تو ناپاک ہوتا ہے جس کا کھانا حلال نہیں، پھر اس میں سے نکلے ہوئے دودھ کا پینا کیسے حلال ہوگا!

مردار مرغی کے انڈے

مُردار مرغی کے جسم سے جو انڈے نکلیں اُن کے بارے میں احناف کی رائے ہے کہ ان کا کھانا حلال ہے، خواہ اُن کے چھلکے میں سختی پیدا ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اگر چھلکے میں سختی آگئی ہو تو اس کا کھانا جائز ہے ورنہ نہیں، اس مسئلے میں جمہور فقہاء کی رائے یہی ہے ۔

مُردار جانور کا انڈا، جیسا کہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی رائے ہے، جب تک اس کے چھلکے میں سختی پیدا نہ ہو جائے، مردار کا جزو ہوتا ہے لیکن جب اس میں سختی آ جائے تو وہ اس کا جزو نہیں رہتا ۔

احناف کی رائے ہے کہ انڈا (جسم سے) الگ ہوتا ہے، وہ مطلقاً مردار کا جزو نہیں ہوتا[1]

جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں اس مسئلے میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا قول ارجح ہے ۔ اس لئے کہ جب تک انڈے کے چھلکے میں سختی پیدا نہ ہو جائے کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہوتی جو مُردار جسم کے جراثیم اور دیگر بُرے اثرات کو انڈے میں منتقل ہونے سے روکے، ہاں جب سختی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس قسم کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔

---

[1] - دیکھئے بدائع الصنائع ۱/۱۷۷، المجموع ۱/۲۴۳، المغنی ۱/۳۷

چوتھی فصل

حالتِ اضطرار میں حرام اشیاء کا استعمال

جیساکہ پہلے بیان کیا گیا، شارعِ حکیم نے ایسی اشیاء کا کھانا حرام قرار دیا ہے جو انسان کی صحت اور اُس کی اخلاقی و روحانی قوتوں کو نقصان پہنچانے والی ہیں۔ لیکن ضرورت کے وقت، جب کہ انسانی جان کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو، اس امر کی اجازت ہے کہ حرام اشیاء زیرِ استعمال لائی جائیں، بلکہ ایسی صورت میں بعض فقہاء کے نزدیک انہیں کھانا یا زیرِ استعمال لانا واجب ہے، تاکہ انسانی جان کو ہلاکت سے بچایا جا سکے۔ صحیح قول کے مطابق حضرت امام ابوحنیفہ اور امام شافعی (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کا مذہب بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وما جعل علیکم فی الدّین من حرج (۲۲ : ۷۸)

(اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل)

اور

فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لاثم فانّ اللہ غفور رحیم (۵ : ۳)

(پھر جو کوئی لاچار ہو جاوے بھوک میں لیکن گناہ پر مائل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے)

مندرجہ بالا آیاتِ کریمہ کو بوقتِ ضرورت حرام اشیاء کے جواز پر بطورِ دلیل پیش کیا جا سکتا ہے۔

امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

"یعنی جو شخص کسی ایسی ضرورت کے باعث جس نے اسے مجبور کر دیا ہو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ ان چیزوں میں سے کسی کے استعمال پر مجبور ہو جائے تو اسے اس کی اجازت ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ

اُسے معاف کرنے والا اور اُس پر رحم کرنے والا ہے، کیونکہ وہ اپنے مجبور بندے کی حالت سے واقف ہے، اور یہ بھی جانتا ہے کہ اُسے اس کی کتنی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ اس سے درگزر کرے گا اور اسے معاف کردے گا۔"

امام موصوف اس کے بعد مزید لکھتے ہیں:

"اس صورت میں جب کہ کوئی ایسا شخص، جو بھوکا ہو اور اضطرار کی حالت اس پر طاری ہو اپنے پاس مُردار (جانور) کا گوشت (کسی دوسرے آدمی کا کھانا اور شکار پائے (درآنحالیکہ وہ حالتِ احرام میں ہے) تو (ایسی حالت میں) اُسے کیا کرنا چاہیئے؟ آیا وہ مُردار کھالے یا شکار کرے (حالانکہ وہ حالتِ احرام میں ہے کہ ایسی حالت میں شکار کرنا حرام ہے) اور بعد میں اس کا فدیہ ادا کردے؟ یا وہ کھانا کھالے جو دوسرے آدمی کا ہے اور بعد میں اس کا فدیہ ادا کردے؟ تو اس مسئلے میں یہ دونوں قول ہیں اور دونوں امام شافعیؒ سے مروی ہیں۔

بھوکے شخص کے لئے مُردار کھانے کے جواز کی یہ شرط نہیں ہے کہ وہ تین دن سے بھوکا ہو، اور اس دوران میں اُسے کھانے کے لئے کچھ نہ ملا ہو۔ اس طرح کا خیال عوام میں سے بعض لوگوں کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص مُردار کھانے پر مجبور ہو جائے تو اسے اس کی اجازت ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ: ہم سے ولید بن مسلم اوزاعی اور حسان بن عطیہ نے ابوواقد اللیثی کے حوالے سے روایت بیان کی کہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: یا رسول اللہ ہم لوگ ایسی سرزمین میں رہتے ہیں جہاں ہمیں فقر و فاقہ کی نوبت آتی رہتی ہے تو ایسی حالت میں مُردار کا کھانا ہمارے لئے کب جائز ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب نہ صبح کو تمہیں کچھ ملے نہ شام کو، نہ بھاجی ترکاری ہی ملے، تو تمہیں اختیار ہے۔" یہ حدیث اس صورت میں صرف امام احمدؒ نے روایت کی ہے۔ اس کی اسناد صحیحین کی شرائط کے مطابق ہیں۔[1]

ابن الرسلان نے شرح السنن میں کہا ہے کہ: (اس روایت کے عربی متن میں وارد لفظ) "الاصطباح" سے یہاں مراد صبح کا کھانا ہے جسے ناشتہ کہا جاتا ہے اور غبوق رات کے کھانے کو

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۲/۱۴

کہتے ہیں۔

"مخمصہ" سے مراد بھوک ہے یعنی پیٹ کا غذا سے خالی ہونا اور خمص پیٹ کے دُبلے پن کو کہتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے: "انّ الطیر تغدو خماصاً و تروح بطاناً" یعنی پرندے بھوکے جاتے ہیں لیکن جب واپس لوٹتے ہیں تو اُن کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں۔

(قرآن مجید کے الفاظ "غیر متجانف" کے معنی ہیں "حرام کی طرف مائل نہ ہونے والا" یہ الفاظ یہاں انہیں معنوں میں استعمال ہوئے ہیں جن معنوں میں سورۃ البقرہ کے الفاظ "غیر باغٍ ولا عادٍ" (یعنی زیادتی اور تعدی کرنے والا نہ ہو) استعمال ہوئے ہیں[۱]

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں:

اضطرار کی یا تو یہ صورت ہوگی کہ کوئی ظالم آدمی کسی کو (حرام کھانے پر) مجبور کرے یا بھوک کے باعث کوئی شخص ایسا کرنے پر مجبور ہو جائے جمہور فقہاء کی رائے یہی ہے۔ لیکن علماء نے اس آیت کے یہ معنی لئے ہیں کہ (مضطر وہ شخص ہے جسے) ناداری اور بھوک نے حرام کھانے پر مجبور کر دیا ہو۔ یہی رائے صحیح ہے۔ کہا گیا ہے "مضطر کے" معنی ہیں وہ شخص جسے یہ حرام چیزیں کھانے پر مجبور کیا گیا ہو اور زبردستی کھلائی گئی ہوں۔ مجاہد کی رائے ہے کہ "مضطر وہ شخص ہے جسے حرام اشیاء کھانے پر مجبور کیا گیا ہو۔ جیسے کسی شخص کو دشمن پکڑ لے اور اسے سُور کا گوشت وغیرہ کھانے اور معصیت اللہ کے ارتکاب پر مجبور کرے تو اکراہ (جبر) کے باعث یہ چیزیں صرف اس وقت تک مباح رہتی ہیں جب تک کہ اکراہ کا سلسلہ ختم نہ ہو جائے"۔[۲]

حالتِ اضطرار سے کیا مُراد ہے؟

اور اس رُخصت سے فائدہ اٹھانا کس لئے جائز ہے؟

فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف رائے ہے کہ وہ کون سی حالت

[۱] ۔ تفسیر قرطبی ۶/۶۴
[۲] ۔ تفسیر قرطبی ۲/۲۲۵

ہے جس میں مسلمانوں کے لئے حرام اشیاء کا کھانا مباح ہو جاتا ہے ؟

جمہور فقہاء کے نزدیک اس سے مراد ایسی حالت ہے جو انسان کو ہلاکت کے قریب پہنچا دے یا کسی ایسے مرض کا سبب بنے جو انسان کی ہلاکت کا باعث بن سکتا ہو۔

بعض مالکی فقہاء نے اس کی حد تین دن مقرر کی ہے (یعنی جب آدمی کو تین دن تک کھانے کے لئے کوئی حلال چیز نہ ملے تو وہ حرام شے استعمال کر سکتا ہے)۔

اس امر میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ "غیر باغ" (یعنی زیادتی کرنے والا نہ ہو) سے کیا مراد ہے ؟ چنانچہ کہا گیا ہے کہ : "اس سے مراد یہ ہے کہ لذت اٹھانے کے لئے نہ کھائے اور دفع ضرر کے لئے جتنا کھانا ضروری ہو اس سے تجاوز نہ کرے"۔

اس سلسلے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ : "اس سے مراد ایسا شخص ہے جو گنہگار نہ ہو"۔ چنانچہ اس رائے کے حامل فقہاء کے نزدیک کسی ایسے شخص کے لئے جو گنہگار ہو حالت اضطرار میں بھی یہ امر جائز نہیں کہ وہ اباحت کی اس رخصت سے فائدہ اٹھائے[1]

بعض علماء کی رائے میں "غیر باغ" "ولا عاد" سے یہ مراد ہے کہ کھانے میں زیادتی اور حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو۔ یہ قول فقہاء احناف اور حضرت مالک بن انس رضؓ کا ہے۔ چنانچہ ان فقہاء نے مسلمانوں کے خلاف بغاوت اور خروج کرنے والے لوگوں کے لئے بھی حالت اضطرار میں بوقت ضرورت مردار کھانا اسی طرح مباح قرار دیا ہے جیسا کہ اہل عدل مسلمانوں کے لئے جائز ٹھہرایا ہے۔

یہی قول حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ، الحسن رحؒ اور مسروق رحؒ کا ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں :

"یہ امر ضروری ہے کہ (جو شخص حالتِ اضطرار میں حرام کھانے کی رخصت سے فائدہ اٹھائے) اس کا سفر معصیت کے لئے نہ ہو (جیسے کوئی رہزن یا مالک سے بھاگا ہوا غلام کہ ان کا سفر معصیت کے لئے ہوتا ہے اور نہ وہ مسلمانوں کے امام کے خلاف بغاوت کر کے نکلا ہو۔ صرف ایسے شخص کے لئے جس

---

[1] ـ نیل الاوطار ۸/۱۷۱

کا سفر معصیت کے لئے نہ ہو، اس امر کی اجازت ہے کہ وہ حالتِ اضطرار میں مُردار کھانے کی رخصت سے فائدہ اٹھائے، اس کے سوا کسی اور کو نہیں"۔

امام احمدؒ مجاہدؒ اور سعید بن جبیرؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

احنافؒ نے اس مسئلے میں اپنے مخالفین کے خلاف مندرجہ ذیل دلائل سے احتجاج کیا ہے:

۱۔ امام جصاصؒ فرماتے ہیں کہ ارشادِ باری تعالیٰ عزاسمہ:

الا ما اضطررتم الیہ

(الّا یہ کہ تم اس کے کھانے پر مجبور ہو جاؤ)

کی رُو سے حالتِ اضطرار میں مُردار کھانے کی اباحت سب کے لئے ثابت ہوتی ہے۔ خواہ وہ اللہ کے فرمانبردار لوگ ہوں یا نافرمان، اور دوسری آیت:

غیر باغ ولا عاد (۲: ۱۷۳)

(نہ تو نافرمانی کرنے والا ہو نہ زیادتی)

نیز

غیر متجانف لاثم (۵: ۳)

(لیکن کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو)

میں چونکہ اس امر کا بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد کھانے میں نافرمانی اور زیادتی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ حاکم وقت کے خلاف بغاوت و سرکشی، یا کسی اور شخص کے ساتھ زیادتی کرنا مراد ہو، لہٰذا اس احتمال کے پیشِ نظر ہمارے لئے یہ جائز نہیں کہ ہم اس دوسری آیت کے عموم کی تخصیص کریں بلکہ واجب ہے کہ اُسے کسی تخصیص کے بغیر عام معنی پر محمول کیا جائے۔

علاوہ ازیں ہمارے مخالف فقہاء کو اس امر سے اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کا سفر معصیت کے لئے نہ ہو، یعنی وہ حج کے لئے جا رہا ہو، یا کافروں سے جہاد کے لئے نکلا ہو یا تجارت کی غرض سے سفر کر رہا ہو، اور راستے کے دوران میں وہ کسی کا مال چھین کر اس کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہو یا نماز

چھوڑ دے یا زکوٰۃ ادا نہ کرے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب ہو، تو یہ زیادتی اور نافرمانی اس کے لئے اس امر میں مانع نہ ہوگی کہ وہ ضرورت کے وقت مُردار کھانے کی رخصت سے فائدہ اٹھائے۔

چنانچہ اس رائے سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ "غیر باغ ولا عاد" میں ہر قسم کی نافرمانی اور ظلم و زیادتی کی نفی وارد نہیں ہوئی اور نہ آیت میں کسی مخصوص شئے ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں یہ الفاظ مجمل طور پر استعمال ہوئے ہیں جو وضاحت کے محتاج ہیں۔

اسی طرح اس آیت کی رُو سے پہلی آیت (یعنی الا ما اضطررتم الیہ) کی تخصیص کرنا بھی جائز نہ ہوگا کیونکہ اسے اس کے حقیقی اور ظاہری معنوں میں استعمال کرنا ممکن نہیں۔ لیکن جب ہم اسے کھانے میں نافرمانی اور زیادتی پر محمول کریں گے تو الفاظ کو ان کے ان عمومی اور حقیقی معنوں میں استعمال کریں گے، جو اُن سے مراد لئے گئے ہیں اور جن معنوں میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ اس آیت کو ان معنوں پر محمول کرنا دو وجہ سے اولیٰ ہے:۔

اول یہ کہ ہم اس صورت میں آیت کو اس کے عموم پر استعمال کریں گے، اور دوسرے یہ کہ ہمارے لئے یہ ضروری نہ ہوگا کہ ہم اس کے ذریعے ارشاد باری تعالیٰ: "الا ما اضطررتم الیہ" کی تخصیص کریں۔

ایسی ہی صورت ارشادِ باری تعالیٰ: "غیر متجانف لاثم" کی ہے کیونکہ ہو سکتا ہے اس سے مراد تمام گناہوں سے بچنا ہو۔

حتیٰ کہ تمام گناہوں سے اجتناب کو ہم مضطر کے لئے مردار کھانے کے جواز کی شرط قرار دے دیں کہ نہ تو اس کا کھانے پینے کے سلسلہ میں کسی گناہ کی طرف میلان ہو اور نہ کسی دوسرے گناہ کی طرف یعنی مثلاً اگر کسی کو اس بات کی قدرت تو ہے کہ دراہم و دینار کے سلسلہ کے کسی ظلم کا تدارک کر سکتا ہے، مگر وہ نہیں کرتا یا نماز نہیں پڑھتا یا روزہ نہیں رکھتا اور پھر ان گناہوں سے وہ توبہ بھی نہیں کرتا تو اس کے لئے مردار کھانا حلال نہ ہوگا۔ یا یہ کہ معصیت کے ان کاموں کے باوجود اس کے لئے کھانا جائز ہوگا مگر شرط یہ ہے کہ سفر کسی معصیت کے لئے یا امام وقت کے خلاف بغاوت کے لئے نہ ہو۔ یہ بات

تو سب کے ہاں ثابت شدہ حقیقت ہے کہ بعض گناہوں کا ارتکاب بوقت ضرورت مردار کھانے کے جواز کے سلسلہ میں رکاوٹ نہیں ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ غیر متجانف لاثم میں ہر قسم کے گناہ سے اجتناب مراد نہیں ہے۔

۲۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولا تقتلوا انفسکم (۴: ۲۹)

(اور نہ قتل کرو اپنی جانوں کو)

چنانچہ اگر کوئی شخص مباح چیزیں کھانے سے رکا رہے، یہاں تک کہ بھوک سے اس کی موت واقع ہو جائے، تو تمام اہل علم کے نزدیک وہ اپنی جان کا ہلاک کرنے والا اور اسے ضائع کرنے والا قرار پائے گا۔ اس مسئلے میں عاصی و نافرمان اور مطیع و فرمانبردار سب کا ایک ہی حکم ہے، قطعاً کوئی اختلاف نہیں۔

کیا آپ اس بات کو نہیں مانتے کہ اگر کسی شخص کے پاس مباح کھانا موجود ہو اور وہ اسے نہ کھائے یہاں تک کہ مر جائے تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب قرار پائے گا، خواہ وہ حاکم وقت کے خلاف بغاوت کر کے معصیت کے سفر میں نکلا ہو۔

ضرورت کے وقت میتہ (مردار جانور) اس ذبح شدہ جانور کی طرح ہوتا ہے جس کا ذبح کرنا انسان کے امکان اور وسعت میں ہو۔

۳۔ ہماری رائے کے مخالف فقہاء کا یہ کہنا کہ عاصی و نافرمان کو (ضرورت کے وقت بھی مردار کھانے کی) اجازت نہیں، مردود ہے، اس لئے کہ وہ ایسے نافرمان کو جو مقیم ہو (یعنی حالت سفر میں نہ ہو) یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ رمضان میں روزہ نہ رکھے جب کہ وہ بیمار ہو۔ اسی طرح وہ عاصی و نافرمان لوگوں کو یہ اجازت بھی دیتے ہیں کہ اگر سفر میں پانی نہ ملے تو تیمم کر لیں۔ علاوہ ازیں اُن کی یہ بھی رائے ہے کہ ایسا شخص جو مقیم ہو، خواہ عاصی گنہگار ہو، موزوں پہ ایک دن اور ایک رات تک مسح کر سکتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ شریعت اسلامیہ میں مقیم اور مسافر تمام لوگوں کو عام اجازت دی گئی ہے کہ وہ موزوں پہ مسح کریں، خواہ وہ عاصی و نافرمان ہوں یا مطیع و فرمانبردار[1]

---

[1] احکام القرآن، تالیف امام جصاص ۱/ ۱۵۶-۱۵۹

حق یہ ہے کہ اس مسئلے میں احناف نے جو دلیلیں دی ہیں، ان کے پیشِ نظر انہی کی رائے زیادہ قوی ہے۔

مضطر کے لئے میتہ کا گوشت کتنی مقدار میں کھانا جائز ہے ؟

امام قرطبی فرماتے ہیں:

"بھوک یا تو دائمی (یعنی مسلسل ایک طویل عرصے تک رہنے والی) ہوگی یا وقتی، اگر دائمی ہو تو اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ ایسی صورت میں میتہ کا پیٹ بھر کر کھانا جائز ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو مضطر کے لئے یہ جائز نہیں کہ مردار کھائے، خصوصاً اُس صورت میں جبکہ اسے کسی مسلمان کی کوئی ایسی چیز مل جائے جس کے کھا لینے میں ہاتھ کاٹے جانے یا اور کوئی تکلیف پہنچنے کا خوف نہ ہو۔ جیسے درختوں میں لگی ہوئی کھجوریں یا رات کو پہاڑ سے چرائی ہوئی بکری یا اسی طرح کی کوئی اور چیز۔ اس مسئلے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی مندرجہ ذیل حدیث کے پیشِ نظر کوئی اختلافِ رائے نہیں"۔

ایک سفر میں ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ ہم نے ایک اونٹنی دیکھی جس کے تھن درختوں کے کانٹوں سے بچاؤ کے لئے کپڑے سے بندھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم اس کی طرف لپکے۔ یہ دیکھ کر حضور نبی کریمؐ نے ہمیں پکارا اور جب ہم لوٹ کر آپؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ اونٹنی ایک مسلمان گھرانے کی ہے اور، اللہ کے بعد، اُن کے لئے روزی اور خیر و برکت کا ذریعہ ہے۔ کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ جب تم اپنے توشہ دانوں کی طرف لوٹو اور دیکھو کہ اُن میں جو کچھ تھا کوئی لے گیا ہے، تو کیا یہ چیز تمہارے نزدیک قرینِ انصاف ہوگی ؟ ہم نے عرض کیا، نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ! اگر ہمیں کھانے پینے کے لئے کوئی چیز درکار ہو تو ہم کیا کریں ؟ آپؐ نے جواب دیا: "(جو کچھ تمہیں ملے اس میں سے) کھالو، لیکن اٹھا کر نہ لے جاؤ۔ اور (پینے کی جو چیز ملے اس میں سے پی لو لیکن اُٹھا کر نہ لے جاؤ"[1]

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: "(مضطر کے لئے) جائز نہیں کہ وہ اس سے زیادہ کھائے جتنا جسم د

[1] - تفسیر قرطبی ۲/۲۲۵

جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے ضروری ہو"۔ امام مُزنیؒ کا بھی یہی قول ہے۔

اس مسئلے میں علماء کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ ابتدا میں مُردار کا کھانا جائز نہیں، ہاں اگر (بھوک پیاس کی وجہ سے) ہلاکت کے قریب پہنچ جائے تو کھا پی سکتا ہے۔ اور اس حال میں بھی اس کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ سدِ رمق سے زیادہ کھائے۔[1]

امام قتادہؒ فرماتے ہیں کہ (کھائے لیکن) سیر ہو کر نہ کھائے۔

امام مالکؒ نے فرمایا ہے اور امام شافعیؒ کے بھی دو اقوال میں سے ایک قول یہی ہے کہ: "(مضطر کے لئے) جائز ہے کہ جب تک اُسے کھانے کی حاجت ہو کھائے، اس لئے کہ جب تک کھانے کی حاجت باقی ہو۔ کھانا شروع کرنے کے بعد اُسے روکنا جائز نہیں۔ جیسے وہ شخص جو اپنے نفس کے بارے میں ڈرتا تھا کہ گناہ میں پڑ جائے گا لیکن آزاد عورت سے نکاح کی استطاعت نہ رکھتا تھا، تو ایسے شخص کے لئے جب باندی سے نکاح کرنا مباح ہوگیا، اور اسے تعفف کا ادنیٰ درجہ حاصل ہوگیا، تو اب اس کا نکاح باطل نہ ہوگا"۔[2]

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف رائے نہیں کہ نہ حرام کھانے کے لئے صرف شدید بھوک کا ہونا کافی ہے اور نہ مضطر کے لئے یہ امر واجب ہے کہ وہ اُس وقت تک مُردار کھانے سے رُکا رہے جب تک ہلاکت کے قریب نہ پہنچ جائے کیونکہ ایسی صورت پیدا ہو جانے کے بعد کھانا پینا مفید نہیں ہوتا۔ فقہاء اس امر پر بھی متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص ڈرتا ہو کہ مُردار نہ کھایا تو بھوک سے مر جائے گا، یا ضعف کے سبب چلنے پھرنے یا سواری کرنے سے معذور ہو جائے گا اور اس طرح اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر ہلاکت کے گڑھے میں جا گرے گا، یا ایسی ہی کوئی اور صورتِ حال پیش آجانے کا خطرہ ہو تو ایسے حالات میں حرام کھا لینا جائز ہے۔[3]

---

[1] ۔ احکام القرآن تالیف امام جصاص ۱/۱۶۰

[2] ۔ معالم السنن ۴/۲۵۴

[3] ۔ الروضہ ۳/۲۸۲

اصبغ نے ابن القاسم سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے فرمایا: "مضطر کو چاہیئے کہ جب حرام چیز کھانے یا پینے کے سوا چارہ نہ ہو تو خون پی لے لیکن شراب سے پرہیز کرے۔ اور مُردار کا گوشت کھا لے لیکن اونٹ کی مینگنیوں کے قریب نہ جائے۔ ابن وھب کی رائے ہے کہ پیشاب پی لے لیکن شراب سے بچے کیونکہ اُس کے پینے سے حد لازم آتی ہے لہٰذا یہ پیشاب کی نسبت زیادہ سخت حرام ہے۔ امام شافعیؒ سے اس مسئلہ میں صراحت کے ساتھ منقول ہے۔[1]

کیا اضطرار کے وقت حرام چیز کا کھانا واجب ہے ؟

اس مسئلے میں علماء کے درمیان اختلافِ رائے ہے کہ آیا ضرورت کے وقت حرام چیز کا کھانا واجب ہے یا محض مباح۔ چنانچہ بعض علماء کی رائے ہے کہ ضرورت کے وقت اپنی جان بچانے کی غرض سے حرام چیز کا کھانا واجب ہے اس لئے کہ اپنی جان کو ہلاکت سے بچانا فرض ہے۔ اس رائے کی بنیاد ارشادِ باری تعالیٰ:

ولا تلقوا بایدیکم الی التہلکۃ (۲ : ۱۹۵)

(اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں)

اور

ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما (۴ : ۲۹)

(اور نہ قتل کرو اپنی جانوں کو بیشک اللہ تم پر مہربان ہے)

پر قائم ہے۔

امام شافعیؒ کے دو اقوال میں سے صحیح قول یہی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ بھی یہی رائے رکھتے ہیں اور حنابلہ کا بھی ایک نقطۂ نظر یہی ہے۔

دوسرے قول کے مطابق بوقتِ ضرورت حرام چیز کا کھانا واجب نہیں بلکہ صرف مباح ہے۔

---

[1] ۔ القرطبی ۲/۲۲۸

اس رائے کی بنیاد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی سے مروی اس حدیث پر ہے کہ بعض رومی سرکشوں نے انہیں پکڑ کر قید کر لیا اور تین دن تک سؤر کا گوشت کھانے اور پانی میں ملی ہوئی شراب پینے پر مجبور کرتے رہے لیکن انھوں نے نہیں پی جس سے ان کا سر چکرانے لگا اور قریب تھا کہ وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں ۔ یہ دیکھ کر ان لوگوں نے انہیں رہا کر دیا۔ حضرت عبداللہؓ نے ان سے کہا، میں جانتا تھا اللہ تعالیٰ نے میرے لئے (بحالتِ مجبوری) ان اشیاء کا کھانا پینا مباح کیا ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے لئے دین اسلام پر ہنسنے کا موقع فراہم ہو۔

دوسرے اس لئے کہ مجبوری کی حالت میں حرام اشیاء کا مباح ہونا صرف رخصت کے درجے میں ہے۔[1]

---

[1] - المغنی ۸/۵۹۶

چوتھا باب

قربانی ، ہدی ، فدیہ

اور

منیٰ کے مقام پر گوشت کے ضیاع کا مسئلہ

یہ باب تمہید اور چار فصلوں پر مشتمل ہے :

۱۔ پہلی فصل : قربانی کرنے والے سے متعلق احکام

۲۔ دوسری فصل : قربانی کے جانور سے متعلق امور

۳۔ تیسری فصل : قربانی کے وقت سے متعلق احکام

۴۔ چوتھی فصل : ہدی اور فدی کا بیان

نیز منیٰ کے مقام پر گوشت کے ضیاع کا مسئلہ

تمہید

اضاحی کی لغوی حیثیت:

لفظ اُضحیہ (قربانی) کا پہلا حرف یعنی ہمزہ اُفعولہ کے وزن پر اکثر مضموم پڑھا جاتا ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں اس کے تیسرے حرف "ح" کے نیچے زیر کے باعث ہمزہ کو مکسور بھی پڑھتے ہیں۔ اُضحیہ کی جمع اضاحی آتی ہے۔

اس لفظ کی ایک شکل ضحیہ ہے جس کی جمع ضحایا آتی ہے، جیسے عطیہ اور عطایا۔ اس کی چوتھی شکل ہمزہ کے زبر کے ساتھ اضحاۃ ہے اور جمع اضحیٰ، جیسے ارطاۃ اور ارطیٰ۔ اسی سے عید الاضحیٰ کا لفظ بنا ہے[۱]

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ قبیلہ قیس کی لغت میں اضحیٰ مذکر ہے جب کہ بنو تمیم اسے مونث استعمال کرتے ہیں۔[۲]

شرعی حیثیت:

شرعی نقطۂ نظر سے اسم اضحیہ ایک ایسے خاص جانور کے لئے مخصوص ہے جو خاص عمر کا ہو اور جسے ایک خاص دن بعض خاص شرائط اور اسباب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی نیت سے ذبح کیا جائے۔[۳]

تمام مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ:

فصل لربك وانحر (۱۰۸ : ۲)

(سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر)

اور اس ضمن میں وارد صحیح احادیث کے پیشِ نظر ایام نحر میں قربانی کرنا مسلمانوں کے لئے مشروع ہے۔ چنانچہ اُمُّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ حضور

۱۔ المصباح المنیر ۲/۴

۲۔ المجموع ۲/۲۸۲

۳۔ الزیلعی ۶/۲ - فتح القدیر ۸/۶۶ (احناف)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قربانی کے دن ابن آدم کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کو (قربانی کا خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں۔ قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا۔ قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے بارگاہِ رب العزت میں قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، لہٰذا خوش دلی کے ساتھ قربانی کرو۔" [۱]

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے یا دوسرے لوگوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، یا رسول اللہؐ! قربانی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تمہارے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت۔ پوچھا گیا ہمیں اس سے کتنا ثواب ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا ہر بال کے بدلے ایک نیکی۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہؐ! اون کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: اون کے ہر ریشے کے بدلے ایک نیکی۔ [۲]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"جو شخص استطاعت رکھنے کے باوجود قربانی نہ کرے وہ ہمارے مصلے کے قریب نہ آئے۔" [۳]

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک چاندی کے اس سکے سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں جو عید کے دن قربانی کئے جانے والے جانور پر خرچ ہو۔" [۴]

مذکورہ بالا احادیث اور اس ضمن میں وارد صحاح کی دیگر تمام احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ جانوروں کی قربانی کرنا ایک مشروع فعل ہے جس کے بارے میں علماء کے درمیان کوئی اختلافِ رائے نہیں۔

۱۔ یہ حدیث امام ابن ماجہؒ اور ترمذیؒ نے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ دیکھئے ابن ماجہؒ ۲/۱۰۴۵

۲۔ احمد اور ابن ماجہؒ۔ دیکھئے ابن ماجہؒ ۲/۱۰۴۵

۳۔ یہ حدیث امام احمدؒ اور ابن ماجہؒ نے روایت کی ہے دیکھئے ابن ماجہ ۲/۱۰۴۴

۴۔ اس روایت کو امام طبرانیؒ نے الکبیر میں نقل کیا ہے۔ دیکھئے مجمع الزوائد ۴/۱۷ اس حدیث کے راویوں میں ایک شخص ابراہیم بن یزید الخوزی ہے جو ضعیف ہے۔

قربانی کے مشروع کئے جانے کی حکمت:

سب سے پہلی اور اہم ترین چیز یہ ہے کہ عید کے مبارک دن اللہ کے نام پر جانور قربان کرنا انسان کو اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم سے قریب کر دیتا ہے۔ نیز اس عمل سے اُن باطل پرست لوگوں کی مخالفت ہوتی ہے جو بتوں یا انبیاء اور اولیاء کا تقرب حاصل کرنے کی غرض سے جانور ذبح کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان قربانی کے ذریعے اس امر کا عملی ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ اور اس کے راندۂ درگاہ شیطان رجیم کا مخالف ہے جو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتا ہے جن کے ذریعے وہ انسان کو شرک و گمراہی اور فتنہ و فساد میں مبتلا کر کے جہنم کی آگ میں جھونک سکے۔

دوسرے یہ حقیقت قارئین کرام سے مخفی نہ رہنی چاہیئے کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو سراپا رحمت و برکت ہے۔ بوقتِ ضرورت ایک دوسرے کو مالی امداد فراہم کر کے مسلمانوں سے عملی ہمدردی ظاہر کرنا اس دین کا بنیادی اصول ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ دین اپنے اولین درجے میں ایک اجتماعی دین ہے جس کا مقصد لوگوں میں باہمی اُلفت و محبت، ایک دوسرے کی اعانت و دستگیری اور خیر خواہی جیسے اعلیٰ اخلاق اور قابلِ ستائش صفات کی آبیاری کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عید الفطر کے دن مسلمانوں کے لئے واجب قرار دیا گیا ہے کہ وہ صدقۂ فطر ادا کریں۔ تاکہ اس سے فقراء مساکین یتامیٰ اور محتاجوں کے ساتھ مہربانی اور شفقت کا اظہار ہو۔ افسوس ہے کہ عید کے مبارک دن بھی جب کہ تمام چھوٹے بڑے، امیر غریب، عورت مرد خوشیاں منا رہے ہوتے ہیں، ہمارے معاشرے میں ایسے فقراء، مساکین، یتامیٰ اور بیوائیں بھی موجود ہوتی ہیں جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہوتی ہیں، جو فقر و فاقہ اور غم و اندوہ کی حالت میں اپنا وقت گزارتی ہیں۔ اسی طرح بعض کثیر العیال لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی آمدنی بہت محدود ہوتی ہے اور عموماً فقر و فاقہ سے دوچار رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے عید کا مناسب لباس اور دیگر ضروری چیزیں فراہم کر سکیں۔ لہذا اسلام نے دوسرے مسلمانوں پر ان کا یہ حق قرار دیا ہے کہ وہ اُن کی مدد کریں تاکہ وہ لوگ اور ان کے اہل و عیال بھی عید کی مسرتوں میں حصہ لے

سکیں اور ان کے ٹوٹے ہوئے پژمردہ دل فرحت و سرور کی لذت سے آشنا ہو سکیں۔

عیدالفطر کے دن فطرانہ ادا کرنے کا ایک فائدہ تو یہ ہے جو اوپر بیان ہوا، اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ چیز انسانی نفس کو حرص اور بخل جیسی اخلاقی برائیوں سے پاک کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے علاوہ ازیں روزہ دار سے رمضان کے مہینے میں جو لغویات، قصور اور فرو گذاشتیں ہوتی ہیں صدقۂ فطر ان کے لئے کفارہ کا کام بھی دیتا ہے۔

اسی طرح عیدالاضحیٰ کے مبارک و پُر مسرت دن، جب کہ تمام مسلمان، چھوٹے بڑے، امیر غریب خوشیاں مناتے ہیں، شریعت نے ان کے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ قربانی کے جانور ذبح کریں تاکہ ان کے دل حرص اور بخل کی آلائشوں سے پاک ہو جائیں، اور ان کا یہ عمل ان کے اہل و عیال، اعزا و اقربا، ہمسایوں، دوستوں، فقرا، مساکین، یتامیٰ، حاجت مندوں اور بیواؤں کے لئے حصول سعادت و مسرت کا ذریعہ بنے۔ ان باتوں کے علاوہ اصل بات یہ ہے کہ عیدالاضحیٰ کے دن جانور قربان کرنا اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

از روئے شرع تمام مسلمان اس امر کے مکلف ہیں کہ وہ خود اپنے لئے بھلائی کے کام کریں اور دوسروں کے ساتھ بھی احسان و مروّت سے پیش آئیں، خواہ وہ اسے پسند کریں یا ناپسند۔ اپنے اس طرز عمل سے مسلمان ایک دوسرے کا دل اس طرح جیتتے ہیں کہ انہیں احساس تک نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ اخوّت و ہمدردی دینِ اسلام کی صداقت و عظمت کی دلیل ہے جس کی مثال کوئی دوسرا دین یا نظامِ زندگی پیش نہیں کر سکتا۔

یہ باب چار فصلوں پر مشتمل ہے، یعنی:

۱۔ پہلی فصل : قربانی کرنے والے سے متعلق احکام
۲۔ دوسری فصل : قربانی سے متعلق احکام
۳۔ تیسری فصل : قربانی کے وقت سے متعلق احکام
۴۔ چوتھی فصل : ہدی اور فدی کا بیان، نیز منی کے مقام پر گوشت کے ضیاع کا مسئلہ۔

پہلی فصل

قربانی کرنیوالے سے متعلق احکام

یہ فصل چار مباحث پر مشتمل ہے :

پہلی بحث : قربانی کا حکم اور اس کی دلیل

دوسری بحث : قربانی دینے والے کی اہلیت

تیسری بحث : قربانی دینے والے کے لئے ضروری اُمور

چوتھی بحث : قربانی کی نیت کرنا، وکیل بنانا اور ذبح کرنے کے آداب

پہلی بحث

قربانی کا حکم اور اس کی دلیل

جمہور فقہاء جن میں ائمہ ثلاثہ، حضرت امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ شامل ہیں، اس امر پر متفق ہیں کہ ایام نحر میں قربانی کرنا سنت ہے۔ یہ قول حضرت ابو بکر الصدیق، حضرت عمر، حضرت بلال، ابومسعود البدری، سعید بن المسیب، علقمہ، الاسود، عطا اور حضرت امام ابویوسف (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کا ہے۔

امام ربیعہؒ، امام اوزاعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام لیثؒ اور بعض مالکی فقہاء کی رائے ہے کہ منیٰ کے مقام پر حاجیوں کے سوا، باقی مسلمانوں کے لئے قربانی دینا واجب ہے [1]

[1] : دیکھیے نیل الاوطار ۱۲۴/۵ المجموع ۲۸۴/۸ - ۲۸۶

چنانچہ مذہبِ احناف کے مطابق اگر کوئی شخص یہ نذر مانے کہ ایامِ نحر میں ایک بھیڑ کی قربانی دے گا تو اس پر دو بھیڑوں کا ذبح کرنا واجب ہوگا، ایک بھیڑ اُس نذر کی جو اس نے مانی تھی اور دوسری قربانی کی جو واجب ہے۔

بعض حنفیہ کی رائے ہے کہ اس پر صرف ایک بھیڑ کی قربانی دینا واجب ہے، کیونکہ اس کے یہ کہنے کا مقصد کہ میں ایامِ نحر میں ایک بھیڑ کی قربانی دوں گا اس قربانی کی خبر دینا تھا جو اس پر واجب تھی۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں ایامِ نحر سے پہلے ایک بھیڑ ذبح کروں گا تو اس مسئلے میں فقہائے احناف کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ اُس پر دو بھیڑوں کی قربانی دینا واجب ہوگا، کیونکہ اس صورت میں اس بات کا کوئی احتمال نہیں کہ اس نے اس قربانی کی، جو اس پر واجب تھی، اطلاع دی تھی۔[1]

امامیہ مذہب کی رُو سے قربانی دینا مستحب ہے لیکن یہ ایک ایسا استحباب ہے جس کی بہت تاکید کی گئی ہے، بلکہ کہا گیا ہے کہ جو شخص قربانی دینے پر قادر ہو اس کے لئے قربانی دینا واجب ہے۔[2]

مذہب زیدیہ اور اباضیہ کے مطابق قربانی دینا سنت مؤکدہ ہے۔[3] جو فقہاء قربانی سنت قرار دیتے ہیں، وہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثابت درجِ ذیل حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ:

میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عید الاضحیٰ کی نماز پڑھی، جب آپؐ نماز سے فارغ ہوئے تو آپؐ کے پاس ایک مینڈھا لایا گیا جسے آپؐ نے ذبح کیا اور فرمایا: "بسم اللہ واللہ اکبر، اے اللہ یہ میری طرف سے ہے اور میری اُمت کے ہر اُس فرد کی طرف سے ہے جس نے قربانی نہیں دی"۔[4]

---

[1] - دیکھئے بدائع الصنائع ۲۸۱۸/۶ - ۲۸۲

[2] - الروضۃ البہیہ شرح اللمعۃ الدمشقیہ ۱۹۸/۱

[3] - دیکھئے البحر الزخار ۲۱۰/۴ من لا یحضرہ الفقیہ ۲۹۲/۲

[4] - یہ حدیث امام احمدؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذی نے روایت کی ہے۔ دیکھئے سنن ابوداؤد بشرح محمد شمس الحق العظیم آبادی ۸۶/۷م (یعنی عون المعبود)

اسی طرح مذکورہ فقہاء اپنی رائے کی بنیاد اس حدیث کو بھی بناتے ہیں جو حضرت علیؓ بن الحسین نے حضرت ابو رافع کی روایت سے نقل کی ہے کہ:

"حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کرتے تو سفید و سیاہ رنگ کے دو فربہ سینگ دار مینڈھے خرید فرماتے۔ پھر جب آپؐ نماز اور خطبے سے فارغ ہو چکتے تو اُن میں سے ایک مینڈھا آپؐ کی خدمت میں لایا جاتا در آنحالیکہ آپؐ عیدگاہ میں کھڑے ہوتے۔ پھر آپؐ بنفس نفیس اُسے مدینے میں اپنے ہاتھ سے ذبح فرماتے اور کہتے: اے اللہ یہ میری پوری اُمت کے ہر اُس فرد کی جانب سے ہے جس نے آپ تعالیٰ کی توحید اور میرے لئے آپ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دینے کی شہادت دی۔ پھر دوسرا مینڈھا لایا جاتا، اُسے بھی آپؐ خود ذبح کرتے اور فرماتے: یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آلِ محمدؐ کی جانب سے ہے۔ پھر ان دونوں مینڈھوں کا پورا گوشت آپؐ مساکین کو کھلاتے، نیز آپؐ اور آپؐ کے اہلِ خاندان بھی کھاتے چنانچہ کئی سال تک ہم اس حال میں رہے کہ بنی ہاشم کا کوئی فرد قربانی نہ کرتا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ثواب عطا کر کے ہمیں تاوان سے بچا لیا۔ [1]

جمہور فقہاء کی رائے ہے کہ مذکورہ بالا احادیث اس امر کی جانب دلالت کرتی ہیں کہ قربانی دینا امر واجب نہیں، اس لئے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی جانب سے قربانی دے دی ہے اور یہ ہر شخص کے لئے کافی ہے، خواہ وہ قربانی دینے کی استطاعت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

جمہور فقہاء کی ایک اور دلیل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا درج ذیل ارشادِ گرامی ہے:

"تم میں سے جو شخص قربانی دینے کا ارادہ کرے وہ نہ اپنے بال کاٹے نہ ناخن تراشے"۔ [2]

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا حدیث میں اس امر کی دلیل موجود ہے کہ قربانی دینا واجب نہیں، اس لئے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی دینے

---

[1] - یہ حدیث امام احمدؒ نے روایت کی ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۵/۱۲۵

[2] - اس حدیث کو امام بخاریؒ کے سوا بہت سے محدثین نے روایت کیا ہے دیکھئے نیل الاوطار ۵/۱۲۵

کو ارادے کے ساتھ متعلق ٹھہرایا۔[1]

ایک اور حدیث جس سے اس مسئلے میں استدلال کیا جاتا ہے، وہ ہے جو امام احمدؒ نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مجھے چاشت کی دو رکعتیں ادا کرنے کا حکم دیا گیا، لیکن تمہیں یہ حکم نہیں ملا۔ اور مجھے قربانی کا حکم دیا گیا لیکن تم پر یہ فرض نہیں کی گئی۔"

ابن البزار، ابن عدی اور الحکم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"تین چیزیں ایسی ہیں جو میرے لئے فرض ہیں لیکن تمہارے لئے تطوع (نفل): قربانی دینا نمازِ وتر ادا کرنا اور چاشت کی دو رکعتیں پڑھنا"۔

اس حدیث کے متعلق الحافظ نے صراحت کی ہے کہ یہ جتنے طریقوں سے روایت کی گئی ہے سب کے مطابق ضعیف ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد احادیث اس ضمن میں روایت کی گئی ہیں لیکن اُن میں سے کوئی قوی نہیں۔[2]

لیکن جن فقہاء کے نزدیک قربانی دینا واجب ہے ان کے دلائل کا خلاصہ سطور ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فصل لربك وانحر

(سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: عید کی نماز ادا کرو اور اس کے بعد جانور کی قربانی دو۔ ان فقہاء کے نزدیک قربانی دینا جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھا اسی طرح

---

[1] ۔ دیکھئے نصب الرایہ ۲۰۶/۴ ۔ قرطبی ۱۰۹/۱۵ ۔ المجموع ۲۸۶/۸

[2] ۔ دیکھئے نیل الاوطار ۱۲۵/۵ (۲ : ۱۰۸)

آپؐ کی امت پر بھی واجب ہے۔ اس لئے کہ آپؐ اپنی امت کے پیشوا ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ارشاد باری تعالیٰ "وانحر" کا مطلب بعض تاویلات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نماز میں اپنا ہاتھ سینے کے بالائی حصے پر رکھو اور ایک قول کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں اپنا رُخ قبلے کی طرف رکھو، تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی رائے پر عمل کرنا اولیٰ ہے اس لئے کہ اس میں لفظ نحر کو نئے معانی پر محمول کیا گیا ہے۔ اور دوسری رائے میں اس لفظ کو جس معنی پر محمول کیا گیا ہے اُس سے تکرار لازم آتی ہے اس لئے کہ آپؐ کے نزدیک نماز میں ہاتھ سینے کے بالائی حصے پر رکھنا (پہلے ہی) نماز کے افعال میں سے ہے اور اس کے کمال سے تعلق رکھتا ہے۔ اور جہاں تک قبلے کی طرف رُخ کرنے کا تعلق ہے تو وہ نماز کی شرطوں میں سے ایک شرط ہے جس کے بغیر شرعاً نماز کا وجود متحقق نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ چیز خود نماز کے حکم میں داخل ہے اور نماز کا جو حکم ہے وہی اس کا حکم بھی ہے۔ اس لئے اگر ہم ارشاد باری تعالیٰ "وانحر" کے یہ معنی مراد لیں کہ نماز میں اپنا رُخ قبلے کی طرف رکھو تو اس سے حکم کی تکرار لازم آئے گی اس کے برخلاف اگر اس کے وہ معنی مُراد لئے جائیں جو ہم نے لئے ہیں تو ایسا کرنا اس لفظ کو ایک نئے فائدے پر محمول کرنا ہوگا جو ایک اولیٰ امر ہے۔

جمہور فقہاء نے اس دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ اس آیت (یعنی فصل لربک وانحر) کی مراد پاک پروردگار کی تخصیص کرنا ہے یعنی یہ کہ نماز میں اپنا رُخ صرف اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف رکھو نہ کہ بتوں کی طرف اس حکم کا مطلب یہی ہے کیونکہ یہ ایسی قید ہے جس کی طرف کلام متوجہ ہے۔[1]

حق یہ ہے کہ اس آیت میں وارد الفاظ "صلوٰۃ" اور "نحر" کے عام معنی مراد لینا اولیٰ ہے بخلاف اس کے کہ ان الفاظ کو مقید کیا جائے اور صلوٰۃ سے صلوٰۃ عید اور نحر سے ہاتھ نماز

[1] دیکھئے نیل الاوطار ۱۲۶/۵

میں سینے کے بالائی حصے پر کھنا یا قربانی کرنا مراد لیا جائے۔

اس سورۃ (یعنی اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ) کے معنی یہ ہیں .... اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والے ہیں... اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو الکوثر عطا فرما کر آپؐ پر احسان کیا ہے، پس آپؐ نماز کو اسی کے لئے خاص کر کے اسی کے لئے پڑھیں، اور اپنا رُخ اسی کی طرف رکھیں نہ کسی اور کی طرف۔ اور جو حکم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ہے وہ آپ کی پوری اُمت کے لئے ہے۔ چنانچہ نماز سے یہاں مراد خصوصیت کے ساتھ عید الاضحیٰ کی نماز نہیں۔ جیسا کہ نحر سے خاص قربانی مراد نہیں۔ بلکہ یہ الفاظ یہاں مطلق طور پر اپنے اپنے عام معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

محمد بن کعب القرظی نے کہا ہے کہ:

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ (کا مطلب یہ ہے کہ) آپؐ کی صلوٰۃ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اور آپؐ کا رُخ صرف اسی کی طرف ہو۔ یہی رائے ابن عربی کی ہے جو کہتے ہیں کہ:

"میرے نزدیک اللہ تعالیٰ یہاں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ: اپنے ربّ کی عبادت کرو اور اپنا رُخ اسی کی طرف رکھو۔ آپؐ کا ہر عمل صرف اسی بزرگ و برتر ہستی کے لئے ہونا چاہیئے جس نے الکوثر کے ساتھ آپؐ کی تخصیص فرمائی۔ ضروری ہے کہ آپؐ کا ہر عمل اس درجے کا ہو کہ اُسے الکوثر کے ساتھ آپؐ کی اس تخصیص کے برابر رکھا جا سکے۔ الکوثر کیا ہے؟ وہ ایک خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عطا فرمائی ہے۔ یا وہ ایک نہر ہے جس کی مٹی مشک ہے۔ اور اس کے برتنوں کی تعداد آسمان کے تاروں کے برابر ہے۔ لیکن اسے عید قرباں کی نماز اور مینڈھا، یا گائے یا اونٹ ذبح کرنے کے برابر سمجھنا اندازے، تدبیر اور بندوں کو ثواب دینے کے لحاظ سے دور کی بات ہے"[1]

٭ قربانی کو واجب سمجھنے والے فقہاء کی ایک دلیل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ:

قربانی دو، کیونکہ یہ تمہارے باپ (حضرت) ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔

مذکورہ بالا احادیث میں قربانی کا حکم مطلق طور پر دیا گیا ہے اور مطلق حکم میں اس امر کا قرینہ پایا جاتا

---

[1] دیکھئے احکام القرآن تالیف ابن عربی ۴/ ۱۹۸۷ - ۱۹۸۸

ہے کہ اس عمل کا بجالانا واجب ہے۔

اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ: "جو شخص قربانی نہ دے وہ ہمارے مصلیٰ کے قریب نہ آئے"۔ اس حدیث میں قربانی نہ دینے والوں کے لئے وعید پائی جاتی ہے اور وعید صرف واجب کے ترک پر سنائی جاتی ہے۔

اس حدیث کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جیسا کہ الفتح میں تحریر ہے، اس سے قربانی کا واجب ہونا صریح طور پر ثابت نہیں ہوتا۔[1]

اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حکم منقول ہے کہ قربانی کے جانور ذبح کیے جائیں اور اگر قربانی کا جانور عید کی نماز سے پہلے ذبح کر لیا جائے تو دوسرا جانور ذبح کیا جائے۔ ان تمام باتوں سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ قربانی دینا واجب ہے۔ علاوہ ازیں قربانی کا خون بہانا عبادت ہے اور عبادت واجب چیز ہے۔[2]

حق یہ ہے کہ اُن دلیلوں کے پیش نظر، جو قربانی کے واجب نہ ہونے سے متعلق جمہور فقہا نے پیش کی ہیں اس مسئلے میں انہیں کا قول زیادہ قوی ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ نذر مان لینے سے قربانی کا دینا واجب ہو جاتا ہے یا نہیں تو اس مسئلے میں فقہا کے درمیان کوئی اختلافِ رائے نہیں کہ نذر مان لینے سے قربانی واجب ہو جاتی ہے۔

دوسری بحث

قربانی دینے والے کی اہلیت

حنفیہ کے نزدیک قربانی کے واجب ہونے کی یہ شرط ہے کہ قربانی دینے والا مسلمان ہو۔ لہٰذا کافر

---

[1] ۔ دیکھئے نیل الاوطار ۵/۱۲۷

[2] ۔ دیکھئے بدائع الصنائع ۶/۲۶۶

کے لئے قربانی کا دینا واجب نہیں، آزاد ہو، لہذا غلام پر واجب نہیں، مقیم ہو، لہذا مسافر پر واجب نہیں اسی میں وہ حاجی شامل ہے جو حج کے سفر میں ہو۔ لیکن جہاں تک اہل مکہ کا تعلق ہے۔ ان پر قربانی دینا واجب ہے، خواہ وہ حج کر رہے ہوں۔ اسی طرح قربانی صرف اپنی ذات کی طرف سے دینا واجب ہے نہ کہ اپنے بچے کی طرف سے بھی (بخلاف صدقۂ فطر کے کہ وہ بچوں کی جانب سے بھی دیا جاتا ہے) اسی طرح ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اول وقت میں مقیم ہو، پھر آخر وقت میں سفر پیدا ہو جائے تو اس پر قربانی کا دینا واجب نہیں۔

لیکن جہاں تک بلوغ اور عقل کا تعلق ہے، یہ دونوں چیزیں امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قربانی کے واجب ہونے کی شرائط میں سے نہیں، تاہم امام زفرؒ اور امام محمدؒ انہیں بھی شرائط وجوب میں شمار کرتے ہیں۔

قربانی دینے والے کے لئے ایک امر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صاحب نصاب ہو، خواہ اُس کا مال کسی قسم کا ہو۔[1]

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قربانی کے واجب ہونے کی ایک اور شرط یہ ہے کہ قربانی دینے والا صاحب استطاعت ہو، اس لئے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص قربانی کی استطاعت رکھتا ہو، وہ قربانی دے۔[2]

چنانچہ اگر کسی شخص کے ذمہ اتنا قرض ہو کہ قربانی کی قیمت سے بڑھ جائے تو اس پر قربانی دینا واجب نہیں۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ قربانی دینے والا قربانی کے پورے وقت میں مال دار ہو چنانچہ اگر کوئی شخص اول وقت میں غریب ہو لیکن دوسرے وقت میں اس کے پاس مال آجائے اور قربانی دینا ممکن ہو جائے تو اس پر قربانی کا دینا واجب ہو جائے گا۔

اگر کوئی مال دار شخص ایام نحر میں قربانی دینے سے پہلے مر جائے تو وہ اس سے ساقط ہو جائے گی۔

اگر کوئی مال دار شخص قربانی دینے کے لئے بھیڑ خریدے، لیکن وہ بھیڑ ایام نحر کے دوران میں ہلاک ہو

۱۔ دیکھئے حاشیہ ابن عابدین ۶/ ۳۱۵

۲۔ دیکھئے بدائع الصنائع ۶/ ۲۸۱۸

جائے یا چوری ہو جائے یا گم ہو جائے تو قربانی دینے والے کے لئے واجب ہوگا کہ دوسرا جانور خرید کر قربانی دے۔[1]
مالکیہ کے نزدیک منیٰ کے مقام پر حاجیوں کے سوا، دیگر لوگوں کے لئے قربانی دینا سنت ہے۔ چنانچہ اُن کے نزدیک حاجیوں پر قربانی نہیں، کیونکہ وہ (یعنی منیٰ) قربانی دینے کا مقام نہیں۔
شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک قربانی دینا مقیم اور مسافر دونوں کے لئے یکساں سنت ہے۔ اسی طرح منیٰ کے مقام پر حاجیوں کے لئے قربانی کرنا سنت ہے۔ اُن کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں منیٰ کے مقام پر اپنی ازواج مطہرات کی جانب سے قربانی دی۔

اسی طرح حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قربانی کا جانور ذبح کیا اور مجھ سے فرمایا: "اے ثوبان! مجھے اس کا گوشت پکا دو چنانچہ میں وہ گوشت آپ کو کھلاتا رہا یہاں تک کہ آپ مدینہ میں داخل ہو گئے۔"[2] یہ رائے جمہور فقہاء کی ہے۔[3]
شافعیہ کے نزدیک یہ امر جائز نہیں کہ کسی یتیم یا سفیہ (ناسمجھ) کا ولی اُس کی طرف سے قربانی دے۔ اس لئے کہ اپنے زیرِ تولیت افراد کا مال احتیاط سے خرچ کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا اس کے لئے جائز نہیں کہ اُن کے مال میں سے تبرع (صدقہ) کے طور پر خرچ کرے۔ اور قربانی دینا تبرع ہے۔
لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک، اگر یتیم یا سفیہ مال دار ہو تو اس کی جانب سے اس کا ولی قربانی دے گا، جیسا کہ صدقہ فطر ادا کیا جاتا ہے۔ امام احمدؒ سے اس مسئلے میں دونوں روایتیں مروی ہیں۔[4]

جہاں تک میت کی جانب سے قربانی دیئے جانے کا سوال ہے، ابوالحسن العبادی نے کہا ہے

---

[1] ۔ دیکھئے بدائع الصنائع ۶/۲۸۱۸ - ۲۸۲۰
[2] ۔ یہ حدیث امام احمد اور مسلم نے روایت کی ہے۔ دیکھئے صحیح مسلم کی شرح نووی ۱۳/ ۱۳۳
[3] ۔ دیکھئے نیل الاوطار ۵/ ۱۲۶
[4] ۔ دیکھئے المجموع ۸/۳۲۴ - المغنی ۸/ ۶۳۱ - حاشیۃ الدسوقی علی شرح الکبیر ۲/ ۱۱۸

کہ شافعیہ کے نزدیک ایسا کرنا مطلقاً جائز ہے۔ اس لئے کہ یہ چیز صدقے کی ایک قسم ہے اور میت کی جانب سے صدقہ دینا صحیح بھی ہے اور اُسے فائدہ بھی پہنچاتا ہے اور بالا جماع اُسے پہنچتا بھی ہے۔ حنابلہ میں سے صاحب الفروع نے اس کی اجازت دی ہے، اور احناف کا مذہب بھی یہی ہے۔[1]

"کتاب العدۃ" کے مصنف اور امام البغوی نے کہا ہے کہ: "میت کی جانب سے قربانی دینا صرف اس صورت میں صحیح ہے جب کہ میت نے اس کی وصیت کی ہو"۔ یہی رائے امام الرافعی نے قطعیت کے ساتھ "المجرد" میں ظاہر کی ہے۔ اس سلسلے میں ابوالحسن العبادی کے استدلال کی بنیاد اُس حدیث پر ہے جو حنش سے روایت کی گئی ہے اور جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دو مینڈھے ذبح کرتے ہوئے دیکھا تو ان سے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی ہے کہ میں ان کی جانب سے قربانی دوں۔ چنانچہ میں حضورؐ کی جانب سے قربانی دیتا ہوں۔[2]

امام بیہقی فرماتے ہیں: "اگر یہ روایت صحیح ثابت ہو جائے تو اس سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ میت کی جانب سے قربانی دینا صحیح ہے۔ اور اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والے ہیں۔[3]

منذری کہتے ہیں: "حنش سے مُراد ابوالمعتمر الکنانی الصنعانی ہیں"۔

اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ غریب ہے، ہم اسے شریک کے سوا کسی اور طریق سے نہیں جانتے۔ ابن حبان البستی نے کہا ہے کہ (شریک) حدیث بیان کرنے میں بہت جھوٹ بولتا تھا اور حضرت علیؓ سے احادیث روایت کرنے میں منفرد تھا لہٰذا اس کی حدیث کو ثقہ لوگوں کی حدیث جیسا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بالآخر لوگوں نے اسے "ناقابل تسلیم قرار دے دیا۔

---

[1] - دیکھئے الفروع ۵۵۴/۳۔ حاشیہ ابن عابدین ۳۲۶/۶

[2] - یہ روایت امام مسلم ابوداؤد، ابن ماجہؒ، الحاکمؒ اور احمدؒ نے روایت کی ہے دیکھئے سنن ابی داؤد مع عون المعبود ۴۸۶/۷۔

[3] - دیکھئے المجموع ۳۰۷/۸-۳۰۹

امام ابن المبارک نے کہا ہے کہ: "میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میت کی جانب سے صدقہ دیا جائے لیکن قربانی نہ کی جائے اور اگر کی جائے تو اس میں سے خود کچھ نہ کھایا جائے بلکہ سارا گوشت صدقہ کر دیا جائے۔" [1]

احناف کے نزدیک میت کی جانب سے دی گئی قربانی کا گوشت بھی اسی تناسب سے تقسیم کیا جائے گا جس تناسب سے زندہ انسان کی جانب سے دی گئی قربانی کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے، یعنی ایک تہائی قربانی دینے والا خود کھائے، ایک تہائی ہدیہ دے اور ایک تہائی فقراء پر صدقہ کر دیا جائے۔ اِلاّ یہ کہ میت نے قربانی کی وصیت کی ہو۔ اگر میت نے وصیت کی ہو تو ایسی صورت میں اس میں سے کچھ نہ کھایا جائے بلکہ سارا گوشت فقراء اور مساکین پر صدقہ کر دیا جائے۔ [2]

غنیۃ الالمعی میں کہا گیا ہے کہ: "بعض علماء کا قول ہے کہ جن لوگوں نے میت کی جانب سے قربانی دینے کی اجازت دی ہے اُن کے اکثر اقوال دلائل کے مطابق ہیں اور جن لوگوں نے اس سے رد کیا ہے ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ لہٰذا ان کی رائے قبول نہیں کی جائے گی۔ اِلاّ یہ کہ وہ کوئی قوی تر دلیل پیش کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس رائے کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت ہے کہ آپؐ اپنی اُمت کے ہر اُس فرد کی جانب سے جس نے اللہ کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دینے کی شہادت دی، نیز اپنی اور اپنے اہل بیت کی جانب سے قربانی دیا کرتے تھے۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے بہت سے افراد آپؐ کی زندگی ہی میں دور دور پھیل گئے تھے لیکن آپ کی اُمت کے تمام زندہ اور مُردہ افراد آپؐ کی قربانی میں داخل ہیں۔ اور وہ ایک مینڈھا جس کی قربانی آپؐ اپنی اُمت کی جانب سے دیا کرتے تھے، جس طرح زندوں کی جانب سے تھا، اسی طرح بلا فرق و امتیاز مُردوں کی جانب سے تھا۔ [3]

---

[1] - عون المعبود ۷/۴۸۸

[2] - دیکھئے حاشیہ ابن عابدین ۶/۳۲۶

[3] - عون المعبود ۷/۴۸۸

مالکیہ کے نزدیک مردوں کی جانب سے قربانی دینا مکروہ ہے؛ اِلّا یہ کہ میت نے اس کی وصیّت کی ہو اور اُس کی وصیت کے مطابق قربانی دی جائے۔ [1]

المختصر قرینِ صواب رائے۔ اور اللہ سبحانہٗ تعالیٰ زیادہ جاننے والے ہیں۔ وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن المبارک نے ظاہر کی ہے کہ جب میت کی جانب سے قربانی دی جائے تو پورے کا پورا گوشت صدقہ کر دینا چاہیئے کیونکہ وہ قربانی صدقہ کے حکم میں ہے، اور صدقہ صرف فقراء اور مساکین کا حق ہے۔

اس مسئلے میں تمام فقہاء متفق الرائے ہیں کہ ماں کے پیٹ میں موجود بچے کی جانب سے قربانی نہیں دینی چاہیئے۔ یہ رائے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے [2]

تیسری بحث

قربانی دینے والے کے لئے ضروری امور

اُم المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب ذوالحجہ کا پہلا عشرہ شروع ہو جائے اور تم میں سے کوئی شخص قربانی دینے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیئے نہ اپنے بال کٹوائے نہ ناخن ترشوائے"۔ [3]

اس حدیث میں عشرہ سے مراد ماہ ذوالحجہ کا پہلا عشرہ ہے جو چاند دیکھنے سے لے کر دسویں تاریخ تک رہتا ہے۔ اس امر میں فقہاء کے مابین اختلافِ رائے ہے کہ آیا بال نہ کٹوانے اور ناخن نہ ترشوانے کا یہ حکم وجوب کا درجہ رکھتا ہے یا مندوب کا؟

---

[1] ۔ دیکھئے الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی ۲/۱۲۲

[2] ۔ دیکھئے المغنی ۸/۶۴۳

[3] ۔ اس حدیث کو بخاری کے سوا بہت سے محدثین نے روایت کیا ہے۔ دیکھئے صحیح مسلم کی شرح نووی ۱۳/۱۳۹ ابن ماجہ ۲/۱۰۵۲

چنانچہ شافعیہ کے نزدیک اور مالکیہ کے ایک قول کے مطابق، قربانی دینے والے کے لئے یہ امر مکروہ ہے کہ وہ اپنا قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے اپنے بال کٹوائے یا ناخن ترشوائے۔ تاہم یہ کراہیت تنزیہی ہے۔[1]

لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں کوئی کراہیت نہیں، حضرت امام مالکؒ سے بھی ایک روایت اسی مضمون کی مروی ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ، سعید بن المسیب، ربیعہ، اسحاق اور داؤد رحمہم اللہ تعالیٰ کی رائے ہے کہ حدیث سابق الذکر کے مطابق قربانی دینے والے کے لئے یہ امر حرام ہے کہ وہ اپنے ناخنوں یا بالوں میں سے کوئی چیز کٹوائے۔

کراہیت کے قائل فقہاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی درج ذیل حدیث سے استدلال کیا ہے کہ:

"حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے اپنے قربانی کے جانور آگے بھیج دیتے۔ چنانچہ ان کی گردنوں میں قربانی کے قلادے ڈال دیئے جاتے: پھر آپؐ ایسی کسی چیز سے اجتناب نہ فرماتے جس سے محرم (یعنی حالت احرام والا شخص) اجتناب کرتا ہے"[2]

حضرت امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ: قربانی کے جانور کا آگے بھیج دینا قربانی کی نیت کرنے سے بڑھ کر ہے۔ اس سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ (بال اور ناخن وغیرہ کا ترشوانا) حرام نہیں۔[3]

حنابلہ نے حدیث عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جواب دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

حدیث ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صحت اور اس امر کے پیش نظر کہ کوئی ایسی حدیث مرفوعاً نہیں جو اس کے برخلاف ہو، میں ان لوگوں کے قول کو پسند کرتا ہوں جو اس حدیث کے ظاہر کے مطابق

---

[1] ۔ دیکھئے المجموع ۲۹۱/۸

[2] ۔ اس حدیث کو بہت سے محدثین نے روایت کیا ہے۔ دیکھئے سنن ابی داؤد بہ ابن قیم کی شرح ۹۱/۸ نیز ابن ماجہ ۱۰۲۳/۲۔

[3] ۔ دیکھئے المجموع ۲۹۲/۸۔

رائے رکھتے ہیں"۔

جہاں تک حدیث عائشہؓ کا تعلق ہے، وہ صرف اس امر کی جانب دلالت کرتی ہے کہ جو شخص اپنا قربانی کا جانور آگے بھیج دے اور خود اپنے اہل و عیال میں قیام پذیر ہے تو وہ حلال کی حیثیت سے قیام پذیر رہتا ہے اور اپنا جانور آگے بھیج دینے کی وجہ سے محرم نہیں ہو جاتا۔ اس حدیث میں علمائے سلف میں سے ان لوگوں کے قول کی تردید پائی جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ اپنا جانور آگے بھیج دینے کی وجہ سے وہ محرم ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے، جیسا کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے، یہ حدیث روایت کی۔

حدیث اُم سلمہؓ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص قربانی دینے کا ارادہ کرے اسے چاہیے کہ عید تک پہلے عشرے کے دوران میں خصوصیت کے ساتھ بال اور ناخن کتروانے سے پرہیز کرے تا ایئے ان دونوں حدیثوں میں کون سا تعارض پایا جاتا ہے؟

اسی لئے حضرت امام احمدؒ وغیرہ ان دونوں حدیثوں پر عمل کرتے تھے ایک حدیث پر اُس کے اپنے مقام پر اور دوسری حدیث پر اس کے اپنے مقام پر۔

اگر بطریق فرض یہ کہا جائے کہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض پایا جاتا ہے، تو ایسی صورت میں حدیثِ اُمِّ سلمہؓ کو خاص سمجھا جائے گا اور حدیثِ عائشہؓ کو عام اور دونوں حدیثوں میں تطبیق دینے کے لئے ضروری ہوگا کہ عام کا انطباق ایسے مفہوم پر کیا جائے جو خاص کے مفہوم سے مختلف ہو۔

چنانچہ حدیثِ عائشہؓ کو اس کے سوا کسی اور امر پر محمول کرنا واجب ہوگا جس کی طرف حدیثِ اُمِّ سلمہؓ نے رہنمائی کی ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسا کام نہ کر سکتے تھے جو ممنوع ہو، خواہ وہ صرف مکروہ ہی کیوں نہ ہو۔

علاوہ ازیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا صرف ایسے افعال کے ظاہر سے واقف تھیں جنہیں اکثر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بجا لاتے تھے یا جو لباس وغیرہ آپؐ استعمال فرماتے تھے۔ لیکن ایسے افعال جو آپؐ کبھی کبھی کرتے تھے، جیسے ناخن ترشوانا اور بال کٹوانا، جو متعدد ایام میں صرف ایک دفعہ کئے جاتے ہیں، ان کے عشرہ ذی الحجہ کے دوران میں آنحضرتؐ سے وقوع کے بارے میں حضرت عائشہؓ کو خبر نہ

ہوئی اور انہوں نے فرمایا کہ: آپؐ نے اپنے اوپر کوئی چیز حرام نہیں کی۔"

حضرت عائشہؓ کی اس حدیث کا مقصود نفی کی شہادت ہے اس لئے یہ حدیث حضرت ام سلمہ کی حدیث سے معارض نہیں ہے بغرض بظاہر حضرت عائشہ کی حدیث ام سلمہ کی حدیث کو رد نہیں کرتی اور اگر ایسا ہے بھی تو اس میں تخصیص کا احتمال موجود ہے جس کے لئے دلیل موجود ہے۔

جہاں تک حدیثِ اُم سلمہؓ کا تعلق ہے اس کا بیان بالکل واضح ہے، لہٰذا اس پر عمل نہ کرنا اور اسے یونہی چھوڑ دینا بھی جائز نہیں۔ حضرت اُم سلمہؓ نے اپنی حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور آپؐ کی شریعت کی خبر دی ہے، لہٰذا اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ اور حضرت عائشہؓ نے خود جو کچھ دیکھا اس کی بنیاد پر وہ نفی کی خبر دیتی ہیں۔ یعنی یہ کہ انہوں نے دیکھا کہ (قربانی کے جانور آگے بھیج دینے کی وجہ سے) آپؐ محرم نہیں ہوگئے کہ آپؐ پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جائیں جو محرم کے لئے حرام ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی خبر نہیں دی کہ: "اس کی وجہ سے تم میں سے کسی کے لئے کوئی چیز حرام نہیں ہوئی"۔ اور یہ چیز حدیثِ اُم سلمہؓ کی صراحت سے معارض نہیں۔

جہاں تک قیاس کی بنیاد پر حدیث کو رد کرنے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں اگر صرف اتنا کہا جائے کہ یہ قیاس فاسد ہے جو نص سے متصادم ہے تو صرف اتنا کہہ دینا قیاس کو رد کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ صریح سنت کے ذریعے قیاس کو رد کرنا اس سے بہتر ہے کہ سنت کو قیاس کے ذریعے رد کیا جائے۔

علاوہ ازیں عورتوں، خوشبو اور لباس کا حرام ہونا ایسا معاملہ ہے جو احرام کے ساتھ مخصوص ہے اور قربانی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن ناخن لینا اور بال کٹوانا ایسے کام ہیں جو قربانی کی عبادت کو مکمل کرنے والے ہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کی حدیث اور آپ کا یہ قول اس باب کی ابتدا میں پیش کیا جا چکا ہے کہ: "اپنے بال کٹواؤ اور پیڑو کو مونڈو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ چیز تمہاری قربانی کو مکمل کرنے والی ہے۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو پسند فرمایا کہ بال اور ناخن بڑھائے جائیں تاکہ انہیں

قربانی کے ساتھ کاٹا جائے اور یہ چیز اللہ کے نزدیک قربانی کو مکمل کرنے والی ہو۔

اس سلسلے میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لئے یہ امر بھی مشروع قرار دیا ہے کہ جب وہ لڑکے کے عقیقہ کا جانور ذبح کریں تو اس کے ساتھ بچے کا سر بھی منڈوائیں، یہ حکم اس امر کی جانب دلالت کرتا ہے کہ جانور ذبح کرنے کے ساتھ سر کا مونڈنا افضل و اولیٰ ہے۔ بلاشبہ توفیق اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے[1]

اگر یہ کہا جائے کہ بالوں کا کٹوانا اور ناخنوں کا ترشوانا حرام کیسے ہو سکتا ہے جب کہ قربانی دینا بذاتِ خود صرف سنت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کوئی امر مانع قطعاً موجود نہیں جو اس سے روکتا ہو۔ ایسے بہت سے مسائل ہیں جو اس مسئلے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ جیسے اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے لئے نفل نماز ادا کرنے کا ارادہ کرے تو وہ نماز اس کے حق میں سنت ہے۔ اگر وہ نماز پڑھے گا تو اس کا ثواب اُسے ملے گا۔ اگر نہ پڑھے گا تو گنہگار نہ ہو گا۔ لیکن جب وہ نماز پڑھنی شروع کرے گا تو اس کے لئے واجب ہو گا کہ اپنا رُخ قبلے کی طرف رکھے اور یہ کہ رکوع و سجود کرے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص نفل روزہ رکھنا چاہے گا تو اس کے لئے واجب ہو گا کہ ایسے تمام امور سے اجتناب کرے جن سے روزہ دار اجتناب کرتا ہے۔[2]

ناخن تراشنے یا بال کاٹنے کی جو ممانعت ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ناخنوں کو تراش کر یا توڑ کر یا کسی اور صورت میں جسم سے علیحدہ نہ کیا جائے۔ اسی طرح بالوں کو مونڈنے کی جو ممانعت ہے اس سے مراد یہ ہے کہ بالوں کو مونڈ کر، یا چھوٹا کر کے یا نوچ کر، یا جلا کر، یا کسی بال صفا پاؤڈر یا پیسٹ، یا کسی اور ذریعے سے جسم سے علیحدہ نہ کیا جائے۔ اس مسئلے میں پیڑو اور بغل کے بالوں، نیز مونچھوں وغیرہ سب کا ایک ہی حکم ہے۔

---

[1] - شرح سنن ابی داؤد، تالیف علامہ ابن قیمؒ مع عون المعبود ۷/ ۲۹۱ - ۲۹۲

[2] - المحلی، تالیف علامہ ابن حزم ۷/ ۳۵۶

ممانعت کی حکمت

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بال اور ناخن وغیرہ تراشنے کی اس ممانعت میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ انسان نارِ جہنم سے رہائی کے لئے کامل الاجزاء رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مقصد محرم سے مشابہت پیدا کرنا ہے۔ ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ یہ رائے غلط ہے، اس لئے کہ (قربانی دینے والا) نہ عورتوں سے علیحدگی اختیار کرتا ہے، نہ خوشبو اور لباس کا استعمال اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ترک کرتا ہے جنہیں محرم ترک کر دیتا ہے۔[1]

چوتھی بحث

قربانی کی نیت کرنا، وکیل بنانا اور ذبح کرنے کے آداب

قربانی کی نیت کرنا اس کے صحیح ہونے کی شرط ہے۔ یہ مسئلہ فقہاء کے مابین متفق علیہ ہے، اس لئے کہ قربانی کرنا اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ آیا یہ امر جائز ہے کہ ذبح کرنے سے پہلے نیت کر لی جائے یا ذبح کرتے وقت قربانی کی نیت کرنا شرط ہے!

اس مسئلے میں فقہاء کرام کی دو رائیں ہیں جن میں سے صحیح تر رائے یہ ہے کہ ذبح کرنے سے پہلے قربانی کی نیت کر لینا جائز ہے، جیسا کہ صحیح قول کے مطابق روزہ رکھنے سے پہلے روزہ کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے پہلے زکوٰۃ کی نیت کر لینا جائز ہے۔

لیکن دوسری رائے کے مطابق قربانی کے صحیح ہونے کی یہ شرط ہے کہ ذبح کرتے وقت نیت کی جائے، جیسا کہ نماز پڑھتے وقت نماز کی اور وضو کرتے وقت وضو کی نیت کی جاتی ہے۔

"اگر کوئی شخص کہے میں نے یہ جانور قربانی کے لئے مخصوص کیا"، تو کیا اس کی جانب سے

---

[1] دیکھئے المجموع ۸/ ۲۹۱

جانور کی یہ تخصیص و تعیین، قربانی دینے کا ارادہ اور ذبح کرنا کافی ہے؟ اس مسئلے میں بھی فقہاء کے دو قول ہیں، اور اکثر فقہاء کے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں اس لئے کہ قربانی کرنا فی نفسہ ایک نیک کام ہے لہذا اس کی نیت کرنا واجب ہے۔ امام الحرمینؒ اور امام غزالیؒ نے اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ ایسا کرنا کافی ہے کیونکہ اس میں نیت شامل ہے۔ شیخ ابو حامدؒ نے قطعیت کے ساتھ اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔

اگر ایک شخص نے دوسرے آدمی کو قربانی کرنے کے لئے وکیل بنایا اور اس کے ذبح کرنے کے وقت قربانی کی نیت کر لی تو یہ بات کافی ہے۔ یہ امر ضروری نہیں کہ وکیل بھی نیت کرے۔ بلکہ اگر وکیل سرے سے اس امر ہی سے واقف نہ ہو کہ وہ قربانی کر رہا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں، اگر کوئی شخص ایک بھیڑ خریدے اور اس کے متعلق نیت کرے کہ وہ قربانی کے لئے ہے تو وہ اس کا مالک بن جائے گا۔ لیکن صرف نیت کرنے سے وہ بھیڑ قربانی کا جانور نہیں بن جائے گی چنانچہ (قربانی کے طور پر) اس کا ذبح کرنا لازم نہ ہو گا۔ قربانی کے لئے ضروری ہو گا کہ خریدنے والا اپنی زبان سے اس امر کی نذر مانے کہ یہ جانور قربانی کے لئے ہے۔

ہمارا (یعنی شوافع کا) مذہب یہی ہے۔ یہی رائے امام احمدؒ اور امام داؤدؒ کی بھی ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی رائے ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں خریدا ہوا جانور قربانی کا جانور بن جائے گا اور صرف نیت کرنے کی وجہ سے اس کا ذبح کرنا لازم ہو گا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص آزاد کرنے کی نیت سے غلام خریدے تو محض نیت کرنے سے وہ غلام آزاد نہیں ہو جاتا [1] (بلکہ زبان سے کہہ کر اُسے آزاد کرنا پڑتا ہے) اسی طرح محض نیت کرنے سے کوئی جانور قربانی کا جانور نہیں بن جاتا۔

اس امر پہ فقہاء کا اتفاق رائے ہے کہ قربانی دینے والے کے لئے افضل بات یہ ہے کہ وہ خود نیت کرے اور اپنے ہاتھ سے جانور ذبح کرے۔ اگر اس نے اپنے سوا مسلمانوں میں سے کسی کو وکیل

---

[1] ۔ المجموع ۸/۲۵

بنایا اور اس نے خود، یا اس کے وکیل نے اس کی جانب سے نیت کی تو یہ امر جائز ہے۔ جہاں تک اہل کتاب میں سے کسی کو وکیل بنانے کا تعلق ہے تو اس مسئلے میں امام مالکؒ سے دونوں قول مروی ہیں۔

امام شافعیؒ کے نزدیک اگر اہلِ کتاب میں سے کسی ایسے شخص کو وکیل بنایا جائے جس کا ذبیحہ کھانا جائز ہو تو یہ امر جائز ہے۔ لیکن افضل بات یہی ہے کہ قربانی کا جانور کوئی مسلمان ذبح کرے۔

اگر قربانی کا جانور مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کیا گیا تو قربانی نہ ہوگی اور ذبح کرنے والے کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔[1]

عورتوں کے لئے مستحب امر یہ ہے کہ وہ اپنا جانور ذبح کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنالیں۔ اسی طرح وکیل بنانے والے کے لئے، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، یہ امر مستحب ہے کہ وہ اپنے جانور کو ذبح ہوتے دیکھے اس لئے کہ حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا: "اپنی قربانی کے پاس کھڑی رہو اور اسے دیکھو، اس لئے کہ اس کے خون کا جو پہلا قطرہ گرے گا اس سے تمہارے تمام سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اسی طرح قربانی دینے والے کے لئے یہ امر بھی مستحب ہے کہ وہ قربانی کا گوشت خود تقسیم کرے۔ تاہم اس کام کے لئے کسی کو اپنا وکیل بنانا بھی جائز ہے۔[2]

ذبح کرنے کے آداب

جہاں تک ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں فقہاء کی آراء اور اختلافات پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اس سے قبل بیان کئے جا چکے ہیں۔ اس سلسلے میں افضل امر یہ ہے کہ کہا جائے "بسم اللہ واللہ اکبر" اور قربانی کرنے والے کے لئے مستحب یہ ہے کہ کہے:

اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّیْ ھٰذَا مِنْکَ وَاِلَیْکَ۔[3]

اے اللہ میری یہ قربانی قبول فرما۔ یہ آپ کی عطا سے ہے اور صرف آپ کی رضا کے لئے ہے۔

---

[1] ۔ قوانین الاحکام الشرعیہ ۱۹۸ [2] ۔ دیکھئے المجموع ۸/۳۰۵

[3] ۔ دیکھئے زاد المعاد ۱/۲۹۶ - المجموع ۸/۳۱۱

روایات میں یہ بھی وارد ہے کہ ذبح کرتے وقت پڑھا جائے:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔
اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَ
بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ
اَللّٰهُمَّ مِنْکَ وَلَکَ [1]

ترجمہ:

میں نے متوجہ کر لیا اپنے منہ کو اسی کی طرف جس نے بنائے آسمان اور زمین سب سے یک سو ہو کر اور میں نہیں ہوں شرک کرنے والا۔

میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو پالنے والا سارے جہاں کا ہے کوئی نہیں اس کا شریک اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں۔

اے اللہ یہ آپ کی عطا سے ہے اور صرف آپ کی رضا کے لئے ہے۔

---

[1] اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ دیکھئے ابن ماجہ ۲/۱۰۴۳

دوسری فصل

قربانی کے جانور سے متعلق اُمور

یہ فصل چار مباحث پر مشتمل ہے:

پہلی بحث : قربانی کے جانوروں کی قسمیں

دوسری بحث : ان کی صفات اور عمریں

تیسری بحث : قربانی کی تعداد

چوتھی بحث : قربانی کے گوشت اور کھال سے متعلق احکام

پہلی بحث

قربانی کے جانوروں کی قسمیں

اس امر پر فقہاء کا اجماع ہے کہ قربانی صرف چوپاؤں یعنی اونٹ، گائے، اور بھیڑ بکری وغیرہ کی دینا جائز ہے۔ تاہم امام الحسن بن صالح کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا جنگلی گائے کی قربانی سات آدمیوں کی جانب سے اور ہرن کی قربانی ایک آدمی کی جانب سے دی جاسکتی ہے۔

ظاہریہ کے نزدیک ہر ایسے حیوان کی قربانی دینا جائز ہے جس کا گوشت کھایا جاتا ہو، خواہ وہ چوپایہ ہو، جیسے گھوڑا، اونٹ اور جنگلی گائے وغیرہ یا پرندہ جیسے مرغ اور دیگر تمام پرندے

ظاہریہ اپنی اس رائے کے حق میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی اُن کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں کہ: "مجھے کچھ پروا نہیں خواہ میں مرغ کی قربانی دوں"۔

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے دو درہم کا گوشت خریدا اور فرمایا "یہ ابن عباس کی قربانی ہے۔"

ظاہر یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل ارشاد پاک کے ظاہر سے بھی احتجاج کرتے ہیں کہ:

جس نے جمعہ کے دن غسل کیا اور پھر (نماز کے لئے) پہلی گھڑی میں چل کھڑا ہوا وہ ایسا ہے جیسے اس نے ایک اونٹ کی قربانی دی اور جو دوسری گھڑی میں چلا وہ ایسا ہے جیسے اُس نے ایک گائے قربان کی۔ اور جو تیسری گھڑی میں چلا وہ ایسا ہے جیسے اس نے ایک مینڈھا قربان کیا اور جو چوتھی گھڑی میں چلا وہ ایسا ہے جیسے اُس نے ایک مرغی قربان کی اور جو پانچویں گھڑی میں چلا اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس نے ایک انڈے کی قربانی دی"[۱]

اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور قول ہے کہ:

"جمعہ کے لئے جانے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک اونٹ قربان کرے، پھر اس شخص کی سی جو ایک گائے قربان کرے، پھر اس شخص کی سی جو ایک بھیڑ قربان کرے، پھر اس شخص کی سی جو ایک مرغی قربان کرے، پھر اس شخص کی سی جو ایک چڑیا قربان کرے، پھر اس شخص کی سی جو ایک انڈے کی قربانی دے۔"

ظاہر یہ کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشادات اس امر کی جانب دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں قربانی کے طور پر مرغیوں اور چڑیوں کا ذبح کرنا جائز ہے۔[۲]

فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں بھی اختلاف رائے ہے کہ کون سے جانور کی قربانی دینا افضل ہے، اونٹ کی، گائے کی یا بھیڑ بکری کی؟

---

[۱] یہ حدیث ابن ماجہ کے سوا بقیہ محدثین نے نقل کی ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۲۷۰/۳

[۲] دیکھئے المحلی ۳۷۰/۷

چنانچہ مالکیہ کے نزدیک مینڈھے کی قربانی کرنا سب سے افضل ہے۔ اس کے بعد گائے کی اور پھر اونٹ کی، بخلاف ہدی کے (ہدی قربانی کا وہ جانور جو حرم پاک میں ذبح کیا جائے)۔

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک سب سے افضل قربانی اونٹ کی، پھر گائے کی، پھر بھیڑ بکری کی۔ امام اشہبؒ اور ابن شعبانؒ نے بھی یہی کہا ہے اور جمہور فقہا کی رائے بھی یہی ہے۔

اس مسئلے میں اختلاف کا سبب قیاس کا دلیل فعل سے معارض ہونا ہے۔ اس لئے کہ اس ضمن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول احادیث مروی ہیں وہ سب اس امر کی جانب دلالت کرتی ہیں کہ آپ نے ہمیشہ مینڈھوں کی قربانی دی۔ انہی احادیث میں سے ایک حدیث حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو املح (سفید اور سیاہ) مینڈھوں کی قربانی دی۔ اس سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ افضل قربانی مینڈھوں کی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا گوشت عمدہ ہوتا ہے [۱]

لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ چونکہ ہدایا میں بہترین ہدی اونٹ کی، پھر گائے کی، پھر بھیڑ بکری کی (لہذا قربانی کی افضلیت میں بھی یہی ترتیب ملحوظ رہنی چاہیئے)۔

علاوہ ازیں اس رائے کے حامل فقہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ: جو شخص (نماز جمعہ کے لئے) پہلی گھڑی میں روانہ ہوا وہ ایسا ہے جیسے اس نے ایک اونٹ کی قربانی دی، اور جو تیسری گھڑی میں روانہ ہوا وہ ایسا ہے جیسے اس نے ایک مینڈھے کی قربانی دی۔ اس کے علاوہ اونٹ اور گائے کی قربانی مینڈھے کی قربانی سے اس لئے بھی افضل ہے۔ کہ ان میں گوشت زیادہ نکلتا ہے۔

چنانچہ امام شافعی اور جمہور فقہا (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے مذکورہ بالا حدیث کے عموم کو تمام قربانیوں پر محمول کیا ہے، جب کہ امام مالکؒ نے اسے صرف ہدایا (قربانی کے وہ جانور جو حرم شریف میں ذبح کئے جائیں) پر محمول کیا ہے اور اس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل میں تطبیق دی ہے۔

جمہور فقہاء حدیث انسؓ کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس کا مقصد مینڈھے کی قربانی کا جواز ظاہر کرنا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اونٹ یا گائے میسر نہ ہوں۔ اور اللہ زیادہ

---

[۱] - دیکھئے شرح مسلم از امام نووی ۱۳/۱۱۸ - قوانین الاحکام الشرعیہ ۱۹۸ -

[۲] - دیکھئے المجموع ۸/۲۹۸ - المغنی ۸/۶۲۲

جاننے والے ہیں۔

اس مسئلے میں اختلاف کا ایک اور سبب ہے اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت اب تک باقی ہے یا وہ انہی کے زمانے تک محدود تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وترکنا علیہ فی الآخرین (الصافات: آیت ۱۰۸)

اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں

یاد رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مینڈھا ذبح فرمایا تھا۔

چنانچہ جن فقہاء کی یہ رائے ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت اب تک باقی ہے وہ آیت کریمہ مندرجہ بالا سے احتجاج کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مینڈھے کی قربانی افضل ہے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت اب باقی نہیں ہے وہ پہلے اونٹ، پھر گائے اور پھر بھیڑ بکری کی قربانی کو افضل خیال کرتے ہیں [1]

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اونٹ گائے سے افضل ہے اور گائے بکری سے اور ضأن (بھیڑ) افضل ہے معز (بکری) سے اور جذع بھیڑ افضل ہے ثنیہ بکری سے۔

ایک بھیڑ یا بکری کی قربانی دینا اس سے افضل ہے کہ اونٹ یا گائے میں سات حصوں کے ساتھ شرکت کی جائے۔

شافعیہ کے دو اقوال میں سے صحیح تر قول کے مطابق سات بھیڑ بکریوں کی قربانی دینا اس سے افضل ہے کہ ایک اونٹ یا گائے قربان کی جائے اس لئے کہ اس صورت میں خون زیادہ بہتا ہے۔ لیکن دوسری رائے کے مطابق ایک اونٹ یا گائے قربان کرنا سات بھیڑوں کی قربانی سے افضل ہے کیونکہ اس میں گوشت زیادہ نکلتا ہے [2]

امام مالک (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے نزدیک بھیڑ کی قربانی بکری کی قربانی سے افضل ہے۔ اسی طرح

---

[1] - دیکھئے بدایۃ المجتہد ۲۱۶/۱

[2] - دیکھئے المجموع ۲۹۸/۸

ہر صنف کے نرکی قربانی مادہ کی قربانی سے افضل ہے سانڈ جانور خصی سے بہتر ہے۔ لیکن ابن حبیب نے کہا ہے کہ فربہ اور تنومند خصی جانور مکزور سانڈ سے بہتر ہے

تمام فقہار کا اس امر پر اجماع ہے کہ ایسے جانور کی قربانی دینا مستحب ہے جو موٹا تازہ ہو اور جس کا گوشت عمدہ ہو۔

اس سلسلے میں فقہار کا اختلاف ہے کہ آیا ذبح کرنے سے پہلے جانور کو فربہ کرنا مستحب ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام شافعیؒ امام احمدؒ اور جمہور فقہار کی رائے ہے کہ ایسا کرنا مستحب ہے۔ لیکن بعض مالکیہ اسے مکروہ سمجھتے ہیں تاکہ یہودیوں سے تشبہ نہ ہو۔

امام نووی نے کہا ہے کہ یہ خیال باطل ہے [۱]

دوسری بحث

قربانی کے جانور کی صفات اور عمر

بلاشبہ قربانیاں اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کے حضور میں تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں لہٰذا یہ امر جائز نہیں کہ قربانی کا جانور عیب دار اور نقص والا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود پاک و طیب ہیں لہٰذا وہ صرف ایسی چیزیں قبول فرماتے ہیں جو پاک و طیب ہوں۔ جیسے زکوٰۃ اور صدقہ صرف پاکیزہ اور نفیس ترین مال سے نکالا جاتا ہے۔

اس امر پر فقہار کا اجماع ہے کہ ایسے جانور کی قربانی سے اجتناب کیا جائے جو لنگڑا ہو اور اس کا لنگڑا پن نمایاں ہو۔ (یا جو کانا ہو اور اس کا کانا پن نمایاں ہو یا جو مریض ہو اور اس کا مرض نمایاں ہو یا جو اتنا لاغر اور دبلا ہو کہ اس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔ اس لئے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایسے جانور کون سے ہیں جن

---

[۱] ۔ دیکھیے شرح مسلم از امام نووی ۱۳/۱۱۸ ۔ القرطبی ۱۵/ ۱۰۷ ۔

کی قربانی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ یہ سن کر آپؐ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرمایا: "چار قسم کے جانور ایسے ہیں جن کی قربانی نہیں کرنا چاہیئے (یہ حدیث سناتے ہوئے حضرت براءؓ اپنے ہاتھ سے اشارہ کر رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ میرے ہاتھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے چھوٹے ہیں" ایسا لنگڑا جانور جس کا لنگ نمایاں ہو، ایسا کانا جانور جس کا کانا پن نمایاں ہو، ایسا مریض جانور جس کا مرض نمایاں ہو، اور ایسا لاغر جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو"[1]

اسی طرح فقہاء کا اس امر پر بھی اجماع ہے کہ اگر کسی جانور میں ان چاروں عیبوں میں سے کوئی معمولی عیب ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن دو باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں فقہاء مختلف الرائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر کسی جانور کا عیب حدیث میں منصوص عیبوں سے بڑھ کر ہو تو اس کا کیا حکم ہے؛ جیسے وہ اندھا ہو یا اس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر کوئی جانور عیب میں مذکورہ بالا چار عیب دار جانوروں کے مساوی ہو تو اس کا کیا حکم ہے؛ جیسے اس کے کان، دم، داڑھ یا کسی اور عضو میں کوئی نقص ہو۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، اس مسئلے میں جمہور فقہاء، جن میں ائمہ اربعہ یعنی حضرت امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) شامل ہیں، کی رائے یہ ہے کہ جس جانور کا عیب مذکورہ بالا حدیث میں منصوص عیبوں سے بڑھ کر ہو تو وہ بدرجۂ اولیٰ ایسا ہے کہ اس کی قربانی نہ دی جائے۔

لیکن ظاہریہ کے نزدیک کسی جانور کا ایسا عیب جو مذکورہ عیبوں سے بڑھ کر ہو اس امر سے مانع نہیں کہ اس کی قربانی دی جائے۔ ظاہریہ اپنی اس رائے کی حمایت میں مذکورہ حدیث کے ظاہر سے استدلال کرتے ہیں۔

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے کہ کسی جانور کے تمام اعضاء میں منصوص عیب کے مساوی عیب ہو تو اس مسئلے میں فقہاء کے تین اقوال ہیں:

---

[1] - اس حدیث کو ابوداؤد، نسائی، احمد نیز امام بخاری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ اور حضرت البراء بن عازبؓ سے یہ حدیث بعض دوسری روایات کے ساتھ بھی نقل کی گئی ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۵/ ۱۲۳

پہلا یہ کہ ایسے جانور کا وہی حکم ہے جو حدیث میں منصوص عیب دار جانور کا حکم ہے۔ یہ مذہب حضرت امام مالکؒ کا ہے۔

دوسرا یہ کہ اس کی قربانی دینا جائز ہے، لیکن افضل یہ ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔ یہ قول ابن القصار اور امام مالکؒ کے اصحاب میں سے ابن الجلاب کا ہے۔

تیسرا قول ظاہریہ کا ہے جس کے مطابق اس میں کوئی حرج نہیں (کہ ایسے جانور کی قربانی دی جائے)

اس مسئلے میں اختلاف کا سبب حدیث سابق کا مفہوم سمجھنے میں اختلاف ہے۔ چنانچہ جن فقہاء نے حدیث کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ دیگر اعضاء کا عیب منصوص عیب کے مانند ہے، انہوں نے ایسے جانور کی قربانی کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اور جن لوگوں نے حدیث کے ظاہر کو لیا ہے انہوں نے عیب دار جانوروں کے دیگر اعضاء میں پائے جانے والے ایسے عیوب کو اہمیت نہیں دی جن کا حدیث پاک میں ذکر نہیں

اسی طرح اس مسئلے میں اختلاف کا ایک اور سبب وہ دو متعارض حدیثیں ہیں جو اس ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔

پہلی حدیث حضرت ابو بردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں دانت کے عیب کو ناپسند کرتا ہوں۔ یہ سن کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جسے تم ناپسند کرتے ہو اُسے چھوڑ دو، لیکن دوسروں پر اُسے حرام نہ کرو۔"[1]

دوسری حدیث حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ: "ہمیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم آنکھ اور کان کا خیال رکھیں اور ایسے جانور کی قربانی نہ دیں جس کا کان سامنے سے کٹا ہوا ہو یا ایک طرف سے کٹا ہوا ہو، یا جس کا کان لمبائی کے رخ پھٹا ہوا ہو یا جس کے کان میں گول سوراخ ہو۔"[2]

---

[1] ۔ یہ حدیث امام ابو داؤدؒ نے روایت کی ہے دیکھئے عون المعبود ۷/ ۵۰۶

[2] ۔ یہ حدیث صحاح کی پانچ کتابوں میں نقل کی گئی ہے اور امام ترمذی نے اسے صحیح بتایا ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۵/ ۱۳۵۔ وعون المعبود ۷/ ۵۰۸

چنانچہ جو فقہاء ترجیح کی طرف گئے ہیں انہوں نے حضرت ابو بردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی حدیث کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ مذکورہ چار عیبوں یا ان سے بڑے کسی عیب کے سوا کوئی عیب ایسا نہیں جس کی بناء پر عیب دار جانور کی قربانی دینا جائز نہ ہو۔

اور جن فقہاء نے دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق دی ہے، اس طرح کہ حدیث ابو بردہؓ میں مذکور رخصت کو ایسے عیب پر محمول کیا ہے جو معمولی اور غیر نمایاں ہو، اور حدیث علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) میں وارد ممانعت کو ایسے عیب پر محمول کیا ہے جو بڑا ہو، انہوں نے جانور کے دیگر اعضاء میں پائے جانے والے عیوب کو حدیث میں منصوص چار عیبوں کے مساوی قرار دیا ہے [۱]

جمہور فقہاء، جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں، اس امر پر متفق ہیں کہ اگر کسی جانور کا پورا کان یا اس کا اکثر حصہ کٹا ہوا ہو تو یہ ایسا عیب ہے جس کی بناء پر اس کی قربانی دینا جائز نہیں۔

لیکن اگر کسی جانور کا سینگ ٹوٹا ہوا ہو تو اس کے متعلق فقہاء مختلف الرائے ہیں۔ چنانچہ حضرت امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک یہ عیب ہے اور حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے میں اگر ٹوٹے ہوئے سینگ سے خون بہہ رہا ہو تو یہ عیب ہے ورنہ نہیں۔

حنفیہ اور شافعیہ اسے عیب شمار نہیں کرتے۔

فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ اجم یعنی ایسے جانور کی قربانی دینا جائز ہے جس کے سینگ نکلے ہی نہ ہوں [۲]

اس امر میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں کہ خصی جانور کی قربانی دینا جائز ہے اس لئے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو خصی مینڈھوں کی قربانی دی۔ لیکن ایسے جانور کے متعلق وہ مختلف الرائے ہیں جو بغیر کانوں کے پیدا ہوا ہو۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی قربانی ادا نہ ہوگی، لیکن حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی جانور پیدا ہی کانوں کے بغیر ہوا ہو تو اس کی قربانی صحیح ہوگی۔

---

[۱] ۔ دیکھئے بدایۃ المجتہد ۱/۴۱۷ - ۴۱۸ - نیل الاوطار ۵/۱۲۲

[۲] ۔ دیکھئے المغنی ۸/۶۲۴ - بدایۃ المجتہد ۱/۴۱۹ - شرح مسلم از نووی ۱۲۰/۱۳

ایسے جانور کی ممانعت پر بھی فقہاء کا اتفاق ہے جو خارش زدہ ہو اور اس مسئلے میں بھی اُن کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں کہ پاگل جانور کی قربانی دینا صحیح نہیں۔

اگر بھیڑیئے نے کسی جانور کی ران سے اتنا گوشت کاٹ لیا ہو جو دکھائی دیتا ہو یا اس کا تھن یا دُم کاٹ لی ہو تو اس کی قربانی ادا نہ ہوگی۔ یہ رائے جمہور فقہاء کی ہے۔[1]

جہاں تک جانوروں کے دانتوں کا تعلق ہے تو اس مسئلے میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ جذع یعنی کم عمر بکری یا بھیڑ یا گائے کی قربانی جائز نہیں۔ لیکن جو جانور ثنیہ یا اس سے زیادہ عمر کا ہو اس کی قربانی جائز ہے اس لئے کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بردہؓ سے فرمایا تھا کہ: "تیرے لئے (ایسے جانور کی قربانی کرنا) کافی ہے، تیرے سوا کسی اور کے لئے نہیں"۔[2]

لیکن جذع دینے کے بارے میں اختلافِ رائے ہے۔ چنانچہ جمہور فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور امام زہریؒ کا قول ہے کہ جذع دنبے کی قربانی صحیح نہیں۔

اس مسئلے میں اختلافِ رائے کا سبب وہ احادیث ہیں جو اس ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ حضرت مجاشع بن سلیم سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ: "(جانوروں کی جس صنف کا) ثنی (دو سال عمر کا جانور) کافی ہے اس کا جذع (ایک سال یا چھ ماہ کی عمر کا جانور بھی) کافی ہے"۔[3]

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بردہؓ سے جو کچھ فرمایا وہ یہ ہے کہ:

<u>"تیرے لئے جذع یعنی چھ ماہ کے جانور کی قربانی دینا کافی ہے لیکن تیرے بعد کسی اور کے لئے نہیں"۔</u>

---

[1] ۔ دیکھئے المجموع ۸/ ۳۰۰

[2] ۔ متفق علیہ دیکھئے نیل الاوطار ۵/ ۱۲۸۔ امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/ ۱۱۴

[3] ۔ ابوداؤد اور نسائی دیکھئے عون المعبود ۷/ ۵۰۳

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک جذع دُنبہ اور بکرا وہ جانور کہلاتا ہے جس کی عمر چھ مہینے ہو۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

لیکن امام شافعیؒ کے مذہب کی رُو سے صحیح یہ ہے کہ اُس کی عمر پورے ایک سال کی ہو اور ثنی دُنبہ اور بکرے سے مراد ایسا جانور ہے جس کی عمر دو سال ہو۔ یہ مذہب امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جذع بھیڑ یا بکری وہ ہے جس کی عمر چھ ماہ ہو۔

امام احمدؒ کے نزدیک اس سے مراد ایسا جانور ہے جو دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔

جذع (نوجوان) بیل سے مراد ایسا بیل ہے جس کی عمر دو سال ہو۔ اور ثنی وہ جو تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ یہ مذہب حضرت امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا ہے [1]

لیکن حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جذع بیل وہ ہے جو ایک سال کا ہو اور ثنی وہ جو دو سال کا ہو۔

امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جذع اونٹ وہ ہے جو پانچ سال کا ہو اور ثنی وہ جو دو سال کا ہو۔

امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جذع اونٹ وہ ہے جو پانچ سال کا ہو اور ثنی وہ جس کی عمر چھ سال ہو چکی ہو۔

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک ثنی اونٹ وہ ہے جو اپنی عمر کے پانچ سال پورے کر کے چھٹے میں داخل ہو چکا ہو۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جذع اونٹ وہ ہے جو چار سال کا ہو اور ثنی وہ جو پانچ سال کا ہو۔ اس امر پر اُن کا اتفاق ہے کہ اگر اس سے کم عمر کے جانور کی قربانی کی گئی تو وہ

---

[1] ۔ دیکھئے المجموع ۲۹۳/۸ ۔ المغنی ۲۶۲/۸ ۔ بدائع الصنائع ۲۸۳۴/۶

صحیح نہ ہوگی۔ لیکن جو جانور عمر میں ان سے بڑا ہو اس کی قربانی کرنا افضل اور احسن ہے۔[۱]

تیسری بحث

قربانی کی تعداد

جمہور فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بھیڑ یا بکری کی قربانی صرف ایک فرد کی جانب سے دی جا سکتی ہے اور گائے یا اونٹ میں سات افراد مساوی حصوں کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں۔ اس کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اونٹ اور گائے میں شرکت کریں کل سات آدمی ایک بدنہ (اونٹ یا گائے) میں اور ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک گائے کی قربانی سات آدمیوں کی طرف سے صحیح ہے۔[۲]

امام شافعی، امام مالک اور امام احمد (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک اگر کوئی آدمی اپنی، اپنے گھر والوں اور اُن لوگوں کی جانب سے ایک بکری ذبح کرے جن کا نفقہ اس کے ذمہ ہو تو وہ کافی ہے۔ امام اوزاعیؒ، لیث اور اسحاقؒ نے یہی کہا ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرۃ (رضی اللہ عنہما) سے بھی یہی مروی ہے۔

لیکن حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ وہ اپنے گھر کے ہر فرد کی جانب سے ایک بکری یا بھیڑ ذبح کرے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اس حدیث کا کہ آپؐ نے دو املح مینڈھوں کی قربانی دی، ایک اپنی جانب سے اور ایک اپنی اُمت کی جانب سے احناف یہ جواب دیتے ہیں کہ آپؐ نے ایسا ثواب کے لئے کیا تھا اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ آپؐ اپنی اُمت کو قربانی دینے سے سبکدوش کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ ان تمام مسائل کے لئے دیکھئے بدائع الصنائع ۲۸۳/۶ - المجموع ۲۹۳/۸

۲۔ متفق علیہ۔ دیکھئے نیل الاوطار ۱۱۵/۵

جو فقہاء یہ رائے رکھتے ہیں کہ تمام گھر والوں کی جانب سے ایک قربانی دینا کافی ہے ان کی دلیل عطاء بن یاسر سے مروی یہ حدیث ہے کہ میں نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قربانیاں کیسے کی جاتی تھیں تو انہوں نے جواب دیا کہ حضورؐ کے عہد میں آدمی اپنی اور اپنے اہل خاندان کی جانب سے ایک بکری کی قربانی دیتا تھا اور اس میں سے وہ اور اس کے گھر والے خود بھی کھاتے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے، یہاں تک کہ لوگوں نے اسے فخر و مباہات کا ذریعہ بنا لیا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو[1]

ان کی دوسری دلیل امام شعبیؒ سے مروی وہ حدیث ہے جو انہوں نے ابو سریحہ کے حوالے سے نقل کی ہے۔ ابو سریحہ فرماتے ہیں "میرے یہ جان لینے کے بعد کہ سنت کیا ہے، میرے گھر والوں نے مجھے زیادتی کرنے پر ابھارا، (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے) اہل بیت ایک یا دو بھیڑوں کی قربانی کرتے تھے، اور آج ہمارے پڑوسی ہمیں بخیل قرار دیتے ہیں"[2]

امام ہادی اور قاسم نے کہا ہے کہ ایک بھیڑ صرف تین افراد کی طرف سے کافی ہے اور ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا: "محمدؐ کی طرف سے اور آل محمدؐ کی طرف سے"

اس امر پر فقہا کا اتفاق ہے کہ دنبے میں شرکت کرنا جائز نہیں اسی طرح فقہاء اس مسئلے میں بھی متفق الرائے ہیں کہ انفرادی طور پر ایک بکری کی قربانی دینا اس سے افضل ہے کہ اونٹ یا گائے میں شرکت کی جائے۔

اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے کہ اگر کسی اونٹ یا گائے میں بعض لوگ اس خیال سے شریک ہوں کہ گوشت حاصل کیا جائے اور بعض لوگوں کی نیت قربانی دینے کی ہو تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؛ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایسی شرکت جائز نہیں کیونکہ اس میں نیتوں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

---

[1] ۔ اس حدیث کو ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح بتایا ہے۔ دیکھئے ابن ماجہ ۲/۱۰۵۱

[2] ۔ یہ حدیث ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔ دیکھئے ۲/۱۰۵۲۔ اس کی اسناد صحیح اور رجال قابل اعتبار ہیں۔

لیکن امام شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے اور ان کی دلیل سابق الذکر حدیث ہے۔

امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ قربانی اور ہدی واجب میں ایسا اشتراک کرنا جائز نہیں، البتہ ہدی تطوع (نفلی ہدی) میں کیا جاسکتا ہے۔

جمہور فقہاء کی دلیل حضرت جابرؓ کی وہ حدیث ہے جو پہلے مذکور ہوئی، انہوں نے قربانی کو ہدی پر قیاس کیا ہے۔

لیکن امام مالکؒ نے ایک تو مذکورہ حدیث کو معلول قرار دیا ہے اور دوسرے کہا ہے کہ محصر (جسے حج کی ادائیگی سے روک دیا گیا ہو) کی جانب سے بھیجی جانے والی ہدی سنت ہے نہ کہ واجب اور ان کے نزدیک اشتراک ہدیِ مسنون میں جائز ہے نہ کہ ہدیِ واجب میں[1]

چوتھی بحث

قربانی کے گوشت، کھال اور بالوں کے احکام

اس امر پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ قربانی کا جانور ذبح کرکے اس کا گوشت صدقہ کرنا اس سے بہتر ہے کہ اس کی قیمت صدقہ کی جائے۔ اس لئے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے جانور ذبح فرمائے اور آپؐ کوئی ایسا کام نہ کرتے تھے جو ادنیٰ درجے کا ہو، بلکہ صرف اعلیٰ وارفع کام کرتے تھے۔ اور اس لئے بھی کہ قربانی کرنا دینی شعار ہے۔ علاوہ ازیں صدقہ کے برخلاف قربانی کے واجب ہونے میں اختلاف رائے ہے۔ یہ مذہب امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا ہے۔ لیکن امام نوویؒ نے حضرت امام مالکؒ، شعبیؒ اور ابوثورؒ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے نزدیک قربانی کی قیمت صدقہ کردینا جانور ذبح کرنے سے افضل ہے۔

---

[1] ان تمام مسائل کی تفصیل کے لیے دیکھئے نیل الاوطار ۵/۱۲۶- بدائع الصنائع ۶/۲۸۲۵- المجموع ۸/۲۸۲

بدایۃ المجتہد ۱/۴۲۸- المغنی ۸/۶۴۳- حاشیۃ الدسوقی علی شرح الکبیر ۲/۱۱۹۔

اسی طرح اس امر پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ ارشادِ باری عزاسمہ' :

فکلوا منها واطعموا البآئس الفقیر (الحج: آیت ۲۸)

(سو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ برے حال کے محتاج کو)

اور

واطعموا القانع والمعتر (الحج: آیت ۳۶)

(اور کھلاؤ صبر سے بیٹھے کو اور بیقراری کرتے کو)

کے مطابق قربانی دینے والے کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اپنی قربانی میں سے کھائے بھی اور صدقہ بھی کرے۔ بعض فقہاء نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ پورے گوشت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایک حصہ کھانے کے لئے، ایک حصہ ہدیتہً دینے کے لئے اور ایک حصہ صدقہ کرنے کے لئے مخصوص کیا جائے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کے بارے میں حضرت ابن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ آپؐ "ایک تہائی اپنے اہل بیت کو کھلاتے، ایک تہائی اپنے غریب پڑوسیوں کو کھلاتے اور ایک تہائی سوال کرنے والوں کو صدقہ دے دیتے"[1] امام احمدؒ کا مذہب اور امام شافعیؒ کے دو اقوال میں سے ایک یہی ہے۔

احنافؒ کہتے ہیں کہ جتنا زیادہ صدقہ دیا جائے اتنا بہتر ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ:

فکلوا منها واطعموا البآئس الفقیر (الحج: آیت ۲۸)

(سو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ برے حال کے محتاج کو)

کے مطابق پورا گوشت دو حصوں میں تقسیم کیا جائے: ایک حصہ کھانے کے لئے اور ایک حصہ صدقہ کرنے کے لئے۔[2]

امام نووی فرماتے ہیں کہ امام الحسن نے کہا ہے: "قانع وہ ہے جو تم سے سوال کرے اور معتر وہ جو سامنے آئے لیکن سوال نہ کرے"۔

---

[1] - یہ روایت الحافظ ابو موسیٰ الاصفہانی نے الوظائف میں نقل کی ہے۔ دیکھئے المغنی ۸/ ۶۳۲

نیز امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/ ۱۳۱

[2] - دیکھئے المغنی ۸/ ۶۳۲

مجاہد نے کہا ہے کہ قانع وہ ہے جو (قناعت کے ساتھ) اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور معتر وہ جو تم سے سوال کرے۔[1]

اس امر میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ کیا قربانی کرنے والے کے لئے یہ بات جائز ہے کہ وہ خود کھائے اور صدقہ نہ کرے یا صدقہ کرے اور خود کچھ نہ کھائے؟

جہاں تک امام مالکؒ کا تعلق ہے، انہوں نے اس امر سے روکا ہے اور کہا ہے کہ قربانی کرنے والے کے لئے یہ امر جائز نہیں کہ وہ سارا گوشت کھالے اور کچھ صدقہ نہ کرے، یا سارا گوشت صدقہ کر دے اور خود کچھ نہ کھائے۔

لیکن امام ابوحنیفہ اور شافعی (رضوان اللہ علیہما) نے اس کی اجازت دی ہے۔

حنابلہ کے نزدیک اگر کوئی شخص ایک تھوڑے حصے کے سوا، جسے وہ صدقہ کر دے، باقی سارا گوشت کھالے تو یہ امر جائز ہے۔ اسی طرح اس کے لئے یہ امر بھی جائز ہے کہ بغیر کچھ کھائے پورا گوشت صدقہ کر دے ان کی دلیل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے کہ آپؐ نے پانچ قربانی کے جانور (اونٹ یا گائے) نحر فرمائے اور ان میں سے خود کچھ نہیں کھایا۔ اس کے علاوہ قربانی دینا اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا ہے لہذا اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ اس کا پورا گوشت صدقہ کر دیا جائے۔ (آیت کریمہ میں) جو حکم ہے وہ استحباب کے لئے ہے نہ کہ وجوب کے لئے۔

یہ امر بھی جائز ہے کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زائد عرصے تک ذخیرے کر کے نہ رکھا جائے یہ قول عام اہل علم کا ہے جس کی بنیاد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل ارشاد پاک پر ہے:

"میں تمہیں قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ ذخیرہ کر کے رکھنے سے منع کرتا تھا، لیکن رکھو جو تمہیں مناسب معلوم ہو"۔[2]

لیکن حضرت علیؓ اور ابن عمرؓ نے اس سے منع کیا ہے ان کے استدلال کی بنیاد یہ حدیث ہے۔

---

[1] - دیکھئے المجموع ۸/۴۱۳

[2] - یہ حدیث امام مسلمؒ نے روایت کی ہے۔ دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۱۲۵

کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے: "قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ ذخیرہ کر کے رکھنے سے منع فرمایا ہے" [۱]

بعض فقہاء نے اس امر کو مستحب قرار دیا ہے کہ قربانی کا گوشت تین حصوں میں تقسیم کیا جائے: ایک تہائی ذخیرہ کر کے رکھنے کے لئے، ایک تہائی صدقہ کرنے کے لئے اور ایک تہائی کھانے کے لئے جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بس کھاؤ اور صدقہ دو اور ذخیرہ کرو۔" [۲]

اس امر پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ قربانی کے گوشت یا چربی وغیرہ میں سے کسی چیز کا فروخت کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ نذر مانی ہوئی قربانی کا گوشت کھانا قربانی دینے والے کے لئے جائز نہیں۔

یہ مسئلہ بھی فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے کہ قربانی اسی شہر میں دی جانی چاہیئے جہاں قربانی دینے والا مقیم ہو، اور اس کا گوشت ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرنے میں ایسا ہی اختلاف ہے جیسا زکوٰۃ کے منتقل کرنے میں ہے۔

قربانی کی کھال، بال، اعضاء، رسی، دودھ اور اسی طرح کی دوسری چیزیں، جن سے استفادہ کیا جاتا ہے، ان کے بارے میں فقہاء کا اختلاف رائے ہے، چنانچہ جمہور کے نزدیک ان میں سے کسی چیز کا فروخت کرنا جائز نہیں۔ امام شافعیؒ، مالکؒ اور احمد (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی یہی رائے ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ روپے پیسے کے بغیر یعنی اشیائے ضرورت کے عوض ان کا فروخت کرنا جائز ہے۔

امام عطاءؒ کی رائے ہے کہ انہیں کسی بھی چیز کے عوض فروخت کیا جا سکتا ہے۔

حق یہ ہے کہ اس ضمن میں ان واضح دلائل کی بنیاد پر جو پیش کیے جاتے ہیں جمہور کا قول اولیٰ و اسلم ہے۔

---

[۱] ۔ اس کے لئے دیکھئے المغنی ۸/۶۳۲ ۔ بدائع الصنائع ۶/۲۸۶۰ ۔ المجموع ۸/۴۱۳

[۲] ۔ صحیح مسلم دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۱۳۱

اس ممانعت کی حکمت ۔ اللہ زیادہ جاننے والے ہیں ۔ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں سے نادار اور اہلِ حاجت لوگ مستفید ہوں ۔

اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ قربانی کرنے والا ان تمام چیزوں کو اپنے گھر میں زیرِ استعمال لا سکتا ہے یا صدقہ کر سکتا ہے ۔

اس مسئلے میں بھی فقہاء متفق الرائے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "اس (قربانی کے جانور) کی جھول اور نکیل کو صدقہ کر دو اور قصائی کی اجرت اس میں سے نہ دو" کے پیشِ نظر ان میں سے کسی چیز کا بطورِ اُجرت قصاب کو دیا جانا جائز نہیں [۱] ہاں ہدیۃً دیا جا سکتا ہے ۔

اگر کوئی شخص قربانی کا جانور چھوڑ کر مر جائے اور اس پر قرض ہو تو جانور کو فروخت نہیں کیا جائے گا یا وہ اس کے وارثوں کے لئے ہے ۔ یہ امام احمدؒ اور شافعیؒ کا مذہب ہے ۔

امام اوزاعیؒ نے کہا ہے کہ اگر میت قرض دار ہو اور اس کی ادائیگی کی کوئی اور صورت نہ ہو تو قربانی کا جانور فروخت کر دیا جائے گا ۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر ورثاء جھگڑا کریں تو اُسے فروخت کر دیا جائے گا ۔

جو فقہاء ایسے جانور کی فروخت کو ممنوع سمجھتے ہیں اُن کی دلیل یہ ہے کہ (اس معاملے میں) میت زندہ کی مانند ہے، اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ اُسے بیچے بلکہ اسے کھائے اور اس سے استفادہ کرے ۔ اور ورثاء اپنے مورث کے قائمقام ہوتے ہیں ۔

قربانی دینے والے کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنا جانور اس سے بہتر کسی جانور سے بدل لے ۔ یہ مذہب امام احمد، ابوحنیفہ، مالک، عطاء، مجاہد، عکرمہ اور محمد بن الحسن (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا ہے ۔

ابو الخطاب نے کسی اور جانور سے تبدیلی کے عدمِ جواز کو اختیار کیا ہے ۔

جن فقہاء نے قربانی کا جانور تبدیل کر لینے کو جائز قرار دیا ہے ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ:

---

[۱] ۔ متفق علیہ ۔ دیکھئے نیل الاوطار ۵/۱۴۶ ۔ المغنی ۸/ ۶۲۱ المجموع ۸/۳۲۵ ۔ کفایۃ الاخیار ۲/۲۴ بدائع الصنائع ۶/ ۲۸۶۱ بدایۃ المجتہد ۱/۴۲۴ ۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حج میں سو بدنہ (اونٹ) لے گئے، اور یمن سے حضرت علیؓ تشریف لے آئے تو انہیں اُن میں شریک کیا۔[1]

ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ قربانی کے جانور کی یہ تبدیلی بہتر کی جانب تبدیلی ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص پر زکوٰۃ میں تین سالہ اونٹنی دینا لازم ہو اور وہ چار سالہ اونٹنی دے دے۔[2]

اس مسئلے میں فقہاء کا اجماع ہے کہ قربانی کا گوشت مسلمان مسکینوں کو کھلایا جا سکتا ہے، لیکن اہل الذمہ کو کھلائے جانے پر اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ، احمد، حسن بصری اور ابوثور رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ لیکن امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ: "اُن اہل الذمہ کے سوا دوسرے لوگ ہمیں زیادہ محبوب ہیں"۔

امام نوویؒ نے کہا ہے، "مذہب شافعیہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اہل ذمہ کو نفلی (تطوع) قربانی کا گوشت کھلانا جائز ہو، نہ کہ واجب کا"۔ اللہ زیادہ جاننے والے ہیں۔

حق یہ ہے کہ ایسا کوئی امر مانع موجود نہیں جس کی رُو سے ذمی فقراء کو قربانی کا گوشت کھلانا ممنوع ہو۔ اس کے مسئلے پر انسانی نقطۂ نظر سے غور کیا جانا چاہیے نہ کہ دینی پہلو سے۔ علاوہ ازیں صدقہ اور قربانی کے گوشت میں کوئی فرق نہیں اور ذمیوں کو صدقہ دینا باتفاق جائز ہے۔

اس مسئلے میں علماء کا اختلاف ہے کہ اگر قربانی کا جانور بچہ دے دے تو اس کا کیا حکم ہے؟

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اُس بچے کا وہی حکم ہے جو اس کی ماں کا ہے کیونکہ وہ اس کے تابع ہے۔ خواہ حمل اس وقت سے ہو جب اسے قربانی کا جانور قرار دیا گیا، یا بعد میں ہوا ہو۔ اُس بچے کو ذبح کیا جائے گا اور اس کے گوشت کا وہی حکم ہو گا جو اُس کی ماں کے گوشت کا حکم ہے۔ اور اُسے یوم نحر سے پہلے ذبح کرنا جائز نہ ہو گا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے ایک شخص نے سوال کیا: "یا امیر المومنین! میں نے یہ گائے قربانی دینے کے لئے خریدی تھی لیکن اس نے یہ بچھڑا دیا ہے!" یہ سن کر حضرت

---

[1] صحیح مسلم۔ دیکھئے نیل الاوطار ۱۱۴/۵

[2] دیکھئے المغنی ۶۳۶/۸۔

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "اس گائے کا دودھ مت دوہو الّا یہ کہ وہ اس کے بچھڑے کی ضرورت سے زیادہ ہو۔ پھر جب قربانی کا دن آجائے تو اسے اور اس کے بچے کو سات آدمیوں کی طرف سے ذبح کرو"۔ ۱

حنفیہ کے نزدیک بچے کو ماں کے ساتھ ذبح کیا جائے گا اور اس کا گوشت (یعنی بچہ کا) صدقہ کر دیا جائے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس بچے کو زندہ فروخت کر کے اس کی قیمت صدقہ کر دی جائے گی۔ ۲

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اس امر میں کوئی حرج نہیں کہ قربانی کے اس جانور کا دودھ پیا جائے لیکن وہ جو اس کے بچے کی ضرورت سے بچ رہے اور بہتر یہ ہے کہ اس دودھ کو صدقہ کر دیا جائے۔ اور اگر دودھ دوہنے سے جانور کے گوشت میں کمی آتی ہو تو اسے اس کا کوئی حق نہیں کہ اس کا دودھ پیئے۔

احناف کی رائے میں مالک کے لئے یہ امر جائز نہیں کہ وہ اس کا دودھ پیئے اگر اس نے اس کا دودھ دوہا تو اسے چاہیئے کہ فقراء اور مساکین پر صدقہ کر دے۔ ۳

اس مسئلے میں شافعیہ اور حنابلہ مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کرتے ہیں:

اولاً یہ کہ جانور کا دودھ اس کی غذا اور گھاس چارے وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے جس کا اہتمام مالک کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کا دودھ پیئے۔ جیسے مرتہن مرہونہ جانور کے دودھ اور سواری سے استفادہ کرتا ہے کیونکہ اس کے گھاس چارے اور غذا کا بندوبست وہی کرتا ہے۔

دوسرے اون اور بال دونوں ایسی چیزیں ہیں جن سے ہمیشہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے چنانچہ ان کا حکم وہی ہے جو کھال کا حکم ہے۔ بخلاف دودھ کے کہ وہ پیا جاتا ہے اور اس سے فائدہ تھوڑا تھوڑا کر کے اٹھایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ دودھ ہر روز نیا بنتا ہے۔

لیکن بال، اون اور کھال ایسی چیزیں ہیں جو پورے سال میں ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔

۱۔ یہ حدیث سعید بن منصور نے روایت کی ہے۔ دیکھئے المغنی ۸/۶۳۶

۲۔ دیکھئے بدائع الصنائع ۶/۲۰۵۵۔ حاشیہ ابن عابدین ۶/۳۲۳

۳۔ دیکھئے بدائع الصنائع ۶/۲۰۵۳۔ حاشیہ ابن عابدین ۶/۳۲۹

جہاں تک ناخنوں اور بالوں کا تعلق ہے اُن کے بارے میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ بہتر کیا ہے۔ اگر اُن کا کتروانا اچھا ہو تو کتروانا اولیٰ ہے۔ انہیں کتروا کر صدقہ کر دینا چاہیئے۔ اگر نہ کتروانا اچھا ہو تو نہ کتروانا اولیٰ ہے[1]

---

[1] - دیکھئے المغنی ۶۲۹/۸

تیسری فصل

قربانی کا وقت

اس امر پر فقہاء کا اجماع ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنا جانور عید کے دن نمازِ فجر سے پہلے ذبح کیا تو اس کی قربانی جائز نہ ہوگی۔ اسی طرح اس مسئلے میں بھی ان کا اجماع ہے کہ جو شخص اپنا جانور امام وقت کے نمازِ عید ادا کر لینے کے بعد ذبح کرے گا اس کا ذبیحہ مقبول ہوگا۔

اس شخص کے بارے میں فقہاء مختلف الرائے ہیں جس نے اپنا جانور نماز عید اور امام کے ذبح کرنے سے پہلے ذبح کیا۔

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک قربانی کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب امام وقت اپنا جانور ذبح کر چکے، لہٰذا اگر کسی نے امام کے ذبح کرنے سے قبل اپنا جانور ذبح کیا تو اسے دوسرا جانور ذبح کرنا پڑیگا[1]

شہروں کی نسبت امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ وہاں قربانی کا وقت اُس وقت شروع ہوتا ہے جب امام نمازِ عید ادا کر چکے، لیکن گاؤں اور قریات کی نسبت اُن کی رائے ہے کہ وہاں قربانی کا وقت ایام نحر کے پہلے دن فجرِ ثانی کے طلوع کے وقت شروع ہوتا ہے[2]

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ذبح کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب سورج طلوع ہو جائے اور اتنا وقت گزر جائے جس میں نماز عید اور دونوں خطبے پڑھے جا سکتے ہوں۔ چنانچہ اگر اتنا وقت گزرنے کے بعد ذبح کیا تو صحیح ہے، خواہ امام نے نماز پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو، اور خواہ نماز عید پڑھی گئی ہو یا نہ پڑھی گئی ہو۔ اس مسئلے میں دیہات کے رہنے والے اور شہروں کے رہنے والے سب برابر ہیں۔ اور خواہ

---

[1] ۔ امام سے مراد وہ امام ہے جو عید کی نماز پڑھائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد خلیفہ ہے۔ دیکھئے الشرح الصغیر ۹۹/۱

[2] ۔ دیکھئے حاشیہ ابن عابدین ۳۱۸/۶ ۔

امام نے اپنی قربانی ذبح کی ہو یا نہ کی ہو۔ اور خواہ قربانی دینے والا مسافر ہو یا مقیم ہو۔ یہ قول امام داؤد اور ابن المنذر کا ہے۔[1]

امام احمدؒ نے کہا ہے کہ امام کی نماز سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کرنا جائز نہیں، البتہ بعد میں کیا جا سکتا ہے، خواہ امام نے اپنی قربانی ذبح کی ہو یا نہ کی ہو، اور خواہ قربانی دینے والا دیہات میں رہتا ہو یا شہر میں۔

امام احمدؒ کے مذہب کا مختار قول یہ ہے کہ قربانی کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب قربانی کا دن اتنا گزر جائے جس میں نماز عید ادا کی جا سکتی ہو اور خطبہ پڑھا جا سکتا ہو۔ الخرقی کے کلام کا ظاہر یہی ہے اور ابن القیمؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[2]

اس مسئلے میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ حضرت ابو بردہؓ سے مروی ایک حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنا جانور نماز سے پہلے ذبح کر لیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے قربانی لوٹانے یعنی دوسرا جانور ذبح کرنے کا حکم دیا۔[3]

اور بعض روایات میں آیا ہے کہ اُس نے اپنا جانور حضورؐ سے پہلے ذبح کر لیا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ: "حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اپنا جانور نماز سے پہلے ذبح کر لیا ہے اُسے چاہیئے کہ (اپنی قربانی) لوٹائے (یعنی دوسرا جانور ذبح کرے"۔[4]

چنانچہ امام مالکؒ نے دوسری روایت کو اس کے ظاہر پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ امام کے ذبح کرنے سے قبل اپنا جانور ذبح کرنا جائز نہیں۔

---

[1] ۔ دیکھئے شرح مسلم ۱۳/۱۱۰

[2] دیکھئے المغنی ۸/۶۳۶ ۔ زاد المعاد ۱/۲۹۵

[3] ۔ یہ حدیث امام مسلم نے روایت کی ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے۔ دیکھئے صحیح مسلم کی شرح از امام نووی ۱۳/۱۱۲

[4] ۔ متفق علیہ دیکھئے صحیح مسلم کی شرح از امام نووی ۱۳/۱۱۲

لیکن امام ابوحنیفہؒ نے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے اور وہ اس طرح کہ دوسری حدیث میں جو آیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اپنا جانور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یعنی نماز سے پہلے ذبح کیا، اسی وجہ سے آپؐ نے اسے قربانی لوٹانے کا حکم دیا۔ اسی کی شہادت حدیث انسؓ سے ملتی ہے[1]

اس مسئلہ میں زیادہ صحیح قول حضرت امام شافعیؒ کا ہے کیونکہ انہوں نے معنی پر نظر رکھی ہے اور الفاظ کا اعتبار نہیں کیا۔ یعنی یہ کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے نہ امام کا ذبح کرنا جائز ہے، نہ نماز کا پڑھنا لہٰذا اس وقت عام مسلمانوں کے لئے بھی یہ امر جائز نہیں کہ وہ اپنا قربانی کا جانور ذبح کریں لیکن جب سورج نکل آئے اور اتنا وقت گزر جائے جس میں نماز اور دونوں خطبے پڑھے جا سکیں تو اس وقت ذبح کرنا جائز ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس وقت فقراء اور مساکین کے لئے گوشت کا حصول اور اس سے استفادہ کرنا ممکن ہو جائے کیونکہ اس سے پہلے تو وہ لوگ سوئے رہتے ہیں یا نماز میں مشغول ہوتے ہیں۔

درحقیقت صحیح سوچ اور درست فکر کا تقاضا یہی ہے کہ لوگوں کی قربانی کو امام کی نماز یا اس کے ذبح کرنے کے ساتھ مقید نہ کیا جائے۔ اسلام میں جو آسانی اور وسعت پائی جاتی ہے اس سے بھی یہی رائے مطابقت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ چیز خود اپنی جگہ بڑی مشکل کا سبب بنے گی کہ لوگوں کو امام کے دیکھنے اور نماز کا پابند کیا جائے کہ آیا اس نے نماز پڑھی یا نہیں پڑھی یا اپنا جانور ذبح کیا یا نہیں کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وما جعل علیکم فی الدّین من حرج (الحج: آیت ۷۸)

(اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل)

جہاں تک ذبح کرنے کے آخری وقت کا تعلق ہے اس میں بھی فقہاء مختلف الرائے ہیں۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی رائے ہے کہ قربانی کے جانور ذبح کرنے کا آخری وقت ایام نحر کا تیسرا دن ہے یعنی عید کے دن اور اس کے بعد دو دن تک قربانی کے جانور ذبح کئے جا سکتے ہیں۔

---

[1] دیکھئے بدایۃ المجتہد ۱/۴۲۲ نیل الاوطار ۵/۱۴۲

شافعیہ کے نزدیک قربانی کا جانور ذبح کرنے کے چار دن ہیں: عید کا دن اور اس کے بعد تین دن۔ امام اوزاعیؒ، مکحولؒ اور داؤدؒ کا مذہب یہی ہے اور اسی کو امام ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے۔[1]

یہ قول حضرت علیؓ سے مروی ہے جسے امام نوویؒ نے اپنی شرح مسلم میں سے انہی کے حوالے سے نقل کیا ہے

یہ قول اُن سے ہدی کے بارے میں روایت کیا گیا ہے جو حضرت ابن عباسؓ عطاءؒ، حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے۔

ابن سیرین نے کہا ہے کہ قربانی کا صرف ایک دن ہے لیکن یہ قول شاذ ہے۔[2]

اس مسئلے میں اختلاف کا سبب ارشاد باری تعالیٰ:

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (الحج: آیت ۲۸)

(تاکہ پہنچیں اپنے فائدہ کی جگہوں پر اور پڑھیں اللہ کا نام کئی دن جو معلوم ہیں ذبح پر چوپایوں مویشیوں کے جو اللہ نے دیے ہیں اُن کو)

کے مفہوم میں اختلاف ہے۔

چنانچہ آیت کے معنی میں کہا گیا ہے کہ قربانی کا دن یوم النحر اور اس کے بعد دو دن ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذوالحجہ کا صرف دسواں دن ہے۔

اس مسئلے میں اختلاف کا دوسرا سبب حدیث کا آیت کریمہ سے تعارض ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"مکے کے تمام درّے نحر (ذبح) کرنے کی جگہیں اور تشریق کے تمام دن ذبح (کرنے) کا وقت ہیں"۔[3]

چنانچہ جن فقہاء کی یہ رائے ہے کہ ایام ذبح ذوالحجہ کی دسویں تاریخ اور اس کے بعد دو دن ہیں، انہوں نے

---

[1] - دیکھیے امام نووی کی شرح مسلم ۱۳/۱۱۱۔ الفروع ۴۲۶/۳ زاد المعاد ۲۹۶/۱

[2] - نیل الاوطار ۱۴۲/۵

[3] - یہ حدیث امام احمدؒ، دارقطنی بیہقی اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کی ہے دیکھیے نیل الاوطار ۱۴۳/۵

آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے۔ اور جن فقہاء نے آیت کریمہ اور حدیث کو جمع کیا ہے اور کہا ہے کہ حدیث میں جو حکم ہے وہ آیت سے زیادہ اور مقبول ہے۔ ان کی رائے ہے کہ ایام ذبح ذوالحجہ کی دسویں تاریخ اور اس کے بعد تین دن ہیں۔

اس امر میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں کہ آیت کریمہ

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (۲:۲۰۳)

(اور یاد کرو اللہ کو گنتی کے چند دنوں میں)

میں "ایام معدودات" سے مراد یوم نحر (عید کا دن) اور اس کے بعد تین دن ہیں جو ایام تشریق کہلاتے ہیں۔

جو فقہاء یہ سمجھتے ہیں کہ چوتھے دن قربانی نہیں کی جا سکتی وہ اس امر سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (قربانی کا گوشت) تین دن سے زیادہ ذخیرہ کر کے رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ ان کے خیال میں اس حدیث سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ ذبح کا وقت صرف تین دن ہے۔ اگرچہ حدیث مذکور کے منسوخ ہونے پر ان کا اتفاق ہے۔

امام ابن قیمؒ نے اس دلیل کا یہ جواب دیا ہے کہ حدیث مذکور ہرگز اس امر پر دلالت نہیں کرتی کہ قربانی ذبح کرنے کا وقت صرف تین دن ہے، کیونکہ حدیث سے جو دلیل نکلتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ذبح کرنے والا کسی چیز کو اپنے ذبح کرنے کی تاریخ سے تین دن سے زیادہ مؤخر نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اپنا جانور ذبح کرنے میں تیسرے دن تک تاخیر کرے تو اس دن سے لے کر تیسرے دن تک کا گوشت ذخیرہ کرنا جائز ہو گا۔

اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی فرمایا ہے کہ: "ایام نحر، عید کا دن اور اس کے بعد تین دن ہیں"۔ اور اس لئے بھی کہ یہ تین دن ایام منیٰ، ایام الرمی اور ایام التشریق ہونے کے ساتھ مختص ہیں اور ان میں روزہ رکھنا حرام ہے یہ تین دن اپنے تمام احکام میں برابر ہیں، پس یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ جواز ذبح کے مسئلے میں بغیر کسی نص اور اجماع کے ان کے درمیان فرق کیا جائے۔[1]

---

[1] - زاد المعاد ۲۹۶/۱ - دیکھئے نیل الاوطار ۱۴۳/۵

حق یہ ہے کہ مذکورہ صحیح حدیث اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس حدیث میں اور متعلقہ آیت کریمہ میں کوئی تعارض نہیں پایا جاتا، امام شافعیؒ کا قول ارجح ہے۔

اس مسئلے میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے کہ آیا ایام تشریق کی راتوں میں قربانی کا جانور ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں، یعنی یہ کہ ذبح کا عمل کیا رات کے سوا صرف دن کے ساتھ مخصوص ہے؟

چنانچہ امام مالکؒ کے مشہور قول کے مطابق ان کے نزدیک، ایک اور روایت کی رُو سے حضرت امام احمدؒ کے نزدیک، رات کے وقت نہ ذبح کرنا جائز ہے نہ نحر کرنا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک قربانی کا جانور رات کے وقت بھی ذبح کیا جا سکتا ہے مگر کراہت کے ساتھ۔

اس مسئلے میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ آیا لفظ "یوم" (دن) کا اطلاق دن اور رات دونوں پر ہوتا ہے یا خصوصیت کے ساتھ صرف دن پر؟

چنانچہ جن لوگوں کی رائے ہے کہ لفظ "یوم" کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ صرف دن پر ہوتا ہے وہ ارشادِ باری تعالیٰ عزاسمہ:

سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمَانِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (الحاقہ: آیت ،)

(مسخر کر دیا اس کو ان پر سات رات اور آٹھ دن تک لگاتار)

سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یوم سے مراد دن ہے نہ کہ رات۔

اور جو فقہاء یہ سمجھتے ہیں کہ لفظ "یوم" کا اطلاق بیک وقت رات اور دن دونوں پر ہوتا ہے وہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے دلیل لاتے ہیں کہ:

تمتعوا فی دارکم ثلثۃ ایام[1] (هود: آیت ۶۵)

(فائدہ اٹھا لو اپنے گھروں میں تین دن)

---

[1] دیکھئے بدایۃ المجتہد ۱/۴۲۲۔ نیل الاوطار ۵/۱۴۳

حق یہ ہے کہ اس مسئلہ میں جمہور فقہاء کا قول صحیح ہے اور وہ یہ کہ قربانی کا جانور رات اور دن دونوں وقت ذبح کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی امر مانع موجود نہیں۔ لیکن جن لوگوں نے رات کے وقت ذبح کرنا کراہت کے ساتھ جائز قرار دیا ہے، اُن کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں جسے اپنی رائے کے حق میں پیش کر سکیں۔

احناف کے نزدیک اگر کوئی شخص کسی جانور کو قربانی کے لئے مخصوص کر دے لیکن اس کو ذبح نہ کرے اور قربانی کا وقت گزر جائے تو اب اُسے چاہیئے کہ اس جانور کو صدقے کے طور پہ ذبح کرے اور اس کا پورا گوشت فقراء اور مساکین پہ صدقہ کر دے ذبح کرنے والے کے لئے اس کا گوشت کھانا جائز نہیں اس لئے کہ واجب اراقۃ (خون بہانا) سے صدقہ کرنے کی جانب منتقل ہو گیا ہے۔ اگر کسی نے قربانی کا ذبح اپنے اوپر واجب نہ کیا ہو اور نہ جانور کی تعیین کی ہو اور وہ صاحب حیثیت ہو تو اسے چاہیئے کہ جانور کی قیمت صدقہ کر دے۔[۱]

---

[۱] ۔ دیکھئے حاشیہ ابن عابدین ۲۲۶/۲۷

چوتھی فصل

ہدی

یہ فصل تین مباحث پر مشتمل ہے:

پہلی بحث : ہدی کی تعریف اور منیٰ کے مقام پر کئے جانے والے ذبیحوں کی قسمیں۔

دوسری بحث : وقت ذبح: آغاز و اختتام۔

تیسری بحث : منیٰ کے مقام پر گوشت کے ضیاع کا مسئلہ اور اس کا حل۔

پہلی بحث

ہدی کی تعریف اور منیٰ کے مقام پر کئے جانے والے ذبیحوں کی قسمیں

ہدی کی دو قسمیں ہیں: ہدی تطوع (نفلی ہدی) اور ہدی واجب ہدیِ تطوع وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے بیت اللہ الحرام کو بھیجی جائے یہ ہدی حرم شریف کے باہر سے ہانک کر لے جائی جاتی ہے یہاں تک کہ بیت اللہ الحرام میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ ہدی خاص علامات رکھتی ہے جن سے اسے پہچانا جاتا ہے۔ جیسے تقلید (گلے میں قلادہ ڈالنا) اور اشعار (اس پر کوئی نشان یا علامت بنانا) جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ جانور اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی جناب میں قربانی پیش کرنے کے لئے ہے [1]

اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

---

[1] : دیکھئے الروضہ ۳/۱۸۹

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ
اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ
وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا
وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ط (الحج: آیت ۳۶-۳۷)

(اور کعبے کے چڑھانے کے اونٹ ٹھہرائے ہیں ہم نے تمہارے واسطے نشانی اللہ کے نام کی تمہارے واسطے اس میں بھلائی ہے سو پڑھو ان پر نام اللہ کا قطار باندھ کر پھر جب گر پڑے ان کی کروٹ تو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ صبر سے بیٹھے کو اور بیقراری کرتے کو اسی طرح تمہارے بس میں کر دیا ہم نے ان جانوروں کو تاکہ تم احسان مانو اللہ کو نہیں پہنچتا ان کا گوشت اور نہ ان کا لہو لیکن اس کو پہنچتا ہے تمہارے دل کا ادب)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی سو اونٹ تھے جن میں سے تریسٹھ[۶۳] اونٹ آپ نے اپنے دست مبارک سے یوم النحر کو نحر فرمائے اور باقی حضرت علیؓ کو دے دیئے کہ وہ نحر کریں۔ [۱]

امام ابن قیمؒ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

جو ذبیحے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اور عبادت کے طور پر کئے جاتے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں: یعنی ہدی، قربانی اور عقیقہ۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیڑ بکریوں کی ہدی دی، اور اونٹوں کی ہدی دی اور اپنی ازواج مطہرات کی جانب سے گایوں کی ہدی دی۔ نیز آپ نے اپنی جائے سکونت پر ہدی دی اپنے عمرے میں ہدی دی اور اپنے حج میں ہدی دی۔ بھیڑ بکریوں کے گلے میں قلادہ ڈالنا لیکن ان کے جسموں پر کوئی نشان یا علامت نہ بنانا (یعنی اشعار نہ کرنا) آپ کی سنت ہے۔ جب آپ اپنی ہدی بھیجتے تھے مقیم ہوتے تھے، اپنے اوپر کوئی چیز حرام نہ فرماتے تھے اور ہدی بھیجنے کے باوجود حلال رہتے تھے۔ جب آپ اونٹوں کی ہدی

---

[۱] یہ حدیث امام بخاریؒ، مسلمؒ اور احمدؒ نے روایت کی ہے۔ دیکھئے نصب الرایہ ۳/۱۶۳ یہاں یہ حقیقت قابل ذکر ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۳ سال کی عمر پائی۔

بھیجنے کے باوجود حلال رہتے تھے۔ جب آپؐ اونٹوں کی ہدی بھیجتے تو ان کی گردنوں میں قلادے ڈال دیتے اور ان کے جسموں پر نشان لگا دیتے تھے یعنی ان کی دہنی کوہانوں کو کسی قدر چیر دیتے تھے تاکہ کچھ خون بہہ جائے۔ [1]

ہدی واجب :

ہدی واجب وہ قربانی ہے جو حج تمتع یا حج قران کرنے والے پر واجب ہوتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ :

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (۲ : ۱۹۶)

(تو جو کوئی فائدہ اٹھائے عمرہ کو ملا کر حج کے ساتھ تو اس پر ہے جو کچھ میسر ہو قربانی سے)

کے مطابق یہ دونوں قربانیاں باتفاق علماء واجب ہیں۔

لیکن اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے کہ آیا یہ دونوں قربانیاں (یعنی حج تمتع کی قربانی اور حج قران کی قربانی) مجبوری کی قربانیاں ہیں یا شکر کی۔ چنانچہ کچھ فقہاء نے کہا ہے کہ یہ مجبوری کی قربانیاں ہیں۔ یہ قول حضرت امام شافعیؒ کا ہے۔ ان فقہاء کی رائے میں یہ قربانیاں اس لئے مجبوری کی قربانیاں ہیں کہ حج تمتع کرنے والے کے لئے ضروری تھا کہ وہ حج کا احرام باندھنے کے لئے دوبارہ میقات کے مقام پر جاتا۔ لیکن چونکہ وہ نہیں گیا اس لئے اس پر ایک جانور کی قربانی واجب ہوئی۔ لہذا یہ مجبوری کی قربانی ہے۔ ایسی ہی مثال حج قران کرنے والے کی ہے چونکہ اس نے ایک ہی احرام میں حج اور عمرہ کو جمع کیا ہے لہذا اس پر ایک جانور کی قربانی دینا واجب ہے۔

لیکن بعض فقہاء نے کہا ہے کہ یہ قربانیاں شکر کی قربانیاں ہیں۔ یہ قول احناف اور حنابلہ کا ہے۔

فقہاء کے نزدیک حج تمتع کرنے والے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کا مسکن (رہنے کی جگہ) حرم شریف سے باہر ہو اور یہ کہ وہ حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے اور پھر اسی سال حج کا احرام باندھے۔ اسی وجہ سے اس پر لفظ متمتع کا اطلاق ہوتا ہے۔

اور قارن یعنی حج قران کرنے والا وہ ہے جو حرم شریف کی حدود میں بسنے والوں میں سے نہ ہو اور حج کے مہینوں میں مقام میقات سے احرام واحد میں حج اور عمرہ کو جمع کرے۔

لیکن جو شخص حرم شریف کا رہنے والا ہو اس پر باتفاق علماء قربانی واجب نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

---

[1] زاد المعاد ۱/۲۹۳۔

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۲ : ۱۹۶)

(جس کے گھر والے نہ رہتے ہوں مسجد الحرام کے پاس)

جمہور فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آیت میں مذکور ہدی سے مراد بکری ہے، لیکن حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی رائے ہے کہ اسم ہدی کا اطلاق اونٹ اور گائے کے سوا کسی اور جانور پر نہیں ہوتا۔

اس مسئلے میں فقہاء کا اجماع ہے کہ علی الترتیب متمتع اور قارن کا کفارہ، یعنی جب اسے ذبح کرنے کے لئے کوئی جانور نہ ملے، یہ ہے کہ تین دن کے روزے حج میں اور سات دن کے روزے اپنے گھر اہل وعیال میں پہنچ کر رکھے۔[1]

مذکورہ بالا بیان سے یہ امر واضح ہے کہ جمہور فقہاء کی رائے کے مطابق جن میں شافعیہ اور حنابلہ شامل ہیں، قربانی کرنا حاجیوں اور دیگر مسلمانوں کے لئے سنت ہے۔ لیکن مذہب امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کی رو سے حاجیوں پر قربانی (واجب) نہیں۔

دوسری بحث

وقت ذبح : آغاز واختتام

فقہاء اس مسئلے میں متفق الرائے ہیں کہ عید کے دن نماز فجر سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں۔ اور جہاں تک قربانی کے آخری وقت کا تعلق ہے تو اس مسئلے میں جمہور کا مذہب یہ ہے کہ عید سے تیسرا دن گزرنے پر قربانی کا وقت ختم ہو جاتا ہے، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک وہ عید کے چوتھے دن تک باقی رہتا ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا گیا۔

جہاں تک ہدی تطوع (نفلی ہدی) کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ: "ہدی کے وقت ذبح کے بارے میں دو رائیں ہیں جن میں سے صحیح یہ ہے کہ وہ اضحیہ یعنی قربانی کی طرح یوم نحر اور ایام تشریق کے ساتھ مخصوص ہے عراق کے فقہاء وغیرہ نے قطعیت کے ساتھ یہی رائے اختیار کی ہے۔"

دوسری رائے کے مطابق ہدی کسی وقت کے ساتھ مخصوص نہیں، جیسا کہ مجبوری کی قربانی اگر وہ بھی کسی وقت کے ساتھ مخصوص نہیں۔ چنانچہ پہلی رائے کے مطابق اگر کسی نے ذبح کا عمل مؤخر کیا یہاں تک کہ یہ مقررہ دن (یعنی ایام النحر) گزر گئے اور ان کے گزر جانے کے بعد ہدی کا جانور ذبح کیا تو اگر وہ ہدی واجب تھی تو واجب ادا ہوگی۔ لیکن اگر ہدی

---

[1] ۔ دیکھئے بدایۃ المجتہد ۳۵۶/۱

تطوع تھی تو اب اس کا وقت گزر چکا تھا۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اب اس کی حیثیت صرف بکری کے گوشت کی ہے[1]

جہاں تک حج تمتع اور حج قران کی قربانی کا تعلق ہے، اس کے بارے میں فقہاء کے دو اقوال ہیں:

پہلا قول جمہور فقہاء کا ہے جن میں حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ شامل ہیں اس قول کے مطابق ایسی قربانی کا یوم نحر سے پہلے ذبح کرنا جائز نہیں۔ اور نحر کے دن ذبح کا وقت سورج طلوع ہونے کے بعد اس وقت شروع ہوتا ہے جب عید کی نماز پڑھ لی جائے یا اتنا وقت گزر جائے جس میں نماز پڑھی جا سکتی ہو۔

مالکیہ کے نزدیک اس قسم کی قربانی کے ذبح کرنے کا وقت جمرۃ العقبہ کی رمی کے بعد شروع ہوتا ہے۔

دوسرے قول کے مطابق اسے یوم نحر سے پہلے ذبح کیا جا سکتا ہے۔ یہ قول امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کا ہے۔ امام احمدؒ سے مروی ایک روایت کے مطابق یوم نحر سے پہلے ذبح کرنا اس صورت میں جائز ہے جبکہ (قربانی) عشرۂ ذی الحجہ سے پہلے بھیج دی گئی ہو۔

بعض فقہاء کی رائے میں اس وقت ذبح کرنا جائز ہے جب عمرہ کا احرام باندھا جائے، اور بعض کی رائے ہے کہ اس وقت ذبح کیا جا سکتا ہے جب عمرہ سے حلال ہو۔ اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حج کا احرام باندھنے کے بعد ذبح کرنا جائز ہے۔ یہ قول حضرت امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے[2]

قولِ اوّل کی دلیل

قرآن مجید سے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ (۲ : ۱۹۶)

(اور نہ حجامت کرواؤ اپنے سروں کی جب تک نہ پہنچ چکے قربانی اپنے ٹھکانے پر)

ابن عربی کہتے ہیں:

"یوم نحر سے پہلے سر منڈانا جائز نہیں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ نے فرمایا ہے: "اگر مجھے یہ بات پہلے معلوم

---

[1] - الروضہ ۳/۱۹۱

[2] - دیکھئے احکام القرآن تالیف ابن عربی ۱/۱۲۹

ہو جاتی جو بعد معلوم ہوئی (کہ میرے بغیر احرام کھولنے میں تمہیں تامل ہوگا) تو میں ہدی نہ چلاتا اور (اپنے اس حج کو) عمرہ کر لیتا۔"

آپؐ مزید فرماتے ہیں کہ "میں نے اپنے بال جمالئے ہیں اور ہدی کے جانوروں کی گردن میں قلادے ڈال دیئے ہیں، چنانچہ اب میں اس وقت تک حلال نہیں ہوں گا جب تک (ہدی کے جانوروں کو) ذبح نہ کرلوں۔"[ل]

امام جصاصؒ نے لکھا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ:

"فاذا وجبت جنوبها فكلوا منها واطعموا البائس الفقير ثم ليقضوا تفثهم وليوفوا نذورهم وليطوفوا بالبيت العتيق" (۲۲: ۲۸-۲۹)

"پھر جب گر پڑے ان کی کروٹ تو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ برے حال کے محتاج کو پھر چاہئے کہ ختم کردیں اپنا میل کچیل اور پوری کریں اپنی منتیں اور طواف کریں اس قدیم گھر کا")

کے مطابق اس ہدی کا یوم نحر کے سوا کسی اور دن ذبح کرنا جائز نہیں۔

میل کچیل کا صاف کرنا اور طواف زیارت یوم نحر سے پہلے نہیں ہوتا۔ اور چونکہ مذکورہ تمام افعال (یعنی میل کچیل کا صاف کرنا، نذروں کا پورا کرنا اور خانہ کعبہ کا طواف کرنا) کو ہدی کے ذبح کئے جانے کے ساتھ متعلق ٹھہرایا گیا ہے لہٰذا اس سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ یہ ہدی قران اور تمتع کی ہدی ہیں کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ افعال ہر قسم کی ہدی سے متعلق نہیں۔ دوسری اقسام کی ہدی کے بارے میں اس امر کی اجازت ہے کہ انہیں جب چاہئیں ذبح کریں۔ چنانچہ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ہدی تمتع کا یوم نحر سے پہلے ذبح کرنا جائز نہیں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "جس چیز سے میں بعد میں واقف ہوا، اگر میں اسے پہلے جان لیتا تو اپنے ساتھ ہدی نہ لاتا اور (اپنے اس حج کو) عمرہ کر لیتا" بھی اسی مسئلے کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے اور ہدی اپنے ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے لوگوں کو بتایا کہ جس چیز سے میں بعد میں واقف ہوا اگر اسے پہلے جان لیتا تو اپنے ساتھ ہدی نہ لاتا مگر ہدی تمتع کا یوم نحر سے پہلے ذبح کرنا جائز ہوتا تو آپؐ اپنی ہدی کو ذبح کر لیتے اور حلال ہو جاتے (یعنی حالت

ل۔ احکام القرآن تالیف علامہ ابن عربی ۱/۱۲۹

احرام سے نکل آتے) جیسا کہ آپؐ نے صحابۂ کرام کو حکم دیا، اور بعد میں کسی فوت شدہ شے کو پانے والے نہ ہوتے۔

اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تو نے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کے مطابق احرام باندھا۔ میں ہدی اپنے ساتھ لایا ہوں چنانچہ یوم نحر تک حلال نہیں ہوں گا۔"

علاوہ ازیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اپنے مناسک حج مجھ سے لو" اور یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی ہدی یوم نحر کو قربان کی۔ چونکہ ہمارے لئے آپؐ کی پیروی کرنا ضروری ہے لہٰذا یہ امر جائز نہیں کہ ہم اپنا قربانی کا جانور اُس وقت سے پہلے ذبح کریں جس وقت حضورؐ نے اپنا جانور ذبح فرمایا۔ اور اللہ سبحانہٗ تعالیٰ زیادہ جاننے والے ہیں[1]

دوسرے قول کی دلیل:

دوسرا قول اختیار کرنے والے فقہاء نے اپنی رائے کی بنیاد حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی اس حدیث پر رکھی ہے کہ حضرت جابرؓ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب ہم حلال ہو گئے (یعنی ہم نے احرام کھول دیا) تو حضورؐ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اپنی ہدی قربان کریں اور ایک جانور میں (سات) آدمی شریک ہوں اور یہ اس وقت جب کہ آپؐ نے (انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے حج سے حلال ہو جائیں[2]

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس حدیث سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ عمرہ سے حلال ہونے کے بعد اور حج کا احرام باندھنے سے پہلے ہدی تمتع کا ذبح کرنا جائز ہے۔ اس مسئلے میں کافی اختلاف اور تفاصیل ہیں۔ ہمارے مذہب کی رُو سے تمتع کی قربانی اس وقت واجب ہوتی ہے۔ جب آدمی عمرہ سے فارغ ہو جائے اور پھر حج کا احرام باندھے چنانچہ حج کا احرام باندھنے کے ساتھ قربانی واجب ہو جاتی ہے۔ اس کے وقت جواز کے سلسلے میں تین رائیں ہیں جن میں سے صحیح رائے جمہور کی ہے کہ عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد اور حج کا احرام

---

[1] ۔ احکام القرآن از جصاص ۳۶۵/۱

[2] ۔ یہ حدیث امام مسلم اور طیالسی نے روایت کی ہے۔

باندھنے سے پہلے اس کا ذبح کرنا جائز ہے۔ لیکن دوسری رائے کے مطابق اس کا ذبح کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ آدمی حج کا احرام نہ باندھ لے، اور تیسری رائے یہ ہے کہ عمرہ کا احرام باندھنے سے پہلے اس کا ذبح کرنا جائز ہے۔[۱]

خیرازی نے کہا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ:

فمن تمتع بالعمرة الی الحج فما استیسر من الهدی

کے مطابق حج کا احرام باندھنے کے ساتھ تمتع کی قربانی واجب ہو جاتی ہے اور چونکہ احرام حج کے وجود کے ساتھ قربانی کی شرائط بھی بروئے کار آجاتی ہیں لہٰذا واجب ہوا کہ قربانی کے وجوب کو اس کے (یعنی احرام حج کے) ساتھ متعلق ٹھہرایا جائے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر متمتع یا قارن اپنے ساتھ ہدی تمتع یا قران لائے اور یوم نحر کے آنے سے پہلے انہیں ذبح نہ کرے تو یہ چیز میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ لیکن اگر وہ (یوم نحر کے آنے سے پہلے ہی) انہیں حرم میں نحر کرلے تو یہ اس کے لئے کافی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں پر دو اقسام کے فرض ہیں: ایک بدنی فرض جو وقت آجانے کے بعد پورا کیا جاتا ہے اور دوسرا مالی فرض جو وقت سے پہلے بھی ادا کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کی ضرورت ہو۔ یہی حکم اس صورت میں ہے جب کہ وہ ہدی منفرد کی حیثیت سے تطوع کے طور پر لایا ہو۔ اگر وہ ہدی کو معتمر کی حیثیت سے لایا ہو تو اسے اختیار ہے کہ اپنی ہدی خانہ کعبہ کے طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کے بعد لیکن مروہ کے قریب سر منڈوانے سے پہلے نحر کرے۔ اگر اس نے اپنی ہدی مکہ کے دروں اور راہوں میں نحر کی تو یہ اس کے لئے کافی ہے اور حج میں اُسے اختیار ہے کہ اپنی ہدی جمرۃ العقبہ پر رمی کے بعد لیکن سر منڈانے سے پہلے ذبح کرے۔ اگر ہدی منیٰ یا مکے میں نحر کرے اور اس کا گوشت مساکین حرم کو دیدے تو یہ امر کافی ہے۔[۲]

۲۔ ان فقہاء کی ایک اور دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے مروی وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

---

[۱] ۔ دیکھئے امام نووی کی شرح مسلم

[۲] ۔ الام ۲/۱۸۳

جب لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے تو ہم حج کے لئے نکلے حتیٰ کہ ہمارے اور اس امر کے مابین کہ ہم قربانی کے جانور ذبح کریں۔ چند دن رہ گئے تو حضورؐ نے ہمیں احلال (حالتِ احرام سے نکل آنے) کا حکم دیا۔ ہم نے کہا کیا ہمارے لئے یہ امر مناسب ہے کہ ہم جنابت کی حالت میں عرفہ پہنچیں جب یہ بات حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوئی تو آپؐ خطبے کے لئے کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا:

اے لوگو! اللہ کی قسم تم مجھے جانتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کو تم سے زیادہ جاننے والا اور تم سے زیادہ اس سے ڈرنے والا ہوں۔ اگر مجھے یہ بات پہلے معلوم ہو جاتی جو بعد میں معلوم ہوئی (کہ میرے بغیر احرام کھولنے میں تمہیں تامل ہوگا) تو میں ہدی نہ چلاتا اور حلال ہو جاتا جیسے تم حلال ہوئے۔ چنانچہ جس کے ساتھ ہدی نہ ہو اُسے تین دن کے روزے (حج میں) اور سات دن کے روزے اپنے گھر اہل وعیال میں پہنچ کر رکھنے چاہئیں اور جسے ہدی ملے اُسے چاہیئے کہ ہدی کو نحر کرے۔ چنانچہ ہم نے سات سات آدمیوں کی جانب سے ایک ایک اونٹ ذبح کیا۔

عطا فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ اُس دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں بھیڑ بکریاں تقسیم کیں: چنانچہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ایک مینڈھا ملا جسے انہوں نے اپنی جانب سے ذبح کیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ میں قیام کیا تو آپؐ نے حضرت ربیعہ بن ابی خلف کو حکم دیا اور وہ اپنی اونٹنی کی اگلی ٹانگوں کے قریب کھڑے ہوگئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ چیخ کر کہو: اے لوگو! کیا تم جانتے ہو یہ مہینہ کون سا ہے؟" [۱]

۲۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظہر کی نماز شہر میں چار رکعت پڑھی جائے اور عصر کی نماز ذوالحلیفہ میں دو رکعت"۔ آپؐ نے رات وہیں بسر کی اور جب صبح ہوئی تو آپؐ اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور تسبیح وتہلیل کرنا شروع کی۔ پھر جب آپؐ میدان بیداء پر چڑھے تو سب لوگوں نے آپؐ کے ساتھ تسبیح وتہلیل کی اور جب آپؐ مکے میں داخل ہوئے تو لوگوں کو حکم دیا کہ (احرام کھول کر) حلال ہو جاؤ۔ اور خود آپ نے اپنے دست مبارک سے سات اونٹ

[۱] ۔ یہ حدیث امام حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کی ہے اور مسلم کی شرائط پر ہے۔

کھڑے ہونے کی حالت میں نحر فرمائے[۱]

امام نووی کہتے ہیں کہ ہمارے اصحاب نے ارشاد باری تعالیٰ :

فمن تمتّع بالعمرۃ الی الحجّ فما استیسر من الھدی (البقرہ : ۱۹۶)

(جو شخص عمرے سے لے کر حج تک تمتع کرے وہ جو قربانی میسر ہو اسے کر ڈالے)

سے استدلال کیا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ (تمتع کرنے والے کے لئے اس جانور کی قربانی دینا) ضروری ہے جو اُسے میسر ہو۔ اور (چونکہ) وہ صرف احرام باندھ لینے سے متمتع ہو جاتا ہے لہذا اس کے لئے قربانی دینا اسی وقت واجب ہو جاتا ہے (جب وہ احرام باندھے) نیز چونکہ (حج کا احرام باندھ لینے کو تمتع کی آخری) حد قرار دیا ہے لہذا قربانی کے حکم کو اس کی ابتدار (یعنی احرام باندھنے کی ابتدا) سے متعلق سمجھا جائے گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ثم اتموا الصیام الی اللیل (پھر پورا کرو روزے کو رات تک یعنی رات کی ابتداء تک) اور چونکہ اس وقت یعنی احرام باندھ لینے پر تمتع کی شرائط بروئے کار آجاتی ہیں لہذا جانور کا ذبح کرنا بھی اسی وقت ضروری ہو جاتا ہے۔ اور اللہ زیادہ جاننے والے ہیں ۔

علمار نے کہا ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ "فمن تمتّع بالعمرۃ" کا مطلب یہ ہے کہ عمرہ کے سبب سے تمتع کرے اس لئے کہ تمتع کرنے والا عمرہ کے سبب سے حج اور عمرہ کے احرام کے محظورات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ علما کہتے ہیں کہ تمتع سے یہاں مراد لذت اور فائدہ اٹھانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "تمتع بہ" یعنی اس نے اس سے فائدہ اور لذت اٹھائی ۔ اور متاع ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے فائدہ اٹھایا جائے ۔ واللہ اعلم

اس سے امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ قربانی پر قیاس کرتے ہوئے ہدی تمتع کا یوم نحر سے پہلے ذبح کرنا جائز نہیں۔ لیکن ہمارے اصحاب ان دونوں کے خلاف آیت کریمہ سے احتجاج کرتے ہیں نیز اس مسئلے سے کہ وہ دونوں (یعنی امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ) تمتع کے روزہ یعنی تین دن کے روزے یوم نحر سے پہلے رکھنا جائز سمجھتے ہیں۔ لہذا ہدی کا (یوم نحر سے پہلے) ذبح کرنا تو زیادہ اولیٰ ہے ۔ وہ جبر کی قربانی ہے

---

[۱] ۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم شریف میں روایت کی گئی ہے اور الفاظ بخاری کے ہیں دیکھئے نصب الرایہ ۱۶۳/۳

لہٰذا واجب ہونے کے بعد یوم نحر سے پہلے اس کا ذبح کرنا جائز ہے جیسے خوشبو اور لباس وغیرہ کے فدیہ میں دی جانے والی قربانی کا ذبح کرنا۔ بخلاف اضحیہ (یعنی عید الاضحیٰ کی قربانی) کے کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے اس کے منصوص وقت پر ذبح کیا جائے[1] واللہ اعلم۔

ابن قدامہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جہاں تک (ہدی قران یا تمتع کے) واجب ہونے کے وقت کا تعلق ہے تو اس مسئلے میں حضرت امام احمدؒ کی رائے ہے کہ جب حج کا احرام باندھا جائے یہ اس وقت واجب ہوتی ہے یہی قول امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فمن تمتّع بالعمرة الی الحجّ فما استیسر من الھدی

(جو شخص عمرہ سے لے کر حج تک تمتع کرے وہ جو قربانی میسر ہو اسے کر ڈالے)

اور یہ (یعنی احرام باندھنا) اس کا (یعنی حج کا) عمل ہے۔ نیز اس لئے کہ حج کو تمتع کی آخری حد قرار دیا گیا ہے پس حج کے پہلے عمل (یعنی احرام باندھنا) کا بجا لایا جانا (ہدیِ تمتع یا قران کے) وقت وجوب کے لئے کافی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ثم اتمّوا الصیام الی اللیل (پھر پورا کرو روزے کو رات تک)، علاوہ ازیں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چونکہ متمتع حج کا احرام میقات کے بجائے کسی دوسرے مقام سے باندھتا ہے لہٰذا اس پر جانور کا ذبح کرنا واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ اگر وہ حج سے رک جاتا یا حلال ہو جاتا تو اس صورت میں اس پر واجب ہوتا۔ امام احمدؒ ہی سے مروی ایک روایت کے مطابق ہدیِ تمتع یا قران اُس وقت واجب ہوتی ہے جب عرفہ میں قیام کیا جائے۔ یہی قول امام مالکؒ کا ہے اور اسی کو قاضیؒ نے اختیار کیا ہے[2]

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ہدیِ تمتع یا قران کے ذبح کرنے کا آخری وقت کیا ہے تو جمہور علماء کی رائے کے مطابق عید کے تیسرے دن یہ وقت ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک ایام عید کے چوتھے دن ختم ہوتا ہے۔ ایام تشریق تین ہیں۔ اس بارے میں علماء کا اختلاف اس سے پہلے قربانی کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔

---

[1]۔ المجموع ۷/۱۶۲

[2]۔ المغنی ۳/۴۶۵

علامہ ابن حزم نے کہا ہے کہ اس کا وقت کبھی ختم نہیں ہوتا (جب ذبح کر لیا جائے صحیح ہے)
جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اس مسئلے میں صحیح رائے شافعیہ کی ہے اور علامہ ابن قیمؒ نے
بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

تیسری بحث

منیٰ کے مقام پر گوشت کے ضیاع کا مسئلہ اور اس کا حل

اگر مقام منیٰ اور مکۃ المکرمہ میں قربانی کے شروع کئے جانے کی حکمت پر غور کیا جائے تو ہم یہ دیکھیں گے کہ اس کا مقصد :

ایک تو اللہ سبحانہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا، ان مبارک دنوں میں قربانی کے جانوروں کا خون بہا کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا فرض بجالانا، شیطان رجیم کی نافرمانی اور دور جاہلیت کے ان عرب وغیرہ کی مخالفت کرنا ہے جو اپنے بتوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ان دنوں میں جانور ذبح کیا کرتے تھے اس کا ایک اور مقصد نفوس انسانی کو تہذیب و شائستگی کی اعلیٰ خصوصیات سے آراستہ کرنا اور انہیں بخل اور لالچ کی بُری عادات سے پاک کرنا ہے .

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں قربانی کا پیش کیا جانا اس کا تقرب حاصل کرنے اور اس کی اطاعت کی بہترین صورت ہے . چنانچہ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں :

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاءُ ھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (الحج آیت ۳۷)

(اللہ کو نہیں پہنچتا ان کا گوشت اور نہ ان کا لہو لیکن اس کو پہنچتا ہے تمہارے دل کا ادب)

اس کا دوسرا مقصد حرم مکی کے رہنے والے فقراء اور مساکین کی مدد کرنا ہے تاکہ وہ آسودہ حالی کی زندگی بسر کر سکیں .

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

فَکُلُوْا مِنْھَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (الحج : آیت ۳۶)

(تو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ صبر سے بیٹھے کو اور بیقراری کرتے ہیں)

اور یہ کہ :

وَاَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِیۡرَ (الحج : آیت ۲۸)

(اور کھلاؤ برے حال کے محتاج کو)

چنانچہ اس کا پہلا مقصد اللہ سبحانہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا اس کا تقرب حاصل کرنا اور اس کے احکام بجالانا ہے اور دوسرا مقصد فقراء اور مساکین کے لئے آسودہ زندگی کی راہیں ہموار کرنا ہے لہٰذا اگر کسی وقت ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے جس سے یہ دوسرا مقصد پورا نہ ہو رہا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قربانی کو مشروع قرار دینے سے شارع حکیم کا جو مقصد تھا وہ فوت ہو گیا ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء اور علمائے کرام نے اپنی کتابوں میں ہدی قربان کرنے والے کو اس امر کا مکلف ٹھہرایا ہے کہ وہ اپنی قربانی کا گوشت فقراء و مساکین اور محتاجوں کے ہاتھوں تک پہنچائے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

"اگر کوئی شخص اپنی ہدی نحر کرے اور (اس کا گوشت) مساکین کو نہ دے، یا اُسے ایسی جگہ ذبح کرے جہاں مساکین اس تک نہ پہنچ سکیں، یہاں تک کہ وہ سڑ جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسرا جانور قربان کرے"[۱]

امام نوویؒ لکھتے ہیں :

"(قربانی کا گوشت) حرم شریف کے مساکین میں تقسیم کرنا واجب ہے، خواہ وہ باہر سے آئے ہوئے غیر ملکی ہوں یا وہاں کے متوطن، لیکن ایسے غرباء کو دینا افضل ہے جو وہاں کے متوطن ہوں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ دونوں میں سے ایک صنف (یعنی وہاں کے متوطن یا غیر ملکی) کو مخصوص کرے۔ امام شافعیؒ نے یہی قرار دیا ہے"[۲]

کتاب المغنی میں لکھا ہے :

"جس (جانور) کا حرم شریف میں نحر کرنا واجب ہے، اس کا گوشت بھی وہیں تقسیم کرنا واجب ہے

۱۔ الام ۱۸۳/۲

۲۔ المجموع ۴۱۳/۷

امام شافعیؒ نے یہی لکھا ہے۔ لیکن امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ نے کہا ہے کہ اگر (جانور) حرم شریف میں ذبح کیا جائے تو (ایسی صورت میں بھی) اس کا گوشت (حرم شریف سے باہر) حل میں تقسیم کرنا جائز ہے[1]

افسوس ہے کہ آج کل کے حاجی مختلف پہلوؤں سے اپنے ذبیحوں کے بارے میں بڑی بے پروائی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

اول تو یہ کہ جو جانور ان کے سامنے آجائے اسے خرید لیتے ہیں، خواہ وہ قربانی کے لائق ہو یا نہ ہو اور اس کی وجہ یا تو ان کی نادانی ہوتی ہے یا بخل۔

دوسرے وہ مُطوّفین کے نوکروں میں سے ایسے ناقابل اعتبار لوگوں کو (قربانی کی خریداری اور ادائیگی کے لئے) اپنا وکیل بنا لیتے ہیں جن کا ضمیر مردہ اور ایمان کمزور ہو چکا ہے۔ یہ لوگ اپنا فرض صحیح طریقے سے ادا نہیں کرتے بلکہ سرے سے جانور ہی نہیں خریدتے، اس کی قیمت لے کر کھا جاتے ہیں۔

تیسرے وہ قربانی کا جانور خرید کر قصائی کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ اسے ذبح کرے اور مٹی کے نیچے دبا دے بغیر اس کے کہ اس سے کوئی فائدہ اٹھایا جائے۔

چوتھے منیٰ کے مقام پر ایک مذبح کے سوا علاقے میں کوئی اور مذبح نہیں۔ اور ذرائع آمد و رفت کی مشکلات اور ٹریفک کے غیر معمولی ہجوم کے باعث اس مذبح تک فقراء اور مساکین کا پہنچنا ناممکن ہے (جس کی وجہ سے اہل حاجت اس گوشت کے حصول سے محروم رہتے ہیں اور وہ تمام کا تمام ضائع ہو جاتا ہے)

مذکورہ بالا عوامل کی وجہ سے یہ امر ناممکن ہو گیا ہے کہ منیٰ کے مقام پر کی جانے والی قربانیوں کے گوشت، چربی اور کھال وغیرہ سے استفادہ کیا جا سکے۔ چنانچہ لاکھوں کی تعداد میں ذبح ہونے والے یہ جانور مٹی کے نیچے دفن کر دیئے جاتے ہیں اور ان سے فقراء یا کسی اور شخص کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

ضرورت ہے کہ اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کیا جائے کیونکہ ہماری رائے میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کا حل اسلام نے پیش نہ کیا ہو۔

بلاشبہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو سراپا حکمت ہے۔ یہاں مسائل کا فیصلہ بڑی حقیقت

---

[1] المغنی ۳/۵۴۶

پسندی کے ساتھ ان کی اصل اہمیت و افادیت کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے اموال کی حفاظت انہیں ضیاع سے بچانے اور اُن کے بارے میں تعمیری نقطۂ نظر اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ انسانی زندگی میں مال و دولت اور وسائل زندگی کی جو اہمیت ہے اس کا پورا پورا اعتراف کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ جو لوگ مال کے مستحق ہیں، انہیں مال دیا جائے۔ اسلام نے اسراف و تبذیر اور مال و دولت کے بارے میں افراط و تفریط پر مبنی نقطۂ نظر اختیار کرنے سے منع کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے قیل و قال، زیادہ سوال پوچھنے اور مال کو ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔"

اسی لئے:

۱۔ شراب کی خرید و فروخت سے انسان کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کے پیش نظر اس کی خرید و فروخت اور اس میں سرمایہ لگانے کو حرام قرار دیا گیا اور اس کے پینے والے، فروخت کرنے والے، اٹھانے والے اور جس کی طرف اٹھا کر لے جائی جا رہی ہے اس پر لعنت فرمائی گئی ہے۔

۲۔ نجس العین اشیاء کے استعمال سے انسان کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کے پیش نظر ان کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ تبذیر (فضول خرچی) سے منع کیا گیا اور فرمایا گیا:

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (اسراء: آیت ۲۷)

(بیشک اڑانے والے بھائی ہیں شیطانوں کے)

اس لئے کہ فضول خرچی کرنے والا مال کو بے موقع و محل خرچ کرتا ہے۔

۴۔ زکوٰۃ اور صدقہ اغنیاء کو دینا جائز نہیں، اس لئے کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں ہوتی، صدقہ اور زکوٰۃ فقراء اور مساکین کو دی جانی چاہئے کیونکہ انہیں اس کی ضرورت رہتی ہے۔

۵۔ قرض لینے والے کو حکم دیا گیا کہ وہ کسی کو جو رقم قرض دے اس کی تحریر لکھوا لے اور اس پر کسی کو گواہ ٹھہرا لے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ

(اے ایمان والو جب تم آپس میں معاملہ کرو ادھار کا کسی وقت مقرر تک تو اس کو لکھ لیا کرو) (۲: ۲۸۲)

۶۔ لوگوں کے اموال اور ان کے وسائل حیات کی حفاظت کی غرض سے حکم دیا گیا کہ چوری کرنے والوں کے ہاتھ کاٹے جائیں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ انسان کے مصالح ضروریہ پانچ ہیں جن کی حفاظت و نگہداشت ضروری ہے: یعنی دین، جان، عقل، نسل اور مال۔

پس مال کی حفاظت کرنا ایک ضروری امر ہے جس کی اسلام دعوت دیتا ہے لہٰذا کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ذبح شدہ جانوروں کو مٹی کے نیچے دبا دینا یا سڑنے کے لئے کھلے آسمان کے نیچے یونہی چھوڑ دینا اور ان کے گوشت، چربی، بالوں، پشم اور دیگر اجزاء سے کوئی فائدہ نہ اٹھانا نہ ہی ان کی حفاظت کرنا ہے جس کا شریعت مطہرہ میں حکم دیا گیا ہے؟[1]

یہ جو کچھ ہو رہا ہے اسلام اس سے بالکل بری ہے۔

بلاشبہ انفرادی طور پر ہر حاجی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی قربانی کا گوشت اور کھال وغیرہ مستحقین تک پہنچائے اور اس بارے میں اس سے ضرور پوچھا جائے گا لیکن اصل ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جو ان مقامات مقدسہ کا انتظام و انصرام کے ذمہ دار ہیں

مسئلے کا حل

اولاً۔ کہا جاتا ہے کہ اگر حضرت امام شافعیؒ وغیرہ کے مذہب کے مطابق ہدی تمتع کو یوم نحر سے قبل

---

[1] ۔ منیٰ کے مقام پر گوشت کے ضیاع کا یہ مسئلہ کچھ ہمارے ہی زمانے میں اہل علم کے نقد و انتقاد کا موضوع نہیں بنا بلکہ علامہ رشید رضا کے زمانے میں بھی سوچنے سمجھنے والے لوگ اس پر اظہار خیال کرتے رہے ہیں چنانچہ علامہ رشید رضا اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں: "جہاں تک ہمارے زمانے میں جب کہ حاجیوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ اور لوگوں کی اپنے دینی احکام اور تقاضوں سے معرفت کم ہو گئی ہے، قربانیوں کا گوشت اس طرح دفن کر دینا دینی نقطۂ نظر سے صحیح ہے نہ دنیاوی بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم نے ایسے غلط تصرفات کے ذریعہ اپنے دین کی خوبیوں کو بھی برائیوں میں تبدیل کر لیا ہے۔ ہم لوگ اقوام عالم کی نظروں میں اپنے دین کے خلاف ایک حجت بن گئے ہیں اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہمارے خلاف ایک حجت بن گئی ہے۔ (فتاویٰ الشیخ محمد رشید رضا ۴/۱۲۲۸)

ذبح کرنے کے جواز کا فتویٰ دے دیا جائے تو اس سے مسئلہ اگر کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر ضرور حل ہو جائے گا۔

اگر اس سلسلے میں پیش کی جانے والی دلیلوں کا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسا کوئی امر مانع موجود نہیں جس کے پیش نظر امام شافعیؒ وغیرہ کے اس قول کو اختیار کرنا ممکن نہ ہو کہ ہدیِ تمتع اور ہدیِ قران کو یوم نحر سے پہلے ذبح کرنا جائز ہے اور یہ کہ ذبح کرنے کا وقت چوتھے روز تک باقی رہتا ہے جیسا کہ:

(الف) ان دلائل سے ثابت ہوتا ہے جو ہم نے اس سے پہلے پیش کئے اور جن سے اس قول کے حامل فقہاء نے استدلال کیا ہے۔

(ب) اگر اس قول اور اس کی حمایت میں پیش کئے جانے والے دلائل کو نظر انداز کر دیا جائے اور کہا جائے کہ فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یوم نحر سے پہلے ہدی کا ذبح کیا جانا جائز نہیں (حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ تقدیم ذبح کی حمایت میں علماء کے اقوال موجود ہیں) تب بھی اہل علم میں یہ قاعدہ کلیہ مشہور و معروف ہے کہ زمانے کے بدل جانے سے احکام میں تبدیلی کا آنا ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

امام ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ اس قاعدۂ کلیہ سے ناواقفیت کے باعث شریعت کے بارے میں لوگ بڑی غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کو بڑے حرج مشقت اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ حالانکہ اگر ہم یہ جان لیں کہ اسلامی شریعت سراپا، دنیا و آخرت میں، بندوں کے مصالح اور حکمتوں پر مبنی ہے تو یہ ساری تنگی اور مشقت و تکلیف رفع ہو سکتی ہے اس لئے کہ شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلامی شریعت سراسر دلائل پر مبنی ہے کلی طور پر انسان کے لئے رحمت ہے، مصلحت ہے اور حکمت ہے۔ پس جو مسئلہ عدل کے بجائے ظلم و جور کی طرف لے جائے، رحمت کے بجائے زحمت کا سبب بنے بھلائی کے بجائے فساد پیدا کرے اور جس کی اساس حکمت کے بجائے بے بنیاد خیالات پر ہو وہ شریعت کا مسئلہ نہیں، خواہ تاویل کے ذریعے اسے شریعت میں داخل کر لیا گیا ہو۔ امام رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی ہیں۔

۱۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے لئے "برائی" کا رد کرنا مشروع قرار دیا ہے تاکہ اس کے رد کر جانے سے نیکی وجود میں آئے جس سے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) خوش ہوں لیکن اگر کسی برائی

کو رد کرنے کا نتیجہ اس سے بڑی برائی کی صورت میں ظاہر ہو جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک پہلی برائی سے زیادہ ناپسندیدہ ہو تو اس کا رد کرنا مناسب نہیں اگرچہ اللہ تعالیٰ اسے ناپسند فرماتے ہوں۔

۲۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے دنوں میں چور کا ہاتھ کاٹنے سے منع فرمایا[1]۔ چور کا ہاتھ کاٹنا اگرچہ اللہ کی حدود میں سے ایک حد ہے لیکن آپؐ نے جنگ کے دنوں میں اس پر عمل درآمد سے منع فرمایا مبادا اس کا نتیجہ ایسی صورت میں ظاہر ہو جو اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ ہو۔

۳۔ تیسرے یہ کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قحط کے سال چور کی قطع ید کی سزا ساقط کر دی۔

۴۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں، نیز حضرت عمرؓ کے ابتدائی دو سالوں میں ایک وقت میں دی گئی تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں، لیکن جب لوگ کثرت سے یہ خلاف سنت طریقہ اختیار کرنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "لوگوں نے ایک ایسے معاملے میں جس میں انہیں مہلت دی گئی تھی جلد بازی سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم بھی ان پر اس حکم کو جاری کریں گے جو انہوں نے (خود جلد بازی سے کام لیتے ہوئے) اپنے اوپر جاری کر لیا ہے"[2]

استاذ مصطفیٰ الزرقا نے اس سلسلے میں رسالہ علامہ ابن عابدین سے ایک اقتباس نقل کیا [illegible]

"بہت سے احکام جن کی بنیاد مجتہد (مذہب) نے اپنے زمانے کے رسم و رواج پر رکھی ہو وقت کے بدل جانے سے تبدیل ہو جاتے ہیں کیونکہ (اس دوران میں) اہل زمانہ کا عرف بدل جاتا ہے یا کوئی ضرورت پیش آجاتی ہے یا لوگوں کا فساد اس کا تقاضا کرتا ہے اس لئے کہ اگر حکم کی اساس اسی خیال پر رہے جس پر کہ تھی تو اس سے لوگوں کو مشقت اور ضرر کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ چیز قواعد شرعیہ کے خلاف ہو گی جن کی اساس سہولت، آسانی اور دفع ضرر و فساد کے اصولوں پر رکھی گئی ہے تاکہ (شریعت کا) نظام احسن و اعلیٰ احکام پر قائم رہے"۔

---

[1] ۔ یہ حدیث ابو داؤدؒ نسائیؒ اور احمدؒ نے نقل کی ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۷/ ۱۵۵

[2] ۔ اعلام الموقعین ۳/۳ : ۱۲

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء مذہب نے بے شمار مقامات پر مجتہد (مذہب) کے ایسے اقوال سے اختلاف کیا ہے جن کی اساس اس کے زمانے کے حالات پر رکھی گئی تھی، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر مجتہد مذہب ان کے زمانے میں ہوتا تو اپنے مذہب کے قواعد کے مطابق وہی کہتا جو وہ کہتے ہیں[1]

ج۔ علاوہ ازیں اس مسئلے کے حل میں استحسان کے اصول سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے جسے حنفی فقہاء استحسان الضرورۃ کہتے ہیں اور وہ یہ کہ دلیل کے مقتضی کو چھوڑ کر اقتضائے ضرورت کے مطابق مخالف حکم کو لے لیا جائے تاکہ حصول انصاف وعدالت کا مقصد پورا ہو اور لوگوں کو حرج ومشقت کا سامنا نہ کرنا پڑے نیز معاملات میں وسعت وسہولت کے پہلو کو ترجیح حاصل ہو۔ یا جب کہ مصلحت اور عدل اس کا تقاضا کرتا ہو یا مشکل امر کو چھوڑ کر آسان امر کو اختیار کرنا پیش نظر ہو۔ یہی وہ اصول ہے جس کے مطابق حضرت عمرؓ نے "مسئلہ مشترکہ" میں فیصلہ کیا تھا۔

اسی اصول کے تحت اجیر کو جس کے قبضے میں لوگوں کے اموال حفاظت کی غرض سے رکھے گئے ہوں۔ ان کے ضائع ہونے کی صورت میں ضامن قرار دیا گیا حالانکہ معروف قاعدہ یہ ہے کہ: "امانت رکھنے والے پر کوئی ضمان (تاوان) نہیں"۔

قاعدہ استحسان کی حمایت میں لوگ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات کریمہ سے استدلال کرتے ہیں:

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ط (۳۹: ۱۸)

(سو تو خوشی سنا دے میرے بندوں کو جو سنتے ہیں بات پھر چلتے ہیں اس پر جو اس میں نیک ہے)

فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا (۷: ۱۴۵)

(سو پکڑ لے ان کو زور سے اور حکم کر اپنی قوم کو کہ پکڑے رہیں اس کی بہتر باتیں)

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الزمر: ۵۵)

(چلو تم بہتر بات پر جو اتری تم پر تمہارے رب کی طرف سے)

اس سلسلے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مندرجہ ذیل ارشاد بھی ان کے قول کی ایک بنیاد ہے:

[1] ۔ المدخل صفحہ ۵،

مَارَآهُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ۔[1]

(جو چیز مسلمانوں کے نزدیک پسندیدہ ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی پسندیدہ ہے۔)

مذکورہ بالا دلائل کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا کوئی امر مانع قطعاً موجود نہیں جس کے باعث ہدی کا یوم نحر سے پہلے ذبح کرنا جائز نہ ہو۔[2]

تاہم یہاں اس امر کی جانب اشارہ کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ اس رائے کو اختیار کرنے کی صورت میں بعض مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اور وہ اس لیے کہ چونکہ حجاج کرام مختلف مذاہب فقہ سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فقہی مسلک کے بارے میں بہت زیادہ متشدد ہوں اور اپنی ہدی یوم نحر سے پہلے ذبح نہ کریں اور ظاہر ہے کہ کسی حاجی کو اپنا جانور اس وقت ذبح کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جسے وہ پسند نہ کرتا ہو الّا یہ کہ فتویٰ صرف اسی قول کے مطابق جاری ہو جائے۔

ثانیاً۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ان مقاماتِ مقدسہ میں گوشت کے کارخانے لگا کر اس مسئلے کو حل کیا جا سکے؟ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ منیٰ کے مقام پر گوشت وغیرہ کی تیاری کے لیے کارخانہ لگانا خلاف شرع ہے، نہ کوئی ایسی رائے کی حمایت کر سکتا ہے۔ بلکہ سب یہی کہیں گے کہ منیٰ کے مقام پر ایسا کارخانہ لگانا ضروری ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس قسم کے متعدد کارخانے بھی تین دن کے اندر اندر وہاں ذبح ہونے والے تمام جانوروں کے گوشت کو بنانے کا کام مکمل نہ کر سکیں گے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمارا مقصد پورا نہ ہوگا، اس لیے کہ ان تین دن کے اندر وہاں اتنے جانور قربان کیے جاتے ہیں جن کا گوشت تیار کرنا ان کارخانوں کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں سال کے باقی ایام میں یہ

---

[1] دیکھیے محمد یوسف موسیٰ المدخل صفحہ ۱۸۹

[2] اس ضمن میں شیخ عبداللہ بن سلیمان بن منیع نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہدیٔ تمتع کے یوم نحر سے قبل ذبح کر لینے کے جواز پر ایک مختصر گفتگو ہے اس رسالے میں مصنف مذکور نے وضاحت سے یہ بیان کیا ہے کہ ایسا کوئی امر مانع موجود نہیں جس کے پیش نظر ان فقہا کا قول اختیار نہ کیا جا سکے جو ہدی تمتع کا یوم نحر سے پہلے ذبح کر لینا جائز سمجھتے ہیں۔ مصنف نے اپنی اس رائے کے حق میں بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں۔

کارخانے بیکار پڑے رہیں گے[١]

چنانچہ ہماری رائے میں بہتر یہ ہوگا کہ:

١۔ مکہ مکرمہ اور منیٰ کے درمیان بہت سے مذابح قائم کئے جائیں جو مکے سے قریب تر ہوں۔

٢۔ اس سلسلے میں جملہ انتظامات کی نگرانی ان مقامات مقدسہ کے ذمہ دار حکام کے سپرد کی جائے اور وہی اس امر کا اطمینان حاصل کرنے میں قصابوں کی مدد کریں کہ کون سا جانور ذبح کرنے کے لائق ہے اور کون سا نہیں تاکہ صرف ایسے جانور ذبح کئے جائیں ان کی کھال اتاری جائے اور گوشت صاف کیا جائے جو ہر لحاظ سے صحت مند اور قربانی کے لائق ہوں۔

٣۔ فقراء اور مساکین وغیرہ کو اس امر کی اجازت دی جائے کہ وہ ان ذبح خانوں سے جتنا گوشت اور کھالیں وغیرہ چاہیں لے لیں۔ اور ایسی خصوصی موٹروں کا انتظام ہونا چاہیے جن کے ذریعے وہ اپنا گوشت اور کھالیں اپنے گھروں کو لے جا سکیں۔

٤۔ اس کے بعد جو گوشت، چربی اور کھالیں وغیرہ بچ رہیں، وہ اور کھالوں کی قیمت فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دی جائے۔ یا دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حکومت وہاں اتنی تعداد میں کارخانے قائم کرے جو تمام ذبح شدہ جانوروں کا گوشت تیار کرنے کے لئے کافی ہوں، خواہ اسے برف میں لگایا جائے یا سکھایا جائے یا ڈبوں

---

[١] شیخ عبداللہ بن سلیمان نے ذکر کیا ہے کہ مکہ مکرمہ کے امین نے مفتی دیار سعودیہ کو جو خط بھیجا اس میں کہا گیا تھا کہ اگر گوشت کو خشک اور محفوظ کرنے کا کوئی کارخانہ لگانا ممکن ہوا تو وہ ان کارخانوں سے بہت بڑا ہوگا جو بیرونی ممالک میں کام کر رہے ہیں اس لئے کہ یہ کارخانے ایک گھنٹے میں تین سو سے زیادہ ذبیحوں کا گوشت تیار نہیں کر سکتے۔ حالانکہ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، ہمارے ہاں ایام نحر کے تین دنوں میں فی گھنٹہ چار ہزار سے زیادہ جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ شیخ عبداللہ بن سلیمان اس کے بعد مزید لکھتے ہیں: "میں امین موصوف کے بیان پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یوم نحر اور اس کے بعد تین دن تک ایام تشریق میں منیٰ کے مقام پر جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں ان کی تعداد دس ہزار فی گھنٹہ سے زیادہ ہوتی ہے اور یہ اس صورت میں ہے جب کہ رات کو قربانی نہیں کی جاتی

میں بند کیا جائے۔ اور پھر یہ تمام گوشت حرم شریف کے فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دیا جائے۔ سال کے باقی ایام میں بھی ان کارخانوں کا یہی کام ہو کہ وہ گوشت کو سکھائیں یا ڈبوں میں بند کریں تاکہ باہر سے گوشت درآمد کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حرم میں ذبح شدہ ہدی کے گوشت کو تیار کرنے کے بعد فقراء حرم کے سوا دوسرے فقراء اور مساکین میں تقسیم کرنا جائز ہے؟

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے جو اپنے بندوں کے احوال سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان قربانیوں کے متعلق حکم دیا ہے کہ انہیں مکہ مکرمہ کے بلد امین میں ذبح کیا جائے تاکہ اصلاً یہ قربانیاں اس بلد کریم کے فقراء اور مساکین یا ان لوگوں کی دسترس اور پہنچ میں رہیں جو اس مبارک و مطہر سرزمین کے رہنے والے ہیں۔ یہ صرف انہی کا حق ہیں اور یہ امر جائز نہیں کہ انہیں کسی اور شہر میں لے جایا جائے۔ الّا یہ کہ ہمیں اس امر کا قطعی یقین حاصل ہو جائے کہ فقراء مکہ کے پاس کافی گوشت پہنچ چکا ہے اور اب وہ اس سے بالکل مستغنی ہو گئے ہیں۔ یہ رائے ان فقہاء کے قول کی بنیاد پر اختیار کی گئی ہے جو مصلحت کے پیش نظر زکوٰۃ کو زکوٰۃ دینے والے کے شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کرنا جائز سمجھتے ہیں۔

المغنی میں لکھا ہے:

"ہمارا (مذہب (حنبلی) یہ ہے کہ صدقہ کو اس کے شہر سے مسافت قصر تک منتقل کرنا جائز نہیں ابو داؤد کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ کے بارے میں سنا کہ جب ان سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ کیا زکوٰۃ کو اس کے شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو انہوں نے فرمایا:

"نہیں" (یعنی ایسا کرنا جائز نہیں)

کہا گیا اگر دوسرا شہر پہلے کے قریب ہی ہو تب بھی؟

فرمایا: "تب بھی نہیں"۔

اکثر اہل علم نے اس امر کو مستحب قرار دیا ہے کہ زکوٰۃ کو اس کے شہر سے دوسرے شہر میں منتقل نہ کیا جائے۔

پھر فرمایا: اگر (صدقہ یا زکوٰۃ کے) شہر کے فقراء اس سے مستغنی ہوں تو اسے منتقل کرنا جائز ہے امام احمدؒ نے یہی رائے اختیار کی ہے اور کہا ہے کہ: "اگر فقراء نہ ہوں اور صدقہ (یا زکوٰۃ) ان کی ضرورت سے زیادہ ہو تو امام کے حوالے کر دیا جائے"۔[1]

امام نوویؒ لکھتے ہیں:

"الفتاوی میں قاضی حسین نے کہا ہے کہ اگر حرم پاک میں فقراء و مساکین نہ ملیں تب بھی قربانی کو دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں۔ خواہ ہم نے زکوٰۃ کو منتقل کرنا جائز قرار دیا ہو یا نہ قرار دیا ہو۔ کیونکہ قربانی مساکین حرم ہی کے لئے واجب ہوئی ہے۔ جیسے اگر کسی شہر کے مساکین کے لئے صدقے کی نذر مانی جائے اور وہاں مساکین نہ ملیں تو انتظار کیا جائے یہاں تک کہ وہ مل جائیں۔ لیکن اس کا (دوسرے شہر میں) منتقل کرنا جائز نہیں۔ بخلاف زکوٰۃ کے کہ اس کے بارے میں دو اقوال میں سے ایک کے مطابق اس کے شہر سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے، اس لئے کہ اس کے متعلق کوئی ایسی نص صریح موجود نہیں جو اسے اس کے شہر سے مخصوص کرتی ہو۔ بخلاف ہدی کے"۔[2]

المغنی میں لکھا ہے:

"جس (قربانی) کا (جہاں) نحر کرنا واجب ہے اس کا گوشت بھی وہیں تقسیم کرنا واجب ہے"۔

امام شافعیؒ نے بھی یہی کہا ہے۔ لیکن حضرت امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اگر قربانی کو حرم میں ذبح کیا گیا تو اس کا گوشت حل (حرم سے باہر کے مقامات) میں تقسیم کرنا جائز ہے"۔[3]

---

[1] - المغنی ٢/٦٧١-٦٧٢ حالیہ میں مجھے بتایا گیا ہے کہ عنقریب یہ مسئلہ شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کے سپرد کر دیا جائے گا۔ جو اسے حل کرے گی امید ہے کہ یہ مسئلہ جو ایک طویل عرصے سے بڑی بڑی بحثوں کا موضوع بنا چلا آرہا ہے فی الواقع مذکورہ یونیورسٹی کے سپرد کر دیا جائے گا اور وہ اسے حل کرے گی۔

[2] - المجموع ٧/١٣م

[3] - المغنی ٣/٥٤٦

پانچواں باب

عقیقہ

یہ باب سات فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل

عقیقہ کی تعریف ، اس کا حکم اور اس کے مشروع کئے جانے کی حکمت

عقیقہ کی تعریف :

صاحب المحکم لکھتے ہیں :

"کہا جاتا ہے : عق (عین کے زیر اور پیش کے ساتھ) عن ولدہ (یعنی اس نے اپنے بچے کا عقیقہ کیا" [1]

لغت میں عق کے اصل معنی کاٹنا یا پھاڑنا ہیں اور عقیقہ کو بھی عقیقہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں بچے کے سر کے بال مونڈنے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

بچے کے سر پر ماں کے پیٹ میں جو بال اُگ آتے ہیں انہیں بھی عقیقہ کہا جاتا ہے۔

امام زمخشریؒ نے عقیقہ کے اصل معنی بالوں اور اس ذبیحہ کے لئے ہیں جو اس موقع پر کیا جاتا ہے۔ [2]

ابو عبید نے لکھا ہے :

عقیقہ کے اصل معنی اُن بالوں کے ہیں جو مولود پر ہوتے ہیں اور جن کی جمع عقائق آتی ہے۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے :

اباهند لا تنكحي بوهة ــــ عليه عقيقته أحسبا

---

[1] - دیکھئے المجموع ۸/۳۲۰

[2] - عون المعبود ۸/۳۴

پھر جیسا کہ عربوں کی عادت ہے کہ وہ اشیاء کے نام ان کے سبب یا کسی قریبی چیز کے نام پر رکھ لیتے ہیں، انہوں نے بچے کے بال منڈوانے کے وقت کئے جانے والے ذبیحے کو عقیقہ کہنا شروع کر دیا، پھر یہ نام مشہور ہو کر اسم معرف بن گیا اور اس میں عقیقہ کے معنی غالب آگئے چنانچہ اب اس سے مطلق طور پر وہ ذبیحہ مراد لیا جاتا ہے جو ایک خاص موقع پر کیا جائے۔

ابن عبد البر کہتے ہیں کہ امام احمدؒ نے اس تفسیر کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ: "عقیقہ سے مراد خود ذبیحہ ہے" یہ بھی کہا گیا ہے کہ عقیقہ سے مراد خوردہ کھانا ہے جو اس خاص موقع پر دیا جائے۔[1]

عقیقہ کا حکم:

جمہور فقہاء کا جن میں ائمہ ثلاثہ یعنی حضرت امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ شامل ہیں، مذہب یہ ہے کہ عقیقہ کرنا سنت ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا ہے۔

لیکن حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کی رو سے عقیقہ کرنا نہ سنت ہے نہ واجب بلکہ ایک نفلی عمل ہے۔

مذہب ظاہریہ کے مطابق عقیقہ واجب ہے، اور یہی حسن نے کہا ہے۔[2]

چنانچہ جو فقہاء عقیقہ کو سنت قرار دیتے ہیں وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے احتجاج کرتے ہیں کہ جب آپؐ سے عقیقہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ العقوق (نافرمانی) کو پسند نہیں فرماتے، چنانچہ جس کے ہاں بچہ پیدا ہو اور وہ اپنے بچے کی طرف سے قربانی کرنا چاہے تو کرے"۔[3]

---

[1] - المغنی ۸/۴۴۴

[2] - دیکھئے بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۸ - الافصاح ۱۵۰

[3] - یہ حدیث امام ابو داؤدؒ نے روایت کی ہے دیکھئے عون المعبود ۸/۴۲

حدیثِ مذکورہ بالا میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیقہ کے حکم کو خواہش سے متعلق فرمایا کہ جو چاہے کرے اس سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ عقیقہ کرنا واجب نہیں اور اس لئے بھی کہ عقیقہ میں جو جانور قربان کیا جاتا ہے وہ نہ تو کسی گناہ کا کفارہ ہوتا ہے اور نہ کوئی نذر[1]

لیکن جو فقہاء اسے واجب سمجھتے ہیں وہ حضرت سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: "ہر لڑکا اپنے عقیقہ کا مرتہن (پابند گرو) ہوتا ہے جو اس کی جانب سے اس کی پیدائش کے ساتویں دن کیا جاتا ہے اور اس سے تکلیف و اذیت کو دور کر دیتا ہے۔"[2]

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے ہے کہ عقیقہ میں جانور کا قربان کرنا اس کی قیمت صدقہ میں دینے سے افضل ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "اگر کسی کے پاس اتنے پیسے نہ ہوں جن سے وہ عقیقہ کر سکے تو اسے چاہیے کہ قرض لے لے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ اسے اس (نومولود) پہ اچھا بیٹا دے گا۔"

ابن المنذر کہتے ہیں: "امام احمد نے صحیح فرمایا، اس لئے کہ سنت کا زندہ رکھنا اور اس کی پیروی کرنا افضل ہے۔"

جو احادیث ہم نے روایت کی ہیں اُن میں عقیقہ کی اتنی تاکید آئی ہے کہ اتنی کسی اور چیز کی نہیں آئی اور اس لئے بھی کہ یہ ایسا ذبیحہ ہے جس کا حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا۔ پس اس کا وہی درجہ ہے جو ولیمے اور قربانی کا۔ یہ مذہب امام شافعیؒ کا ہے۔[3]

حق یہ ہے کہ اس مسئلے میں جمہور کا قول یعنی عقیقہ کرنا سنت ہے، زیادہ قوی ہے اس لئے کہ ان کی دلیلیں قطعی اور وجوب کے خیال کو رد کرنے والی ہیں۔

---

[1] - دیکھئے المہذب امام نووی کی شرح کے ساتھ ۸/۴۲۵

[2] - یہ حدیث امام ابو داؤد، احمدؒ اور ترمذی نے روایت کی ہے۔ امام حاکمؒ نے اسے صحیح بتایا ہے۔ امام مالکؒ نے اسے اپنی المؤطا میں نقل کیا ہے۔ امام بیہقی نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ دیکھئے المجموع ۸/۴۲۶۔

[3] - دیکھئے المغنی ۸/۶۴۵۔ المجموع ۸/۴۳۲

عقیقے کو مشروع کرنے کی حکمت:

بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا انعام اور فضل فرمانے والے ہیں۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک آن میں ان کی جن نعمتوں اور الطاف و عنایات کا ہم پر نزول ہوتا ہے ان کا ہم شمار تو کیا احساس تک کرنے سے قاصر ہیں۔ ان نعمتوں میں سے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی اور عظیم نعمت یہ ہے کہ انسان کے گھر بچہ پیدا ہو جس سے وہ فرحت و سرور حاصل کرے جو اس کی زندگی کی زینت اور اس کا سہارا بنے۔ جو اس کے سامنے کھیلے کودے، ہنسے بولے فرحاں و شاداں ہو جس سے گھر والوں کے دل خوشی و مسرت کے رس اور جذبات سے لبریز ہو جائیں اور مستقبل میں وہ بچہ معاشرے میں ان کے لئے باعثِ عزت و شان ہو۔

چنانچہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ منعم و متفضل کا شکر ادا کرنے اور اس کے فضل و احسان کا اعتراف کرنے کے لئے یہ بات بڑی موزوں اور مناسب ہے۔ کہ بچے کا ولی الامر اس مبارک و مسعود موقع پر اللہ رب العزت کی بارگاہ عالی میں ایک یا دو جانوروں کی قربانی کا ہدیہ پیش کرے۔

اس کے علاوہ عقیقہ کی تقریب کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ فقراء، مساکین، پڑوسی، دوست احباب اور اہل خانہ سب مل کر خوشی مناتے ہیں اور سب کے دل ایک دوسرے کے لئے محبت و الفت اور خیر سگالی کے جذبات سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

اس گزارش سے یہ حقیقت بڑی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی شریعت میں اُمت کریمہ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے جو فرائض، واجبات، سنتیں اور دیگر قوانین مقرر کئے گئے ہیں ان کے پیچھے کیسی کیسی حکمتیں کام کر رہی ہیں۔

دوسری فصل

عقیقہ کرنے والے سے متعلق احکام

مذہب شافعیؒ کی رو سے بچے کا عقیقہ اس شخص کو اپنے مال سے کرنا چاہیئے جس پر بچے کا نفقہ واجب ہو نہ کہ بچے کے مال سے چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر بچے کے مال سے عقیقہ کیا گیا تو عقیقہ کرنے والے کو اس کا ضمان (تاوان) ادا کرنا پڑے گا اگر منفق (یعنی بچے کا خرچ اٹھانے والا) عقیقہ کرنے سے عاجز ہو لیکن بچے کی پیدائش سے سات دن کے اندر اندر اس کے پاس اتنا مال آجائے کہ وہ عقیقہ کر سکے تو اس کے لئے مستحب ہے کہ عقیقہ کرے۔ لیکن اگر اسے مال سات دن کے بعد ملے تو عقیقہ اس سے ساقط ہو جائے گا

اگر کہا جائے کہ تم یہ کیسے کہتے ہو کہ عقیقہ اس شخص کو کرنا چاہیئے جس پر بچے کا نفقہ لازم ہو، حالانکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن اور حسینؓ کا عقیقہ کیا جن کا نفقہ آپؐ پر لازم نہ تھا۔

تو اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ اس روایت کی تاویل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد کو عقیقہ کرنے کا حکم دیا ہوگا یا انہیں اتنی رقم دی ہوگی جس سے وہ عقیقہ کر سکیں یا یہ کہ اس وقت ان کے والد (یعنی حضرت علیؓ) تنگ دست ہوں گے اور وہ دونوں اپنے ناناؐ کے زیر کفالت ہوں گے۔[1]

جہاں تک نیت کا تعلق ہے تو تمام فقہاء کے نزدیک عقیقہ کی نیت کرنا شرط ہے، اگر بغیر نیت کے عقیقہ کیا گیا تو دوبارہ کرنا پڑے گا۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ عقیقہ کا جانور ذبح کرتے وقت تسمیہ کہنا (یعنی بسم اللہ پڑھنا) کیسا ہے تو اس مسئلے میں فقہاء کی آراء بڑی تفصیل کے ساتھ پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔

مستحب یہ ہے کہ عقیقے کا جانور ذبح کرتے وقت کہا جائے۔

---

[1] ۔ دیکھئے المجموع ۸/۴۳۰

اَللّٰهُمَّ لَكَ وَاِلَيْكَ عَقِيْقَةُ فُلَانٍ۔

(اے اللہ فلاں کا یہ عقیقہ آپ ہی کی عطا سے ہے اور صرف آپ ہی کی رضا کے لئے ہے)

جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی حدیث میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن اور حسین (رضی اللہ عنہما) کا عقیقہ کیا تو فرمایا۔

بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ لَكَ هٰذِهٖ عَقِيْقَةُ ....[1]

(اللہ کے نام سے اور اللہ سب سے بڑا ہے اے اللہ فلاں کا یہ عقیقہ صرف آپ کی رضا کے لئے ہے)

---

[1] ۔ یہ حدیث امام بیہقی نے حسن اسناد کے ساتھ روایت کی ہے۔ دیکھئے نیل الاوطار ۵/۱۵۱

تیسری فصل

عقیقہ کس کا کیا جائے اور کتنی بکریاں ذبح کی جانی چاہئیں

جمہور فقہاء کی رائے ہے کہ عقیقہ صرف چھوٹے بچوں کا کرنا چاہیئے، خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ذبح کی جائیں اور لڑکی کی طرف سے ایک۔ اس مسئلے میں الحسن نے سب سے الگ رائے اختیار کی ہے اور کہا ہے کہ لڑکی کا عقیقہ نہیں کرنا چاہیئے۔

ظاہریہ کی رائے ہے کہ بڑی عمر کے لوگوں کا بھی عقیقہ کرنا چاہیئے۔ یہ اس کے ذمہ ایک فرض ہے یہاں تک کہ وہ اسے پورا کرنے کے قابل ہو جائے [1]

بعض فقہاء کی یہ رائے ہے کہ عقیقہ صرف چھوٹے بچوں کا کرنا چاہیئے وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں کہ: ذبح کی جاتی ہے (عقیقہ کی بکری) بچے کی پیدائش کے ساتویں دن [2]۔ یعنی بچے کی جانب سے ذبح کی جاتی ہے جب کہ وہ چھوٹا ہوتا ہے۔

اور جو فقہاء یہ سمجھتے ہیں کہ عقیقہ بڑوں کا بھی کرنا چاہیئے، وہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ: "حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عقیقہ نبی مبعوث ہونے کے بعد کیا"۔

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث باطل ہے اور امام بیہقیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے کیونکہ اس میں ایک راوی عبداللہ بن محرر ہے جو ضعیف ہے۔ اس کے ضعیف ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے [3]

---

[1]۔ دیکھئے بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۹۔ المحلی ۷/۵۲۳

[2]۔ یہ حدیث صحاح کی پانچ کتابوں میں روایت کی گئی ہے اور امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے دیکھئے نیل الاوطار ۵/۱۴۹

[3]۔ دیکھئے المجموع ۸/۴۳۰

جو فقہاء یہ سمجھتے ہیں کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرنی چاہیئے وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں کہ: "لڑکی کی طرف سے ایک بکری اور لڑکے کی طرف سے دو بکریاں"۔

اور جس نے یہ کہا کہ لڑکی کا عقیقہ نہیں کرنا چاہیئے اس نے درج ذیل حدیث پاک سے احتجاج کیا ہے کہ:

كلّ غلامٍ مرهون بعقيقته

(ہر لڑکا اپنے عقیقہ کا مرہون (پابند) ہوتا ہے)

اور کہا ہے کہ لفظ غلام کا اطلاق لڑکے پر ہوتا ہے نہ کہ لڑکی پر۔

جہاں تک عقیقہ میں ذبح کئے جانے والے جانوروں کی تعداد کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لڑکے اور لڑکی میں کوئی فرق نہیں، دونوں کی طرف سے ایک ایک بکری ذبح کی جائے گی۔ یہ مذہب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہے۔

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک لڑکے کی طرف سے دو اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے گی۔ لیکن اگر لڑکے کی طرف سے بھی ایک بکری ذبح کر دی جائے تو سنت پوری ہو جائے گی۔

اگر اونٹ یا گائے میں سات آدمی شریک ہوں تو جائز ہے، خواہ ان سب کی نیت عقیقہ کرنے کی ہو، یا ان میں سے کچھ کی نیت عقیقہ کرنے کی ہو اور کچھ صرف گوشت حاصل کرنا چاہتے ہوں۔[1]

جن فقہاء کی یہ رائے ہے کہ عقیقہ کے مسئلے میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان کوئی فرق نہیں، دونوں کی جانب سے ایک ایک بکری ذبح کی جائے گی، ان کی دلیل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل حدیث ہے کہ: آپ نے حضرت حسن اور حسین (علیہما السلام) کا عقیقہ کیا تو دونوں کی جانب سے ایک ایک مینڈھا ذبح کیا۔[2]

جن فقہاء نے اس مسئلے میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان فرق کیا ہے وہ حضرت اُمّ کرز الکعبیہ سے مروی اس حدیث سے احتجاج کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ: میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] دیکھئے المجموع ۳۳۰/۸

[2] یہ حدیث امام ابوداؤد نے روایت کی ہے۔ دیکھئے عون المعبود ۴۱/۸

کو عقیقہ کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ:

عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُتَكَافِئَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ۔[1]

(لڑکے کی طرف سے برابر کی دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری)

خطابی فرماتے ہیں کہ یہاں برابری سے مراد عمر میں برابری ہے۔ چنانچہ ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ ایک تو مُسن ہو اور دوسری چھوٹی عمر کی، بلکہ دونوں اتنی عمر کی ہونی چاہئیں جن کی (عید الاضحیٰ کے موقع پر) قربانی دینا جائز ہو۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں برابری سے مراد یہ ہے کہ دونوں بکریوں کو ایک دوسری کے بالمقابل ذبح کیا جائے۔ یہ بات المسبل میں کہی گئی ہے۔

زید بن اسلم نے کہا ہے کہ برابری سے مراد یہ ہے کہ دونوں ایک دوسری سے متشابہ ہوں اور دونوں کو ایک ساتھ ذبح کیا جائے نہ کہ ایک دوسری کے بعد۔

امام زمخشری کی رائے ہے کہ یہاں "برابر" سے مراد یہ ہے کہ دونوں متعادل (یعنی یکساں) ہوں جیسا کہ زکوٰۃ اور قربانی کے جانوروں کے بارے میں اس امر کا خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ یکساں ہوں۔[2]

---

[1] - یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حبان میں روایت کی گئی ہے۔ دیکھئے عون المعبود ۸/۴۲

[2] - دیکھئے عون المعبود ۸/۴۲

چوتھی فصل

عقیقے میں ذبح کیے جانے والے جانور

جمہور فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ عقیقے میں بھی صرف انہی جانوروں کا ذبح کرنا جائز ہے جن کا ذبح کرنا عید الاضحیٰ کی قربانی میں جائز ہے یعنی اونٹ، گائے اور بھیڑ بکریاں۔

امام مالکؒ کے نزدیک عقیقے میں بھیڑ کا ذبح کرنا افضل ہے کیونکہ اس کا گوشت عمدہ ہوتا ہے۔ لیکن امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک قربانی کی طرح عقیقہ میں بھی سب سے افضل اونٹ ہے، پھر گائے اور پھر بھیڑ بکری اس لئے کہ اونٹ اور گائے میں گوشت زیادہ نکلتا ہے۔

اس مسئلے میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ اس ضمن میں وارد احادیث اور قیاس میں معارضہ پایا جاتا ہے کیونکہ ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن اور حسین (علیہما السلام) کا عقیقہ کیا تو اس میں دونوں کی طرف سے ایک ایک مینڈھا ذبح فرمایا۔[1]

اور دوسری روایت میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ: لڑکی کی طرف سے ایک بکری اور لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ہیں۔[2]

لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ اگر عقیقہ کے جانوروں کو ہدایا پر قیاس کیا جائے تو بڑے جانور کا ذبح کرنا افضل ہے۔[3]

---

[1] - اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ دیکھئے عون المعبود ۸/۴۱

[2] - یہ حدیث بھی امام ابو داؤد نے روایت کی ہے۔ دیکھئے عون المعبود ۸/۲۴

[3] - دیکھئے بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۹

پانچویں فصل

عقیقے کا وقت

جمہور فقہاء (جن میں ائمہ ثلاثہ یعنی حضرت امام مالک، شافعی اور احمد (رضوان اللہ علیہم) شامل ہیں۔ اس امر پر متفق ہیں کہ بچے کا عقیقہ اس کی پیدائش کے ساتویں دن کرنا افضل ہے۔ اگر ولادت کے بعد یا ساتویں روز سے پہلے جانور ذبح کیا تو جائز ہے۔ لیکن امام مالک (ان سات دنوں میں) اس دن کو شمار نہیں کرتے جس دن بچہ پیدا ہوا ہو۔ امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ جانور دن میں ذبح کیا جائے یا رات کو امام مالک فرماتے ہیں کہ: "قربانی اور ہدایا پر قیاس کرتے ہوئے رات کو ذبح کرنا جائز نہیں"۔

اس امر پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر بچے کی پیدائش سے پہلے جانور ذبح کیا گیا تو جائز نہیں۔

اس مسئلے میں فقہاء کا اختلاف رائے ہے کہ اگر عقیقہ ساتویں روز سے مؤخر کیا گیا تو کیا حکم ہے؟ امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے عقیقہ کا وقت فوت نہیں ہوتا بلکہ بالغ ہونے سے پہلے تک جاری رہتا ہے۔ رافعی کہتے ہیں کہ اگر عقیقہ کو مؤخر کیا گیا یہاں تک کہ بچہ بالغ ہو گیا تو اس اب اس کا وقت فوت ہو گیا۔ امام احمدؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔

اگر بچہ سات دن کے بعد اور ایسی صورت پیدا ہو جانے کے بعد مر گیا کہ اس کا عقیقہ کرنا ممکن تھا تو اس مسئلے میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں جن میں سے صحیح تر قول کے مطابق مستحب یہ ہے کہ اس کا عقیقہ کیا جائے[1]

---

[1] دیکھئے المجموع ۸/۴۳۰ - بدایۃ المجتہد ۱/۴۴۹ - المغنی ۸/۶۴۶

چھٹی فصل

عقیقہ کے جانور کی عمر اور صفات

- عقیقہ کے صحیح ہونے کی یہ شرط ہے کہ جانور اپنی عمر اور دیگر صفات کے لحاظ سے وہ تمام شرائط پوری کرتا ہو جن کا پورا کرنا قربانی کے جانور کے لئے ضروری ہے [1]

اسی طرح عقیقہ میں ذبح کئے جانے والے جانور کے گوشت، کھال اور دیگر اجزاء کا بھی وہی حکم ہے جو قربانی کے جانور کے گوشت، کھال اور دیگر اجزاء کا ہے۔ یعنی ان میں سے کسی چیز کا بیچنا جائز نہیں عقیقہ کا گوشت عقیقہ کرنے والا خود کھا سکتا ہے۔ صدقہ کر سکتا ہے اور کسی کو ہدیۃً دے سکتا ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ آیا عقیقہ کے گوشت کو پکا کر تقسیم کرنا افضل ہے یا بغیر پکائے۔

شافعیہ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ اُسے پکا کر فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہی امام احمدؒ کا مذہب ہے۔

اگر عقیقہ کا گوشت پکایا جائے اور لوگوں کو اس کے کھانے کی دعوت دی جائے تو اس میں کوئی چیز مانع نہیں۔

ولیمہ کی دعوت قبول کرنا

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

وَإِذَا دُعِيتُمْ فَأَجِيبُوا

جب تمہیں دعوت دی جائے تو اُسے قبول کرو

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرو، ہدیہ کو نہ لوٹاؤ اور مسلمانوں کو دُور نہ کرو۔" [2]

---

[1] - یہ روایت امام احمد اور بزاز، نیز طبرانی نے الکبیر میں نقل کی ہے۔

[2] - اس حدیث کو امام طبرانی نے الکبیر میں روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔ دیکھئے مجمع الزوائد۔ ۵۲/۴

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم میں سے کسی کو کھانے کی دعوت دی جائے تو اسے چاہیئے کہ قبول کرلے پس اگر روزہ سے نہ ہو تو کھائے، روزہ سے ہو تو برکت کی دعا دے۔[۱]

بُرا کھانا

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بُرا کھانا ولیمہ کا وہ کھانا ہے جس میں اغنیاء کو دعوت دی جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے۔[۲]

حضرت ابن عباسؓ ہی سے مروی ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے اُن آباء (واجداد) پر فخر نہ کرو جو جاہلیت میں مرگئے۔ کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ تمہارے جاہلیت میں مرنے والے آباء کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ نے برسرِ راہ ایک محل تعمیر کروایا اور اس کی خوشی میں کھانا دیا۔ کھانا منتظمین کے سپرد کرتے ہوئے بادشاہ نے ان سے کہا: "کوئی شخص کھانا کھائے بغیر یہاں سے نہ گزرے" چنانچہ اگر کوئی صاحب حیثیت آدمی اچھے کپڑے پہنے وہاں سے گزرتا تو منتظمین اس کے پاس جاتے اور بااصرار اسے لے کر آتے اور کھانا کھلاتے۔ لیکن اگر کوئی معمولی حیثیت کا آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے وہاں آتا تو اُسے پاس بھی نہ پھٹکنے دیتے۔ جب بہت دیر تک یہ صورتِ حال جاری رہی تو اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا جو بڑی ردّی حالت میں بوسیدہ لباس پہنے ہوئے ان کے پاس آیا۔ اسے دیکھ کر یہ لوگ اُٹھے اور اُسے وہاں سے بھگا دیا۔ اس نے بہترا کہا میں بھوکا ہوں اور کھانا بھوکوں ہی کے لئے تیار کیا جاتا ہے لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور کہا: "بادشاہ کا کھانا صرف شرفاء ہی کھا سکتے ہیں" جب انہوں نے اُسے دھتکار دیا تو وہ چلا گیا۔ لیکن پھر اچھی حالت میں عمدہ لباس، زیب تن کرکے آیا اور اُن سے دور دور بڑی لاپروائی کے ساتھ اس طرح گزرا جیسے اسے اُن لوگوں سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ لیکن یہ لوگ اُس کے پاس پہنچے اور اصرار کرنے لگے: "تشریف لائیے، کھانا

---

[۱] اس حدیث کو امام طبرانی نے الکبیر میں روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں، دیکھئے مجمع الزوائد ۴/۵۲

[۲] - اس حدیث کو بزار اور طبرانی نے الکبیر اور الاوسط میں نقل کیا ہے دیکھئے مجمع الزوائد ۴/۵۲

تناول کیجئے۔ اس نے کہا "مجھے خواہش نہیں"۔ بولے: "بادشاہ آپ کو نہیں چھوڑے گا، اگر اُسے پتا چلا کہ آپ جیسا صاحب حیثیت باعزت آدمی یہاں سے گزرا اور اس نے کھانا نہیں کھایا تو اُسے یہ بات ناگوار گزرے گی۔ اور ہمیں ڈر ہے مبادا اس کوتاہی پر ہمیں سزا دے"۔ چنانچہ وہ اُسے مجبور کرکے لے آئے اور کھانے کے پاس بٹھا دیا۔ فرشتے نے اپنے کپڑوں سے مخاطب ہو کر کہا "کھاؤ"۔ یہ دیکھ کر وہ بولے: "یہ کیا کرتے ہو؟" فرشتے نے جواب دیا "میں تمہارے پاس بُری حالت میں پھٹے پرانے کپڑے پہن کر آیا اور تم سے کہا کہ میں بھوکا ہوں تو تم نے مجھے کھانا نہ دیا اور اب جب کہ میں اچھی حالت میں عمدہ لباس زیب تن کرکے آیا ہوں تو تم مجھ سے کھانے کے لئے اصرار کر رہے ہو۔ اللہ کرے تمہارا اور تمہارے بادشاہ کا بُرا ہو، اس نے یہ کھانا دنیا کے لئے تیار کروایا۔ چنانچہ اللہ کے ہاں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ پھر فرشتہ آسمانوں پر چلا گیا اور اُن لوگوں پر عذاب نازل ہوا۔[1]

---

[1] ۔ یہ حدیث امام طبرانی نے نقل کی ہے۔ اس کے ایک راوی سلیم باقلانی ہیں جن کے متعلق ابن عدی نے کہا ہے کہ: مجھے ان کی حدیث میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ لیکن امام نسائی نے کہا ہے کہ وہ متروک ہیں۔ دیکھئے مجمع الزوائد ۵۴/۴ ۔

ساتویں فصل

مولود سے متعلق احکام

سنت یہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے ساتویں دن اس کا عقیقہ کیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے اس کے لئے کوئی نام منتخب کیا جائے۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "تمہیں قیامت کے دن تمہارے اور تمہارے آباء کے ناموں سے پکارا جائے گا لہٰذا اپنے نام اچھے رکھو۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے نزدیک پسندیدہ ترین نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں [1]

نام رکھنے کے علاوہ یہ امر بھی سنت ہے کہ بچے کی پیدائش کے ساتویں دن اس کے سر کے بال مونڈ کر اس سے اذیت کو دور کیا جائے۔ جہاں تک قزع یعنی سر کے کچھ بال مونڈ دینے اور کچھ چھوڑ دینے کا تعلق ہے، تو یہ چیز حضرت ابن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) سے مروی ایک حدیث کے مطابق مکروہ ہے [2]

جمہور کے نزدیک یہ امر مکروہ ہے کہ عقیقہ کے جانور کا خون بچے کے سر پہ ملا جائے، جیسا کہ دورِ جاہلیت میں لوگ کرتے تھے۔ یہ قول حضرت امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کا ہے۔ لیکن الحسنؒ اور قتادہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اسے اچھا سمجھتے تھے۔ [3]

مندرجہ ذیل دلائل کے پیش نظر اس مسئلے میں جمہور کا قول اولیٰ ہے:

۱۔ حضرت بریدہ فرماتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں اگر ہم میں سے کسی کے گھر میں لڑکا پیدا ہوتا تو وہ ایک بکری ذبح کرتا اور اس کا خون بچے کے سر پہ مل دیتا۔ لیکن جب اسلام آیا تو ہم بکری ذبح کرتے

---

[1] ۔ دیکھئے المغنی ۸/۶۴۷

[2] ۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں روایت کی گئی ہے۔ دیکھئے المجموع ۸/۴۲۷

[3] ۔ دیکھئے المغنی ۸/۶۴۷

بچے کا سر مونڈتے اور اس پر زعفران مل دیتے۔

۲۔ ایک روایت میں جو الفاظ "وَیُدَمّیٰ" (اور خون بہا دے) آئے ہیں، امام داؤد نے اس کے بجائے الفاظ "وَیُسَمّیٰ" (یعنی بچے کا نام رکھا جائے) روایت کئے ہیں جو زیادہ صحیح ہیں۔ یہ ہمام کا وہم ہے جس نے کہا "یُدَمّیٰ"۔

۳۔ ایک دوسری حیثیت سے دیکھا جائے تو خون ناپاک ہوتا ہے اور ہمیں ناپاک چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۴۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ساتویں دن بچے سے اذیت کو دور کر دیا جائے پس یہ کیسے صحیح ہوگا کہ اس کے سر پر خون ملا جائے جو ایک تکلیف دہ چیز ہے۔[2]

---

[1] ۔ یہ حدیث ابوداؤد نے روایت کی ہے۔ دیکھئے المغنی ۸/۶۴۸، عون المعبود ۸/۳۸

[2] ۔ دیکھئے ابوداؤد کی شرح ابن قیم ۸/۳۹ مع عون المعبود، معالم السنن ۴/۲۸۷

خاتمہ

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا دینِ اسلام ایک کامل اور مکمل دین ہے جس کے تمام اوامر نواہی کے پیچھے بے شمار حکمتیں اور گہرے راز پوشیدہ ہیں اس کے جملہ احکام انسان کے اخلاق و کردار اور اس کی صحت کے لیے سرتاسر مفید اور اس کی زندگی کے لیے سراسر خیر و برکت اور رحمت ہیں۔ لہٰذا اگر اس نے انسانی سرگرمیوں پر بعض قیود عائد کی ہیں، بعض کاموں کے لیے کچھ خاص شرائط مقرر کی ہیں یا کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے تو اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسانِ مسلم کے مصالح پورے ہوں۔ خود انسان کی بھلائی اور فلاح و بہبود کے سوا ان تمام حدود و قیود کی قطعاً کوئی اور غرض و غایت نہیں۔ اگر اسلام نے مردار جانور، سؤر کے گوشت اور خون وغیرہ جیسی گندی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے تو اس کا مقصد انسان کی اعلیٰ اخلاقی قدروں اور صحت و تندرستی کو تباہی و بربادی سے بچانا ہے۔ ان چیزوں کے استعمال کا نتیجہ ہمیشہ مضرت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، خواہ وہ مضرت جسمانی ہو، یا نفسیاتی یا روحانی۔

جیسا کہ ہم نے گزشتہ اوراق میں واضح کیا، طب جدید نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ اسلام نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں سے ہر ایک ایسی ہے کہ اس کا استعمال متعدد امراض کا سبب بنتا ہے اسی طرح طب جدید کی رو سے یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ کریہہ المنظر کھانا استعمال کرنے سے انسان کی صحت اور نفسیات پر نہایت ناگوار اثر پڑتا ہے۔ اس کے برعکس خوش منظر کھانا انسان کی جسمانی صحت اور روحانی خوشی و مسرت میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے جانور ذبح کرنے کے اسلامی طریقے اور دیگر طریقوں کے درمیان جو موازنہ کیا ہے اس سے ہم پر یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہے کہ خواہ ہم اس مسئلے کا جائزہ انسان کی صحت کے نقطۂ نظر سے لیں یا جانوروں کے ساتھ رحمت و شفقت کا برتاؤ کرنا ہمارے پیش نظر ہو، دونوں صورتوں میں ہم یہ دیکھیں گے کہ ذبح کرنے کا اسلامی طریقہ ہی ان سب سے بہتر ہے۔

اسی طرح ہم پر یہ امر بھی واضح ہو گیا ہے کہ اسلام نے ہمارے لیے جو بعض ذبیحے، جیسے عید کی قربانی اور عقیقہ وغیرہ

مشروع قرار دیئے ہیں تو ان کے پیچھے ایک بڑی حکمت کام کر رہی ہے۔ یعنی یہ کہ ایسے مواقع پر انسان کے اعزا واقربا، پڑوسی اور فقراء ومساکین وغیرہ اس کی خوشی میں شریک ہوں اور سب مل کر فرحت ومسرت کے ساتھ اپنا وقت گزاریں۔

جہاں تک منیٰ کے مقام پر ہدی اور نذر کے جانور ذبح کرنے کا تعلق ہے تو اس کا مقصد فقرائے حرم کے رزق میں وسعت پیدا کرنا ہے تاکہ ان مبارک دنوں میں اُن کے دل بھی فرحت وسرور کی لذت سے آشنا ہو سکیں۔ اس لئے کہ ان دنوں وہاں دنیا بھر کے مسلمان جمع ہوتے ہیں ان کو جمع کرنے والا کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہوتا ہے وہ سب آپس میں ایک دوسرے کے دینی بھائی ہوتے ہیں اور اللہ واحد احد کی محبت پر جمع ہوتے ہیں۔ اس دینی واخوی تعارف کا ایک حصہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مباح کردہ کھانا تناول کیا جاتا ہے اور ان تمام مادی اور روحانی نعمتوں پر اس منعم ومتفضل کا شکر ادا کیا جاتا ہے۔

ایک اور حقیقت جو اس مطالعے کے دوران میں ہم پر واضح ہوئی، یہ ہے کہ اسلام نے کبھی کسی وقت بھی لوگوں کے مصالح کے راستے میں روڑے نہیں اٹکائے۔ بلکہ اس کے برعکس اس نے ہمیشہ لوگوں کے مصالح اور ان کی اہم ضرورتوں کا پاس کیا۔ جیسا کہ علامہ ابن قیمؒ اور دیگر علماء نے واضح کیا ہے۔ یہ دین نہیں بلکہ خود لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اوپر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر لی ہیں۔ جہاں تک اسلامی تعلیمات کا تعلق ہے وہ تو افراد اور جماعتوں کے لئے سراسر آسان، خیر اور برکت ہیں۔ اسلام کی حکیمانہ تعلیمات ہر زمان ومکان میں قابل عمل رہیں گی۔ ان میں نہ کبھی ضعف آئے گا نہ اضمحلال۔ اس کے شیریں چشمے اپنے پینے والوں کے لئے کبھی مکدر نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ یہ تعلیمات رب العباد کی جانب سے صادر ہوئی ہیں جو اپنے بندوں کے احوال سے اچھی طرح واقف ہے اور جانتا ہے کہ ان کے دین اور دنیا کے لئے کیا چیز بہتر ہے۔

اس تھوڑے وقت میں جو مسائل میں بیان کر سکا اور جو مواد اکٹھا کیا جا سکا وہ حاضر خدمت ہے۔ اگر قارئین کرام کو اس میں کچھ غلطیاں اور فروگذاشتیں نظر آئیں تو میں اللہ سے معذرت خواہ ہوں اس لئے کہ انسان خطا کا پتلا ہے والله الموفق والمعين

وصلى الله على سيدنا محمد وآله وصحبه وسلم

القاہرہ ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ
مطابق ۸ ستمبر ۱۹۷۷ء

مصادر

اول. کتب تفسیر:

۱- احکام القرآن.

تالیف علامہ ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف بابن العربی ۴۶۸ - ۵۴۰ھ تحقیق البجاوی مطبوعہ مطبع عیسیٰ البابی الحلبی وشرکاء

۲- احکام القرآن۔

تالیف حجۃ الاسلام امام ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاص تحقیق محمد الصادق قمحاوی، شائع کردہ دار المصحف، شرکت مکتبہ ومطبعہ عبدالرحمان، قاہرہ۔

۳- تفسیر القرآن العظیم۔

تالیف الامام الجلیل الحافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن کثیر القرشی الدمشقی المتوفیٰ ۷۷۴ھ، مطبوعہ دار احیاء الکتب العربیہ عیسیٰ البابی الحلبی وشرکاہ

۴- الجامع الاحکام القرآن۔

تالیف امام ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی، طبع سوم دار الکتب المصریہ۔

۵- زاد المسیر۔

تالیف ابن جوزی، مطبوعہ المکتب الاسلامی۔ شیخ خلیفہ بن حمد الثانی کے خرچ پر طبع ہوئی۔

۶- فتح القدیر۔

تالیف الشیخ المجتہد محمد بن علی الشوکانی، مطبوعہ مکتبہ ومطبع البابی الحلبی واولادہ، مصر۔

۷- تفسیر المنار۔

تالیف سید محمد رشید رضا، مطبوعہ الہیئۃ المصریۃ العامہ للکتاب ۱۹۰۲ -

دوم ۔ کتب احادیث

۸۔ احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام

تالیف شیخ تقی الدین ابی الفتح ابن دقیق العید المتوفی سنہ۷۰۲ھ مطبعۃ الشرق مصر

۹۔ الروض النضیر شرح مجموعہ الفقہ الکبیر:

تالیف شرف الدین الحسن بن احمد بن الحسین السیاغی الحیمی سنہ۱۲۲۱ھ ۔

مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ ۔ طبع اول، ناشر دار الکتب بیروت ۔

۱۰۔ سنن النسائی المجتبیٰ ۔

تالیف الحافظ ابی عبدالرحمٰن بن شعیب النسائی سنہ ۲۱۴-۳۰۳ھ ۔ مع زہر الربیٰ علی المجتبیٰ، تالیف علامہ

جلال الدین سیوطی مطبوعہ شرکت و مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی و اولادہ مصر

۱۱۔ سنن ابن ماجہ

حافظ ابو عبداللہ محمد بن یزید القزوینی ابن ماجہ،

تعلیق و تحقیق محمد فواد عبدالباقی مطبوعہ مطبعۃ البابی الحلبی و شرکاہ

۱۲۔ سبل السلام ۔

تالیف علامہ صنعانی مطبوعہ مطبعۃ عیسیٰ الحلبی

۱۳۔ صحیح مسلمؒ مع شرح امام نوویؒ ۔ المطبعۃ المصریۃ

۱۴۔ عون المعبود شرح سنن ابی داؤد

تالیف علامہ ابوالطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی مع شرح حافظ ابن قیم الجوزیہ ۔ ناشر محمد عبدالمحسن مالک

مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ

۱۵۔ معالم السنن

تالیف امام ابو سلیمان محمد بن محمد الخطابی البستی متوفی سنہ۳۸۸ھ ۔ شرح سنن ابی داؤد، طبع اول سنہ۱۳۵۲ھ

محمد راغب الطباخ نے تصحیح کے بعد مطبعۃ العلمیہ حلب سے طبع کروایا

۱۶۔ الموطا

تالیف امام الائمہ، عالم المدینہ مالک بن انس رضی اللہ عنہا بتصحیح وتعلیق محمد فؤاد عبدالباقی۔ دار احیاء کتب عربیہ عیسی البابی الحلبی وشرکاء

۱۷۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد

تالیف حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ بتحریر حافظین جلیلین العراقی وابن حجر ناشر دارالکتاب بیروت لبنان۔

۱۸۔ نیل الاوطار شرح منتقی الأخبار۔

تالیف شیخ محمد بن علی محمد الشوکانی طبع آخر، شرکت ومطبع مصطفی البابی الحلبی واولادہ؛

۱۹۔ نصب الرایۃ لأحادیث الہدایۃ

تالیف علامہ جمال الدین ابی محمد عبداللہ بن یوسف حنفی زیلعی متوفی ۷۶۲ھ مع حاشیہ النفیسۃ المہمۃ بغیۃ الالمعی فی تخریج الزیلعی، طبع اول مطبعہ دارالمأمون شبرا شارع الازہار نمبرا

سوم۔ کتب فقہ:

۲۰۔ الام

تالیف امام شافعی۔ طبع بولاق مصورہ ۱۳۲۱ھ دار مصر للتالیف والترجمۃ

۲۱۔ الافصاح عن معانی الصحاح

تالیف وزیر عون الدین ابوالمظفر یحیی بن محمد بن الہبیرہ حنبلی متوفی ۵۶۰ھ طبع اول ۱۳۴۷ھ مطبوعہ محمد راغب الطباخ الحلبی مطبعۃ العلمیہ۔

۲۲ اعانۃ الطالبین علی حل الفاظ فتح المعین علامہ ابوبکر المشہور سید البکری بن سید محمد شطا دمیاطی طبع عیسی الحلبی۔

۲۳۔ بدایۃ المجتہد

تالیف شیخ محمد بن احمد بن محمد بن رشد القرطبی۔ بتحقیق علمائے کبار مطبعۃ الاستقامۃ قاہرہ۔

۲۴۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع

تالیف علامہ علاؤ الدین ابوبکر بن مسعود۔

۲۵۔ حاشیۃ ابن عابدین

تالیف علامہ محمد امین مشہور بہ ابن عابدین طبع دوم ۱۳۸۶ھ ۱۹۶۶ء

۲۶۔ حاشیۃ الدسوقی علی شرح الکبیر

تالیف علامہ شمس الدین شیخ محمد عرفہ الدسوقی، مطبوعہ دار الکتب العربیہ، عیسیٰ البابی الحلبی و شرکاء

۲۷۔ روضۃ الطالبین

تالیف امام نووی۔ مکتبہ اسلامی۔ للطباعۃ والنشر۔

۲۸۔ العدۃ شرح العمدۃ

تالیف بہاء الدین عبدالرحمٰن بن ابراہیم المقدسی، مطبع سلفیہ۔

۲۹۔ الفروع

تالیف امام شمس الدین المقدسی ابی عبداللہ محمد بن مفلح متوفی ۷۶۳ھ طبع ثانی ۱۳۸۱ھ دار مصر

۳۰۔ فتح القدیر

تالیف کمال ابن ہمام طبع اول، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی ۱۳۸۹ھ

۳۱۔ قوانین الاحکام الشرعیۃ

تالیف محمد بن احمد بن جزی الغرناطی المالکی

۳۲۔ قلیوبی و عمیرۃ

دار احیاء الکتب العربیہ لاصحابہا عیسیٰ البابی و شرکاءہ

۳۳۔ کفایۃ الاخیار فی حل غایۃ الاختصار

تالیف امام تقی الدین ابی بکر بن محمد الحسینی شافعی، دار احیاء الکتب العربیہ عیسیٰ البابی الحلبی و شرکاء

۳۴ ۔ المحلی

تالیف امام ابن حزم مصورۃ تحقیق شیخ احمد محمد شاکر منشورات المکتب التجاری للطباعۃ والنشر والتوزیع

۳۵۔ المغنی ۔

تالیف امام محمد بن عبداللہ بن احمد محمد بن قدامہ متوفی ۶۲۰ھ ۔ ناشر مکتبہ الجمہوریۃ العربیۃ

۳۶ ۔ المجموع ۔

تالیف امام ابو زکریا محی الدین بن شرف النووی تحقیق محمد نجیب المطیعی

۳۷۔ المقنع

تالیف امام ابن قدامہ ، مطبعۃ السلفیہ ۔

چہارم ۔ دیگر کتب

۳۸۔ اعلام الموقعین

تالیف امام ابن قیمؒ

۳۹۔ الاشباہ والنظائر

تالیف علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ طبع آخر ، شرکت مکتبہ ومطبعہ مصطفی البابی الحلبی وشرکاہ

۴۰ ۔ زاد المعاد فی ھدی خیر العباد

تالیف امام شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابو بکر ، معروف بہ ابن جوزیہ ۔ مراجعت عبدالرؤف طہ شرکت ومطبع مصطفی البابی الحلبی وشرکاہ

۴۱۔ الفصل فی الملل والأھواء والنحل

تالیف علامہ ابن حزم

۴۲ ۔ فتاوی شیخ محمد رشید رضا ۔

دار الکتب الجدید ، بیروت لبنان

پنجم۔ کتب لغت:

۴۳۔ المصباح المنیر

تالیف علامہ احمد بن محمد بن علی المقری الفیومی، متوفی سنہ ۷۷۰ھ تصحیح مصطفیٰ السقا

۴۴۔ مختار الصحاح

تالیف شیخ محمد ابوبکر بن عبدالقادر رازی جدید منقح ایڈیشن

۴۵۔ الموسوعۃ العربیہ

دار الشعب و مؤسسہ فرانکلین للطباعۃ والنشر۔

اشاریہ

اشخاص

مقامات

موضوعات

●●●

سلام کے عدالتی نظام پر ایک اہم کتاب

شــرح ادب القـاضی

تصنیف : امام ابوبکر احمد بن عمر الخصاف (م ۲۶۱ ھ)

شـرح : برهان الائمه حسـام الدیـن عمـر بن عبدالعزیـز بن مازه النجاری المعروف بالصدر الشهید (م۵۳۶)

اردو ترجمه : سعید احمد، اداره تحقیقات اسلامی

ادب القاضی کے موضوع پر حنفی فقه کی سب سے مشهور کتاب کی پهلی جلد کا اردو ترجمه قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ اس جلد میں منصب قضا کے بارے میں، منصب کی قبولی میں رضامندی، جبرواکراه، منصب کا چارج لینے، قاضی کے اجتهاد، مشوره اور دیگر بنیادی امور پر مستند احکام و مسائـل درج کئے گئے ۔ جامع اور تفصیلی اشاریه شامل اشاعت ہے جس کی وجه سے کتاب میں بکھرے مباحث کو آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔

صفحات ۲۷۲ قیمت ۶۰ روپے

ملنے کا پته : اداره تحقیقات اسلامی، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵،

اسـلام آباد، پاکستان

مطبع : ادارۂ تحقیقات اسلامی پریس ، اسلام آباد